صابر حسین راجپوت

بیٹا پاکستان کا، بیٹی ساہوکار کی

آپ کی جذباتی دنیا میں ہلچل مچا دینے والی نو ہنگامہ خیز کہانیاں

مکتبہ داستان

فہرست

پیش لفظ

محترم صابر حسین راجپوت کی کہانیوں کا ساتواں مجموعہ پیش کیا جا رہا ہے۔ کہنے کو تو یہ شکار کی کہانیاں ہیں لیکن ان میں آپ کو کہیں بھی روایتی قسم کا شکاری، رائفل اور مچان نہیں ملے گی اور نہ ہی کوئی آدم خور شیر یا خونخوار درندے ملیں گے۔ ان کہانیوں میں آپ کو چند سر پھرے نوجوان ملیں گے جو اپنے شکاری کتوں کے ساتھ بھاگ دوڑ کر خرگوش، گیدڑ، بھیڑیے، گوہ اور سیہہ وغیرہ کا شکار کرتے ہیں۔

ان کہانیوں میں آپ کو شکار کے ساتھ ساتھ ایسی کہانیاں ملیں گی جن کا تعلق انسانی فطرت اور جذبات کے ساتھ ہے۔ یہ کہانیاں آپ کی جذباتی دنیا میں زلزلے برپا کر دیں گی اور آپ بے اختیار یہ سوچنے پر مجبور ہو جائیں گے کہ کیا ایسا ہو سکتا ہے؟ جی ہاں، ایسا ہو سکتا ہے۔ یہ افسانے نہیں، من گھڑت قصے نہیں، سچی کہانیاں ہیں جن کے عینی شاہد محترم صابر حسین راجپوت خود ہیں۔

اب زمانہ بہت بدل گیا ہے۔ لوگوں کے سوچنے کا انداز بدل گیا ہے لیکن انسان کی فطرت نہیں بدل سکتی۔ یہ ڈرامے کچھ تبدیلی کے ساتھ آج بھی کھیلے جاتے ہیں۔

ہم یہ کہانیاں اس مشن کے تحت پیش کر رہے ہیں کہ اپنی نوجوان نسل کو یہودی اور ہندو کے اس مواد سے بچایا جائے جس میں ذہنی لذت، جنسیت، مار دھاڑ اور جرائم کی بھرمار ہوتی ہے۔ والدین کا فرض ہے کہ وہ اپنے بچوں کو یہ کہانیاں پڑھنے کو دیں۔ ہمارا دعویٰ ہے کہ یہ ان کے اخلاق و کردار میں پاکیزگی پیدا کریں گی اور انہیں سچا مسلمان اور محبِ وطن پاکستانی بنائیں گی۔

ایڈیٹر

ماہنامہ ''حکایت'' لاہور

جامی شاہ کے جنّات

وہ اللہ اور رسول کے نام پر معافی مانگتی تھی اور کہتی تھی کہ اس بچّے کا گلا گھونٹ کر شکور کے پاس آجائے گی اور باقی عمر اس کے قدموں میں گزارے گی......
لیکن شکور کے لیے پورے خاندان کی عزت اور غیرت کا مسئلہ تھا۔

جامی شاہ کے جنّات

میں نے لڑکپن میں اپنے جسم کو آرام و آسائش سے محروم کر دیا تھا۔ جوانی کُتوں کے ساتھ دوڑتے اور دیہاتی زندگی کے مطالبے پورے کرتے اور محنت ومشقت کرتے گزار دی ہے۔ اخلاقی قدروں کو اپنا ایمان سمجھے رکھا۔ اس کا پھل آج کھا رہا ہوں۔ پھل یہ ہے کہ آج اپنی اولاد کی اولاد مجھے بابا کہتی ہے...... بڈھا بابا...... لیکن مجھے بابا کہنے والے لڑکوں، نوجوانوں اور جوانوں سے میں جسمانی طور پر زیادہ چست اور پھرتیلا ہوں۔ آج کے نوجوان میرے ساتھ پانچ چھ میل چل کے دکھا دیں، نہیں چل سکیں گے۔ کوئی نوجوان چلے گا بھی تو تیسرے میل پر ہی اسے اٹھا کر ہسپتال کی ایمرجنسی لے جانا پڑے گا۔ وہ میں ہی ہوں گا ''بڈھا بابا'' جو اُسے کندھے پر اُٹھا کر پیدل ہسپتال لے جاؤں گا۔ ایمرجنسی کے ڈاکٹر اُس کا بلڈ پریشر چیک کریں گے اور ہوسکتا ہے ای سی جی بھی کریں۔ انہیں کچھ بھی پلّے نہیں پڑے گا تو کہہ دیں گے کہ یہ اچانک صدمے کا اثر ہے اور میں ڈاکٹر کی تائید میں کہوں گا___ ''ہاں ڈاکٹر صاحب! اس کی ماں مرگئی ہے؟''

ہم بڈھوں اور آج کے نوجوانوں میں ایک فرق ہے۔ اس فرق کو علم والوں نے جنریشن گیپ کا نام دیا ہے۔ یہ تو علمی نام ہے۔ عملی فہم وفراست کی رُو سے بات کرتا ہوں۔ اس گیپ یا فرق میں اگر ''بلّو دا گھر'' نہ آجاتا تو آج کے نوجوان بھی ویسے ہی ہوتے جیسے ہم ہوا کرتے تھے۔

میرا خیال ہے آپ سمجھے نہیں۔ یقین کریں آج بڑھاپے کے آخری حصے میں بھی دل اتنا جوان ہے کہ میں بھی تنہائی میں کبھی کبھی ''بلّو دے گھر'' والا گانا گنگنایا کرتا ہوں اور جب اس بھرے گنجان شہر کے ہنگاموں سے بھاگ کر ایک دو دنوں کے لئے گاؤں جانے کا موقع ملتا ہے تو میں خوشی سے بلّو کا یہ پورا گانا گنگناتا ہوں___ ''کنّے کنّے جاناں اے بلّو دے گھر''۔

میری اور آج کے نوجوان کی بلو میں ایک فرق ہے۔ میری بلّو میرا وہ گھر ہے جہاں

میں پیدا ہوا تھا۔ گاؤں میری بلّو ہے اور میرا وہ سطح مرتفع، کھڈ نالوں اور ٹیلوں گھاٹیوں والا علاقہ ہے۔ اس کے برعکس آج کے ہر نوجوان نے اپنی بلّو اپنے ذہن میں بسا رکھی ہے اور اسے اپنی پسند کے نقش ونگار دے رکھے ہیں اور اس سے نہ صرف دل بہلاتا ہے بلکہ اسے ذہنی داشتہ بنا رکھا ہے۔ میں اگر کبھی بلّو کو تصور میں لانے کی کوشش کرتا ہوں تو وہ ایک بڑی خوبصورت کتیا ہوتی ہے جس کے ساتھ میرے کُتے نے کبھی عشق کیا تھا۔

شہروں کی بات کچھ اور ہے۔ ہر شہر میں بلّو مل سکتی ہے، دیہات میں نہیں۔ شہر میں آپ بلّو کو فون کر سکتے ہیں، کالج کے باہر مل سکتے ہیں، کسی کی شادی اور ولیمے پر بلّو سے ملاقات ہوسکتی ہیں لیکن دیہات میں آج اس ترقی یافتہ دور میں بھی بلّو نہیں مل سکتی۔ وہاں تو ہر بلّو پر مارشل لاء لگا رہتا ہے۔ ایک دل جلے شاعر نے اپنی بلّو کی اس قید وبند کو یوں بیان کیا تھا:

کوٹھے اُتے کاں بولے
جدوں تینوں آواز دے واں
اندروں تیری ماں بولے

مطلب یہ کہ دیہات میں بلّو کو ڈائریکٹ اپروچ نہیں کر سکتے۔

اتنی لمبی تمہید باندھنے کا قصوروار میں نہیں، میرا بڑھاپا ہے۔ کہنا صرف یہ تھا کہ پچھلے مہینے اپنے گاؤں جانے کا اتفاق ہوا تو مجھے بے پناہ خوشی ہوئی۔ بیٹے راولپنڈی شہر کی ہڑبونگ اور شور وشرابے اور ہنگاموں سے نکلنے ہی نہیں دیتے۔ کہتے ہیں گاؤں اکیلے نہ جایا کریں، اکیلے سفر نہ کیا کریں...... میں ان کم عقلوں کو کیسے سمجھاؤں کہ جب سے ان کی ماں مجھ سے ہمیشہ کے لیے بچھڑ گئی ہے، میں تن تنہا سفر کر رہا ہوں۔ بندہ اکیلا رہ جائے تو زندگی کا سفر بڑا ہی کٹھن اور دشوار ہوجاتا ہے۔

گذشتہ ماہ ایک بہانہ تراش لیا، بیٹوں سے کہا کہ زمینوں کو دیکھے عرصے گزر گیا اور مکان کو بھی دیکھنا ضروری ہے، کہیں سے چھت بیٹھ نہ گئی ہو۔ یہ چونکہ میری ذمہ داری ہے اور بیٹے اس سے کنی کتراتے ہیں اس لئے وہ مسکرا کر چپ ہوگئے اور میں اپنے گاؤں جا پہنچا۔ اپنے علاقے کے نشیب وفراز دیکھ کر اور خشک کھیتوں میں سے اور گھاٹیاں اتر اور چڑھ کر یوں لگا جیسے میں جوان ہوگیا ہوں۔ میرے گاؤں میں اب بھی وہی پیار اور وہی خلوص ہے جو کبھی ہُوا کرتا تھا اور ابھی تک زندہ وپائندہ ہے۔ پورا گاؤں میرا میزبان بن گیا۔ جب

کبھی گاؤں جاتا ہوں تو ایسے ہی ہوتا ہے۔

میرے اصل میزبان تو وہ دوست ہیں جو قبرستان میں ابدی نیند سو رہے ہیں۔ سب میرا ساتھ چھوڑ گئے ہیں۔ وہ سب میرے منتظر ہیں اور ناراض ہو رہے ہوں گے کہ میں نے اتنی دیر کیوں لگا دی۔ میں اپنی کھیتیوں کو دیکھنے سے پہلے قبرستان پہنچا اور اپنے ہر ایک دوست کی قبر پر فاتحہ پڑھی۔ یہ سب میری شکاری پارٹی کے یار تھے۔ بڑھاپے کے اثرات کہیں یا جذبات کی شدت کہ میں کبھی بے خیالی میں ان قبروں کے درمیان کھڑے ہو کر ان دوستوں کے ساتھ اس طرح باتیں کرنے لگتا ہوں جیسے یہ سب میرے پاس بیٹھے ہیں اور زندہ سلامت ہیں۔

میں آپ کو اپنے جذبات میں نہیں لے جاؤں گا کیونکہ آپ انتظار میں ہوں گے کہ یہ شخص کوئی پرانی واردات یا واقعہ سنائے گا...... آئیے، ایک عجیب وغریب اور سنسنی خیز کہانی سن لیجئے۔ میں اگلے روز اپنے کھیتوں میں گیا۔ اپنے دو ہم عمر بوڑھے میرے ساتھ تھے۔ ان کا ہماری شکاری پارٹی کے ساتھ کوئی تعلق نہیں تھا اور جو تعلق تھا وہ دلوں کی گہرائیوں تک اترا ہوا تھا۔ وہ میرے ہی گاؤں کے رہنے والے تھے اور ہم اکٹھے کھیل کر جوان ہوئے تھے۔

ایک طرف سے ایک آدمی چلا آ رہا تھا جسے میں نے دیکھا تو سہی لیکن ذرا سی بھی توجہ نہ دی۔ میں نے اتنا ہی دیکھا کہ وہ پگلا سا یا سائیں لوک سا آدمی تھا۔ سر سے ننگا، بال بکھرے ہوئے، داڑھی جو لمبی نہیں تھی اور یہ بھی بکھری بکھری تھی۔ کپڑے میلے کچیلے سے تھے اور اس کے چلنے کا انداز بتا رہا تھا کہ ذہنی طور پر صحیح نہیں جسم دبلا پتلا تھا۔

میں ان دو آدمیوں کے ساتھ اپنے ایک کھیت کی مینڈھ پر کھڑا تھا۔ وہ پگلا ہمارے پاس آ کر رک گیا اور مسکرانے لگا۔ اگر اس کا دماغ صحیح ہوتا تو وہ سلام دعا کرتا اور خیر خیریت پوچھتا۔

''پنج روپے دے ناں!''___ اُس شخص نے میرے دونوں ساتھیوں کے آگے دایاں ہاتھ پھیلا کر کہا___ (پانچ روپے دو ناں)۔

''شام کو آ کر لے جانا''___ میرے ایک ساتھی نے کہا۔

''تو دے ناں پنج روپے''___ اُس نے پوٹھوہاری زبان میں کہا___ ''چائی دے ...... چائی دے''___ (تم پانچ روپے دے دو...... ضرورت ہے)۔

میں گاؤں میں کبھی کبھار جایا کرتا ہوں۔ اپنی ناک رکھنے کی خاطر میں نے اپنی جیب

سے پانچ روپے کا ایک نوٹ نکالا اور اُسے دے دیا۔ اُس کی مسکراہٹ اور زیادہ پھیل گئی۔ نوٹ کو دونوں طرفوں سے پکڑ کر دیکھا اور پھر وہ ہنسا اور جدھر سے آیا تھا اُدھر کو مڑا اور ہنستا ہوا چلا گیا۔ اب تو کوئی شک نہیں رہ گیا تھا کہ یہ کوئی جھلا بھکاری ہے۔ اُس کا رنگ زرد پیلا تھا اور آنکھیں لال سرخ تھیں اور اس طرح اَدھ کھلی جیسے غنودگی میں ہو لیکن اُس کی آواز جاندار تھی۔ میرے اندازے کے مطابق اُس کی عمر چالیس برس سے زیادہ تھی، کم نہیں لگتی تھی۔

''تم نے اسے نہیں پہچانا صابو!''___ میرے ایک ساتھی نے کہا___ ''ماں باپ تو کبھی کے مر گئے ہیں، انہیں تو وہاں سزا ملے گی اور یہ دنیا میں بھٹکتا گلتا سڑتا پھر رہا ہے۔ ہماری جوانی کے وقتوں کا جامی شاہ اگر تمہیں یاد ہو!''

میں نے ذہن پر ذرا سا ہی زور دیا تھا کہ جامی شاہ یاد آ گیا لیکن یہ یاد نہ آیا کہ وہ کون سا واقعہ تھا جس کے ساتھ جامی شاہ کا تعلق تھا۔ میرے ان دو ساتھیوں نے مجھے وہ واقعہ یاد دلایا تو میرا ذہن اتنے ہی برس پیچھے چلا گیا جتنے برس اس پگلے سے آدمی کی عمر تھی جو ابھی مجھ سے پانچ روپے کا نوٹ لے گیا تھا۔ میرے ساتھیوں نے مجھے بتایا کہ یہ وہ بچہ ہے۔

میرے ساتھ آئیں، مَیں آپ کو چالیس پینتالیس برس پیچھے وہاں لے چلتا ہوں جب ہم نوجوان تھے بلکہ نوجوانی کی نادان عمر سے نکل کر پختہ جوانی میں داخل ہو چکے تھے۔ میرا یہ تجربہ ہے کہ جب کبھی کوئی پرانا واقعہ یاد آ جاتا ہے تو میں ذہنی طور پر ہی نہیں بلکہ یہ لگتا ہے جیسے جسمانی طور پر اُس وقت میں پہنچ گیا ہوں اور میں ایک بار پھر جوان ہو جاتا ہوں پھر ہر کسی کی زبان سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ یاد آ جاتا ہے۔ اپنے تمام دوستوں کو دیکھتا ہوں تو اُس وقت کا ہر منظر سامنے آتا ہے اور کبھی تو مجھے یقین ہونے لگتا ہے کہ میں ہاتھ آگے کروں تو اپنے دوستوں کو، درختوں کو، زمین اور پتھروں کو چھو سکتا ہوں اور وہ ایک یاد نہیں بلکہ حقیقت ہوں گے جیسے میں پتھر اٹھاؤں گا اور پتھر میرے ہاتھ میں آ جائے گا اور میں اسے پھینکوں گا تو یہ ہَوا میں اُڑتا دور جا گرے گا۔ سیانے کہتے ہیں کہ ماضی کو اپنے ذہن پر اتنا سوار نہیں کرنا چاہئے جتنا میں نے کر رکھا ہے لیکن اسے میری کمزوری کہہ لیں کہ میں جب ماضی میں چلا جاتا ہوں تو واپس آنے کو جی نہیں چاہتا۔

ہم نے جب شکار کا یہ خبط شروع کیا تھا، اُس وقت ہم کچے نوجوان تھے اور شکاریوں کھیلتے تھے کہ جس طرف گئے دوڑ پڑتے اسی طرف ہم بھی اُن کے پیچھے بھاگ اٹھتے تھے۔

اب میں جس وقت کا یہ واقعہ سنانے لگا ہوں اُس وقت ہم پختہ جوان ہو چکے تھے اور شکار کے اصولوں سے بھی واقفیت ہو گئی تھی۔ کچھ داؤ پیچ آ گئے تھے جن سے ہمارا شکار آسان ہو گیا تھا۔

مجھے یہ بھی یاد آ گیا کہ ہلکی سردی کا موسم تھا۔ اُس زمانے میں ان دِنوں سردی آج کی نسبت زیادہ ہُوا کرتی تھی، ایک روز ہم علی الصبح حسبِ معمول شکار کے لئے نکلے۔ پہلے تو صرف ماں تھی جو مجھے شکار سے روکا کرتی تھی پھر بیوی آ گئی اور اب میرا پہلا بچہ تین سال کا ہو گیا تھا۔ میں جب گھر سے نکلا تو یہ بچہ بھاگ اٹھا تھا اور میرے پیچھے دوڑ پڑا اور ٹانگوں سے لپٹ گیا۔ میں جانتا تھا کہ اس بچے کو دو ماؤں نے میرے پیچھے ڈالا ہے۔ ایک ماں میری تھی اور دوسری ماں میرے بچے کی لیکن میں غصہ جھاڑنے والا باپ بھی نہیں تھا اور خاوند بھی نہیں۔ میں نے بچے کو اٹھا لیا، پیار کیا اور بہلایا پھسلایا اور گھر چھوڑ کر خود نکل گیا۔ وہ کُتے تھے جنہیں ہم پٹے اور زنجیریں ڈال کر رکھتے تھے۔ ہمیں کوئی بھی پٹے اور زنجیریں نہ ڈال سکا۔ میرے اس بچے کو طوطے زیادہ اچھے لگتے تھے۔ میں نے اُسے کہا تھا کہ میں تمہارے لئے طوطا لانے جا رہا ہوں۔ وہ اسی میں خوش ہو گیا۔

میں وہ باتیں دوہرانا نہیں چاہتا جو اپنی کہانیوں میں لکھا کرتا ہوں۔ موسم بڑا اچھا تھا اس لئے اُس روز ارادہ کچھ دور جانے کا تھا۔ دوست کہتے تھے کہ اس پہاڑی علاقے کے اندر چلیں گے جو سوہاوہ سے شروع ہوتا ہے۔ میں اس علاقے کو کئی بار بیان کر چکا ہوں اور اس کے اندر کی کچھ کہانیاں بھی سنائی ہیں۔ ہم اُس روز بھیڑیوں کا شکار کھیلنا چاہتے تھے اور بھیڑیے اسی علاقے میں مل سکتے تھے۔

ہم اُس طرف ہو لئے جس طرف یہ علاقہ تھا۔ یہ پہاڑی علاقہ محدود تھا، نہ ہی کم لمبا چوڑا تھا بلکہ میل ہا میل دور دور تک پھیلا ہُوا تھا۔ ہم پکے راستوں اور پگڈنڈیوں کے محتاج نہیں تھے۔ ہمیں جس طرف جانا ہوتا تھا اُدھر کا رُخ کر لیا کرتے اور ناک کی سیدھ چلے جاتے۔ راستے میں گہرے نشیب بھی آتے تھے، گھاٹیاں اور ٹیلے بھی آتے تھے، کَس بھی راستے میں پڑتے تھے اور اس علاقے کی دیگر دشواریاں بھی ہمارا راستہ روکنے میں کامیاب نہیں ہو سکتی تھیں۔

ہم چونکہ بڑا شکار کھیلنا چاہتے تھے اور اس کے لئے دُور بھی جانا تھا اس لئے ہم نے کُتوں کو زنجیروں میں ہی رکھا تھا کہ یہ چھوٹے چھوٹے جانوروں کے پیچھے دوڑ دوڑ کر تھک

نہ جائیں۔ راستے میں ہم نے تین چار خرگوش دیکھے۔ یہی ہمارا شکار ہُوا کرتا تھا لیکن ہم نے کُتے نہ چھوڑے ...... ہم ایک ویرانے میں سے گزر رہے تھے۔ دائیں بائیں مٹی کے وہ دیواروں جیسے ٹیلے کھڑے تھے جنہیں ہم دندیاں کہا کرتے ہیں۔ یہ دندیاں کٹی پھٹی بھی تھیں یعنی ان میں کہیں کہیں شگاف پڑے ہوئے تھے۔ یہ سیلابی پانی کی کارستانی تھی۔ ان دندیوں کے درمیان خاصا چوڑا علاقہ میدانی تھا لیکن ہموار نہیں تھا۔ اس میں کھڈ بھی تھے، درخت بھی خاصی تعداد میں تھے اور خشک جھاڑیاں بھی تھیں۔

تقریباً تین سو گز دور دندی کے ایک شگاف میں سے دو خرگوش بڑی ہی تیزی سے نکلے اور دائیں بائیں مُڑنے کی بجائے سیدھے بھاگتے گئے۔ اُس روز ہمیں خرگوشوں کے ساتھ کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ ہم بھیڑیوں کے شکار کے ارادے سے نکلے تھے۔ ہمیں یہ توقع نہیں تھی کہ بھیڑیے ضرور ہی مل جائیں گے لیکن خداوند تعالیٰ نے ہمیں ایک بھیڑیا دے دیا۔

دو خرگوش دندی سے نکل کر سامنے کو بھاگ گئے تھے۔ ان کے پیچھے پیچھے ایک بھیڑیا بڑی ہی تیز رفتاری سے دوڑتا نمودار ہُوا اور خرگوشوں کے پیچھے گیا۔ ہم سمجھ گئے کہ خرگوش اس بھیڑیے سے بھاگ رہے تھے اسی لئے ان کی رفتار انتہائی تیز تھی۔ ہم نے بھیڑیا دیکھا تو ہمیں یہ ضرورت محسوس نہیں ہوئی کہ کُتوں کی توجہ اس طرف کرتے۔ بھیڑیا کچھ غراتا اور کچھ بھونکتا جا رہا تھا۔ اس آواز نے کُتوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیا اور کُتے آزاد ہونے کو تڑپنے اور بھونکنے لگے۔ ہم نے تمام کُتوں کی زنجیریں پٹوں سے الگ کر دیں۔ کُتے بڑے ہی تیز دوڑے اور بھیڑیے کے پیچھے گئے۔

خرگوش آگے گئے تو آگے دندی آ گئی جہاں انہیں چھپنے کی جگہ نہ ملی اور وہ آگے بھی نہیں جا سکتے تھے۔ بھیڑیا اُن تک پہنچنے والا تھا۔ ایک خرگوش ایک طرف نکل گیا اور دوسرے نے اُدھر کا رخ کر لیا جدھر ہم تھے۔ بھیڑیا اُس کے پیچھے لگ گیا۔ ہمارے کُتے خرگوش کے پیچھے نہیں بلکہ بھیڑیے کے پیچھے گئے تھے۔ بھیڑیا ہمارے کُتوں کی موجودگی سے بے خبر دوڑا آ رہا تھا۔

ہمارے کُتوں نے اُس کا راستہ روک لیا اور ایک ہی بار سارے کے سارے اُس پر ٹوٹ پڑے۔ آٹھ نو کُتوں کے آگے ایک بھیڑیے کی حیثیت ہی کیا تھی پھر بھی بھیڑیے نے مقابلہ کرنے کی پوری پوری کوشش کی۔

ایک تو کُتوں کا شور تھا اس کے ساتھ ہمارا غل غپاڑہ، دنیا کی کوئی اور آواز سنائی نہیں

دیتی تھی۔ ہمارے کُتے بھیڑیے کو بھنبھوڑ رہے تھے۔ ہمارے ایک ساتھی نے بڑی ہی بلند آواز سے کہا—— ''ٹھہرو وائے ٹھہرو...... دیکھو وہ کیا کہہ رہے ہیں'' —— ہم سب نے اُدھر دیکھا۔ دو ہم جیسے جوان لڑکے دوڑے آ رہے تھے۔ وہ کچھ کہتے آ رہے تھے لیکن کُتوں کے شور وغل میں ان کی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ وہ بازو لہراتے اور اپنے ہاتھوں کو زور زور سے ہلاتے ہمیں کچھ اشارے دے رہے تھے۔ کچھ اور قریب آئے تو ان کی آواز سنائی دینے لگی۔

''ہمارے کُتے نے تمہارا کیا بگاڑا ہے یارو!'' —— ان میں سے ایک نے کہا—— ''تمہیں اور کوئی شکار نہیں ملا تو میرے کُتے پر کُتے چھوڑ دیئے ہیں...... کچھ تو خدا کا خوف کرو''۔

بات یہ کھلی کہ جسے ہم بھیڑیا سمجھ رہے تھے، وہ کتا تھا جو بھیڑیے کی نسل سے تھا۔ ہم سب نے بڑی مشکل سے اپنے اپنے کُتے کو پکڑا اور ان کے پٹوں میں زنجیریں ڈالیں۔ وہ کتا جسے ہم بھیڑیا سمجھے تھے ایک طرف بھاگ اٹھا۔ اس کے مالک نے اسے پکارا، سیٹیاں بجائیں اور پھر اُس کے پیچھے دوڑا لیکن ہمارے کُتوں نے اس کے ساتھ ایسا بُرا سلوک کیا تھا کہ اس نے اب اپنے گھر جا کر ہی دم لینا تھا۔

کُتے کا مالک واپس ہمارے پاس آ گیا تو میرے عزیز دوست راجہ شہباز خان نے معذرت طلب لہجے میں اُسے بتایا کہ ہم تو اسے بھیڑیا سمجھ بیٹھے تھے...... اس کُتے کے مالک کی عمر چوبیس پچیس سال تھیں خوبرو جوان تھا اور اس نے جو شلوار قمیض پہن رکھی تھی، اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ اونچے خاندان کا آدمی ہے۔ اس کے ساتھ اس کی عمر کا جولڑکا تھا، وہ بھی خوش حال خاندان کا لگتا تھا۔ ہم سب نے دوستانہ طریقے سے بات کی اور اس کا غصہ ٹھنڈا کیا۔ وہ خوش طبع اور زندہ دل لگتا تھا۔ ہمارا دوستانہ روّیہ دیکھ کر ہماری نرم مزاجی کی باتیں سن کر وہ ہنس پڑا اور کہنے لگا کہ اچھے شکاری ہو کہ تمہیں کُتے اور بھیڑیے کی ذرا سی بھی پہچان نہیں۔

''یہ دراصل تمہارا بھی قصور نہیں'' —— اُس نے کہا—— ''میرے اس کُتے کا باپ تھا ہی بھیڑیا''۔

ہمارے لئے یہ کوئی حیرت ناک بات نہیں تھی۔ ہم جانتے تھے کہ کُتے، گیدڑ اور بھیڑیے ایک دوسرے سے اپنی نسل پیدا کر لیا کرتے ہیں۔ مثلاً کوئی کُتیا جب نسل کُشی کے موڈ میں آتی ہے تو وہ اگر اتفاق سے بھیڑیوں کے قریب سے گزر جائے تو بھیڑیے اس پر

حملہ نہیں کرتے۔ بھیڑیا اس کے ساتھ دوستی کر لیتا ہے اور اس طرح کُتیا بھیڑیے کے بچے جنتی ہے۔ مادہ گیدڑ کُتے کے بچے پیدا کر دیتی ہے۔ ایسا عام طور پر نہیں ہوتا لیکن اتفاق سے گیدڑ یا کُتے یا بھیڑیے کی مادہ ان تینوں میں سے کسی کے پاس بھی چلی جائے تو اس کے نتیجے میں وہ ان میں سے کسی کی بھی نسل پیدا کر دیتی ہے۔ یہ کتا جسے ہم بھیڑیا سمجھتے تھے، اتفاق سے اس لڑکے کے ہاتھ لگ گیا تھا۔ اس نے بتایا کہ اسے اس نے بڑی مشکل اور احتیاط سے پالا اور اپنے ساتھ مانوس کیا تھا۔ اُس کی شکل ہو بہو بھیڑیوں جیسی تھی۔

ہم نے اتنا بھی نہ سوچا کہ بھیڑیا کبھی اکیلا شکار نہیں کیا کرتا۔ بھیڑیے کم از کم دو ہوتے ہیں اور اس سے زیادہ بھی ہُوا کرتے ہیں اور وہ سب اکٹھے شکار مارتے ہیں۔

کُتوں اور بھیڑیوں کے قصے کو یہیں پر ختم کرتا ہوں کیونکہ مَیں نے کوئی اور ہی واردات سنانی ہے...... بھیڑیے کی اس نسل کے کُتے کی نسبت ہمیں اور خصوصاً مجھے شکور زیادہ اچھا لگا۔ وہ کُتوں کا شوقین تھا۔ اس نے ہماری ٹیم کے ہر کُتے کو الگ الگ دیکھا اور پھر کہنے لگا کہ اسے شکار کا بہت شوق ہے لیکن اس کے گاؤں میں اسے کوئی ساتھ نہیں ملتا۔ میں نے دیکھ لیا تھا کہ شکور اس قابل ہے کہ اس کے ساتھ دوستی کی جائے جو اس روز ہو گئی۔ اُس کا گاؤں وہاں سے ایک میل سے کچھ زیادہ دور تھا۔ اس نے ہمیں دعوت دی کہ ہم سب اُس کے گاؤں چلیں۔ ہم اپنا شکار کھیلنے نکلے تھے اور اپنا یہ کھیل ادھورا نہیں چھوڑنا چاہتے تھے۔ شکور سے میں نے اور میرے دو تین دوستوں نے کہا کہ وہ کسی روز ہمارے گاؤں آئے اور پھر ہم اُس کے گاؤں آئیں گے۔

اُس نے ہمارے گاؤں آنے کا وعدہ کیا پھر ہم آگے چلے گئے اور وہ اپنے گاؤں کو روانہ ہو گیا۔ اپنے کُتے کا اسے کوئی غم نہیں تھا۔ وہ کہتا تھا کہ کتا گھر پہنچ چکا ہوگا۔ یہ تو ہم بھی جانتے تھے کہ ڈر کے مارے بھاگا ہُوا کتا کہیں اور نہیں جایا کرتا، اپنے گھر ہی چلا جاتا ہے۔ کتا، بلی اور گھوڑا یا گھوڑی ایسے جانور ہیں کہ ان میں سے کوئی چوری ہو جائے اور چور اسے کتنی ہی دور کیوں نہ لے جائیں، اگر چوروں کے گھر سے اسے بھاگنے کا موقع مل جائے تو وہ بھاگ کر واپس اپنے مالک کے گھر پہنچ جاتا ہے۔

دو تین دنوں بعد شکور اپنے اسی دوست کے ساتھ ہمارے گاؤں میں آیا اور اسے میں اپنے گھر لے گیا۔ راجہ شہباز خان کو اور تین چار دوستوں کو بھی بلا لیا۔ دن بھر خوب گپ شپ رہی اور ہماری دوستی اس طرح پکی ہو گئی جیسے ہم مدتوں کے دوست چلے آ رہے ہیں۔ اس کا

گاؤں ہمارے گاؤں سے سات ساڑھے سات میل دور تھا۔سورج غروب ہونے سے پہلے وہ ہم سے پکا وعدہ لے کر گیا کہ اب ہم اس کے گاؤں آئیں گے۔

ایک روز میں، شہباز خان اور افضل اس کے گاؤں چلے گئے۔اُس نے ہماری جو خاطر تواضع کی وہ میں آج تک نہیں بھولا۔اس کا کتا دیکھا۔ہمارے کُتوں نے اس کا بُرا ہی حال کر دیا تھا لیکن وہ چند دنوں میں ٹھیک ہو گیا تھا۔اسے اتنی قریب سے دیکھ کر بھی یقین نہیں آتا تھا کہ یہ بھیڑیا نہیں کتا ہے۔

شکور پر تو شکار کھیلنے کا جنون سوار تھا۔ہمارے ہاں آیا تھا تو بھی اور اب ہم اُس کے ہاں گئے تو بھی اُس نے کہا کہ ہم جب بھی شکار کے لئے نکلا کریں تو اسے بھی ساتھ لے آیا کریں۔ہم نے اُسے بتایا کہ ہم ہر بار مختلف علاقوں میں جایا کرتے ہیں اور یہ پابندی ناممکن ہے کہ ہم اس کے گاؤں کے قریب سے گزریں اور اسے ساتھ لے لیا کریں۔بہر حال یہ انتظام طے ہو گیا کہ شکار پر جانے سے ایک دن پہلے اسے اطلاع دے دیا کریں گے اور یہ بھی بتا دیا کریں گے کہ ہم کس طرف جا رہے ہیں اور وہ راستے میں ہمیں ملے۔

اگلی بار ہم شکار کے لئے نکلے تو شکور کو پہلے اطلاع دے رکھی تھی اس لئے وہ ہمیں اپنے کُتے کے ساتھ راستے میں مل گیا۔ہمارے کُتے شاید ابھی اسے بھولے نہیں تھے۔اسے دیکھ کر سب کُتے غرانے لگے اور زنجیروں سے آزاد ہونے کو تڑپنے لگے۔ہمارے کُتے اُسے دشمن اور غیر سمجھتے تھے۔ہمارے کُتوں کی ٹیم کا کپتان افضل کا بوبلی تھا۔اس نے آگے بڑھ کر شکور کے کُتے کا انٹرویو لیا۔ہم دیکھ رہے تھے۔ہم جانتے تھے کہ شکور کے کُتے نے ذرا سی بھی بدتمیزی کی تو بوبلی اس کا بُرا حال کر دے گا۔دونوں ایک دوسرے کے سامنے کھڑے غرغر کرتے رہے اور نہ جانے شکور کے کُتے نے کیا کہہ دیا کہ ہمارے بوبلی نے پلک جھپکتے اس پر حملہ کر کے اس کی گردن نیچے سے منہ میں لے لی اور بڑے غصے سے اسے بھنبھوڑنے لگا۔ہم اگر چھڑا نہ لیتے تو بوبلی اسے جان سے ہی مار ڈالتا۔بوبلی اس کُتے کی گردن بلکہ شہ رگ منہ میں لے کر اس کا سانس روک دینے کی کوشش میں تھا۔

عام طور پر مشہور ہے کہ شہر میں کسی اعلیٰ درجے کے سکول میں بچے کو داخلہ نہیں ملتا اور داخلہ لینا ناممکن سے بھی زیادہ مشکل ہوتا ہے۔میں کہتا ہوں کہ کسی نہ کسی طریق سے بچے کو اچھے سے اچھے سکول میں داخلہ مل جاتا ہے لیکن ہماری ٹیم میں کسی نئے کُتے کو داخلہ مشکل سے ہی ملتا تھا۔بوبلی کسی نئے کُتے کو قبول نہیں کرتا تھا۔تین چار کُتے اس کے حواری اور حاشیہ

بردار تھے۔وہ بوبلی کا ہر فیصلہ مانتے بھی تھے اور دوسرے کُتوں سے منواتے بھی تھے......ہم کُتوں کی نفسیات بڑی اچھی طرح سمجھ گئے تھے۔اپنے تجربے کی روشنی میں شکور کے کُتے کو بڑی ہی مشکل سے اپنی ٹیم میں داخل کیا اور بڑے بڑے ڈھنگ کھیل کر بوبلی کے ساتھ اس کی دوستی کرا دی۔

شکور کے کُتے کو ہمارے کُتوں نے قبول کر لیا اور شکور ہمارا دوست بن گیا۔اس کے گھر میں بڑی اچھی نسل کی گھوڑی تھی۔گھوڑی کی پیٹھ پر سفر کرو تو سات میل کا فاصلہ کوئی فاصلہ ہی نہیں ہوتا۔شکور سات آٹھ دنوں بعد ہمارے ہاں آ جایا کرتا تھا۔ہمارے پاس بھی گھوڑیاں تھیں اور کبھی ہم دو تین دوست بھی اس کے ہاں چلے جاتے تھے۔دراصل شکور میرا اور راجہ شہباز خان کا دوست بنا تھا اور ہم دونوں کو اس نے اپنا ہمراز بنا لیا تھا۔ایک روز اس نے بتایا کہ اپنی برادری کی ایک لڑکی کے ساتھ اُسے ویسی ہی محبت ہے جیسی رانجھے کو ہیر کے ساتھ اور سوہنی کو مہینوال کے ساتھ تھی لیکن اس لڑکی کے ساتھ اس کی شادی نہیں ہو سکتی کیونکہ برادری کے اصولوں اور پابندیوں کے مطابق اس کی منگنی ایک اور گھر میں کر دی گئی ہے۔لڑکی کا تو یہ حال تھا کہ شکور کی محبت میں پاگل ہوئی جا رہی تھی۔میں دیکھ رہا تھا کہ شکور بھی جذباتی لحاظ سے نارمل نہیں رہا تھا اور وہ اس لڑکی کو حاصل کرنے کے لئے مرنے مارنے پر تُلا ہُوا تھا۔

میں نے کہا ہے کہ لڑکی کی منگنی ایک اور ''گھر'' میں کر دی گئی۔یہ نہیں کہا کہ منگنی ایک اور آدمی یا لڑکے کے ساتھ کر دی گئی۔یہ میں نے اس لئے کہا ہے کہ برادری والی شادیاں لڑکی لڑکے کی نہیں بلکہ دو گھروں یا دو خاندانوں کی ہوتی ہیں اور ان کے پس منظر میں بڑی پرانی سیاست چلی آ رہی ہوتی ہے۔شادی کے بعد میاں بیوی دلی پیار کی زنجیروں میں ہی کیوں نہ بندھ جائیں اور خاوند بیوی کو ہر لحاظ سے خوش کیوں نہ رکھنا چاہتا ہو، اگر خاوند کے والدین فیصلہ کر لیں کہ بہو کو خوش و خرم رکھنے کی بجائے اذیت میں ڈالے رکھنا ہے تو ان کے بیٹے کو جرأت نہیں ہوگی کہ اپنے والدین کو ناراض کر کے بیوی کو خوش رکھے۔

برادری کی پابندیوں میں جکڑے ہوئے لوگ دیہات میں ہوں یا شہروں میں، اولاد پر اپنی پسند اور اپنی سیاست مسلط کیا کرتے ہیں۔انہوں نے نہ کبھی ان پابندیوں سے آزاد ہونے کی کوشش کی ہے نہ کبھی آزاد ہوں گے۔اس کے باوجود ایسی شادیاں کامیاب بھی ہوتی ہیں۔جوان دل ایک دوسرے میں جذب ہو جاتے ہیں لیکن بعض شادیاں بے جوڑ

ہوتی ہیں۔ ہم نے ایسی شادیاں بھی دیکھی ہیں کہ لڑکی کی عمر بمشکل تیرہ برس اور خاوند کی عمر چوبیس سال کے لگ بھگ ہے۔ یہ بھی کہ خاوند کی عمر تیرہ چودہ سال ہے اور بیوی اُنیس بیس سال کی ہے۔

نو دس سال پہلے میرے گاؤں میں ایسی ہی ایک شادی ہوئی تھیں دلہا کی عمر گیارہ سال اور دو تین مہینے دلہن سولہ سال کے لگ بھگ تھی۔ یہ شادی برادری کے قاعدے قانون کے تحت ہوئی تھی۔ پھر ہُوا یہ کہ لڑکا سولہ سال کا ہُوا تو لڑکی کو نمونیہ ہوا اور وہ مرگئی۔ مجھے علامہ اقبال کا ایک مصرع یاد آیا:

میں تیری خدمت کے قابل جب ہُوا تو چل بسی

ایسے ہی برادری سسٹم کا نتیجہ تھا کہ جس لڑکی کے ساتھ شکور کو محبت تھی، اس کی منگنی ایک ایسے آدمی کے ساتھ کر دی گئی جو عمر میں اس سے بارہ سال بڑا تھا اور جسم، شکل صورت اور رنگ روپ کے لحاظ سے بہت ہی گیا گزرا تھا۔ اصل بات تو یہ تھی کہ شکور اور اس لڑکی میں ایسی محبت تھی جو انہیں عمر بھر کے ساتھ کے لئے مجبور کر رہی تھی۔ انہوں نے قسمیں کھائی تھیں کہ کچھ کھا کر مر جائیں گے، کسی اور کے ساتھ شادی نہیں کریں گے۔

ان کے لئے اب یہی ایک راستہ رہ گیا تھا کہ کچھ کھا کر مر جائیں۔ دیہات کے لوگوں میں آج بھی کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ وہ خداوند تعالیٰ کی حکم عدولی کر دیا کرتے ہیں، برادری میں اپنی ناک نہیں کٹوایا کرتے۔ دیہات میں یہ الفاظ عام استعمال ہوتے ہیں——
''ہم نے زبان دی ہوئی ہے''——اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ہم جو الفاظ زبان سے کہہ چکے ہیں یہ واپس نہیں لئے جائیں گے یعنی یہ وعدہ پورا کیا جائے گا۔ منگنی کی منسوخی پر تو قتل اور خون خرابے ہو جایا کرتے ہیں......شکور اور اس لڑکی کے سامنے ایک تو راستہ خودکشی کا تھا اور دوسرا راستہ یہ کہ شکور لڑکی کی ساتھ لے کر کہیں بھاگ جاتا۔ انہوں نے اس پر آپس میں بات کی تھی۔ لڑکی تیار تھی لیکن شکور نے اپنی عقل استعمال کی اور لڑکی کو سمجھایا کہ وہ اگر شہر کے رہنے والے ہوتے اور لڑکی نہیں تو شکور ہی تعلیم یافتہ ہوتا تو اسے کہیں ملازمت مل سکتی تھی اور وہ کسی کے محتاج نہ رہتے لیکن دونوں چٹے اَن پڑھ تھے کسی دُور دراز شہر میں چلے بھی جاتے تو شکور صرف مزدوری کر سکتا تھا۔

یہ بھی ذہن میں رکھیں کہ وہ دونوں اونچی ذات کے تھے۔ اُن وقتوں میں جن وقتوں کی میں بات سنا رہا ہوں، دیہاتی معاشرے میں ذات پات کا بہت ہی خیال رکھا جاتا تھا۔

اونچی ذات کے لوگ اپنے اپنے گاؤں کے خودساختہ مہاراجے اور نواب ہُوا کرتے تھے۔ ان لوگوں میں حماقت کی حد تک دلیری ہُوا کرتی تھی۔ انتہائی گھٹیا حرکت کر کے یہ لوگ گاؤں کی پوری آبادی سے توقع رکھتے تھے کہ ان کی اس حرکت پر انہیں داد دی جائے اور ہر جگہ چرچے کئے جائیں کہ راجہ صاحب نے تو کمال کر دیا ہے۔

میرے ساتھ اور راجہ شہباز خان کے ساتھ شکور کی دوستی اتنی گہری ہوگئی تھی کہ ہم ایک دوسرے کے دل میں رچ بس گئے تھے۔ شکور کہتا تھا کہ گاؤں میں اس کے دوست تو ہیں لیکن ایسے نہیں کہ اپنا ہر راز انہیں دیا جائے۔ اس کے ان دوستوں کو ان کی محبت کا علم تھا اور وہ ہر طرح اس کا ساتھ دینے کو تیار تھے لیکن ان میں عقل کی ذرا کمی تھی۔ وہ ہم سے پوچھتا تھا کہ کیا طریقہ اختیار کرے کہ اس کی شادی اس لڑکی سے ہو جائے۔ ہم نے اس سے پوچھا کہ لڑکی کا دل گُردہ کتنا کچھ مضبوط ہے اور کیا وہ کچھ عقل والی بھی یا صرف محبت اور خودکشی کرنا ہی جانتی ہے!

''دل گُردے کی بات کرتے ہو؟''—— شکور نے کہا——''اُس کا دل گُردہ اتنا مضبوط ہے اور دلیری اتنی کہ میں کہوں کہ دندی سے سر کے بل چھلانگ لگا دو تو وہ لگا دے گی اور میں اُسے کہوں کہ میں آج فلاں بندے کو قتل کر دوں گا تو وہ مجھ سے پہلے جا کر اُسے قتل کر دے گی۔ عقل والی بھی ہے۔ چال چلن بھی پورا صاف اور پاک اور میں نے اس کے ساتھ جو محبت کی ہے وہ چال چلن بگاڑنے والی نہیں''۔

ہم نے اسے بہت مشورے دیئے جن میں ایک یہ تھا کہ وہ لڑکی کو ساتھ لے کر بنگال چلا جائے اور بنگال پولیس میں بھرتی ہو جائے۔ وہ انگریزوں کا دَور تھا اور ہماری طرف کے آدمیوں کو بنگال پولیس اور برما پولیس میں بھرتی کر کے لے جاتے تھے۔ شکور کو یہ مشورہ اچھا تو لگا لیکن وہ کبھی راولپنڈی اور جہلم سے آگے گیا ہی نہیں تھا، اتنی دُور پردیس کیسے جاتا اور وہاں بھرتی ہونے تک کہاں سر چھپاتا۔ اُس روز بہت باتیں ہوئیں اور وہ مایوسی کی حالت میں چلا گیا۔ میں نے دیکھا کہ اُس روز اُس کی زندہ دلی اور مزاج کی شگفتگی بھی بجھی ہوئی تھی۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا کہ وہ ہار مان رہا تھا۔ وہ ہار ماننے والا آدمی تھا ہی نہیں۔

شہباز خان نے بھی مجھے کہا کہ یہ دونوں کوئی تماشا دکھا ہی دیں گے اور خراب ہوں گے۔

وہ چھ سات دنوں بعد آیا۔ اُس نے یہ خبر سنائی کہ لڑکی پر جنات کا قبضہ ہوگیا ہے اور چار روز پہلے اس پر اچانک جن آیا اور لڑکی کے ہاتھ پاؤں مُڑ گئے اور اس نے چیخنا چلانا

شروع کر دیا۔اس نے یہ بھی بتایا کہ لڑکی ہر وقت چارپائی پر لیٹی رہتی ہے اور جب جن آتا ہے تو لڑکی ایک ایک گز چارپائی سے اوپر کو اٹھتی اور گرتی ہے اور اس کا جسم بالکل سیدھا رہتا ہے۔یہ بھی کہ چار چار پانچ پانچ آدمی اسے دبا کر رکھتے ہیں تو بھی اس کا جسم اوپر کو اچھلتا ہے۔

ہم نے اس سے پوچھا کہ یہ کس نے بتایا ہے کہ یہ جن کا قبضہ ہے۔اس نے ایک آدمی کا نام لیا اور بتایا کہ اس کے قبضے میں بڑے بڑے منہ زور جنات ہیں اور وہ ان جنات کو قابو کر لیتا ہے جو انسانوں پر قبضہ کر لیتے ہیں۔اُس نے اس آدمی کا نام جامی شاہ بتایا۔ہم نے یہ نام پہلے کبھی نہیں سنا تھا۔وہ شکور کے گاؤں سے آگے خاصی دور کے ایک گاؤں میں رہتا تھا۔

گاؤں کے کچھ لوگوں نے لڑکی کے گھر والوں سے کہا کہ وہ جامی شاہ کو لے آئیں۔ جامی شاہ کو لایا گیا۔شکور ہمیں وہ باتیں سنا رہا تھا جو اسے دوسروں کی زبانی معلوم ہوتی تھیں۔وہ خود تو لڑکی کے گھر نہیں جا سکتا تھا، البتہ اُس کی ماں اور بہنیں جاتی تھیں۔اُنہوں نے بتایا کہ جامی شاہ نے جن حاضر کیا۔اس وقت لڑکی ٹھیک ٹھاک گھر میں کام کاج کر رہی تھی۔جامی شاہ نے اسے چارپائی پر لٹا کر حاضر کیا اور لڑکی کی حالت ویسے ہی ہو گئی جو میں نے بیان کی ہے۔

یہ تو آپ جانتے ہوں گے کہ جن نکالنے والے جن کے ساتھ باتیں کرتے ہیں اور جن بولتا ہے تو وہ اس آدمی یا عورت کی زبان سے بولتا ہے جس پر اس نے قبضہ جما لیا ہوتا ہے۔مثلاً عورت جن کے قبضے میں ہو گی تو وہ باتیں کرتے اپنے آپ کو مؤنث نہیں بلکہ مذکر سمجھے گی۔مثلاً یوں کہے گی کہ میں یہاں فلاں مقصد کے لئے آیا ہوں یا یہ کہ میں اسے نہیں چھوڑوں گا وغیرہ......جامی شاہ نے جن سے پوچھا کہ اس بے چاری نے تمہارا کیا بگاڑا ہے کہ تم نے اس پر اس بے رحمی سے قبضہ کر لیا ہے۔

''اس نے میرا کچھ نہیں بگاڑا''۔۔۔جن نے کہا۔۔۔''نہ میں اس کا کچھ بگاڑوں گا۔ یہ تو میری معشوق ہے۔مجھے تنگ کرو گے تو میں اسے یہاں سے اٹھا لے جاؤں گا اور اس سارے گھر کو تباہ کر دوں گا۔تم جدھر سے آئے ہو اُدھر ہی چلے جاؤ، میں اپنی مرضی سے اسے چھوڑوں گا''۔

میں وہ سارے مکالمے لکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا جو جن اور جامی شاہ کے درمیان ہوئے تھے۔ایسی باتیں آپ نے اکثر سنی ہوں گی۔جنات نکالنے والے جامی شاہ

جیسے آدمی جنات پر بڑا رعب جھاڑا کرتے ہیں اور انہیں اس قسم کی دھمکیاں دیا کرتے ہیں کہ میں تمہیں جلا کر راکھ کر دوں گا۔یہ رعب دراصل کسی جن پر نہیں بلکہ ان لوگوں پر جھاڑا جاتا ہے جو وہاں موجود ہوتے ہیں۔اس قسم کے شاہ جی اور عامل ان لوگوں کو تاثر دے رہے ہوتے ہیں کہ دیکھو اس کا رعب اور دبدبہ جنوں اور بھوتوں پر بھی چلتا ہے۔

شکور نے سنایا کہ جامی شاہ نے چار دنوں سے لڑکی کے گھر میں ہی ڈیرے ڈالے ہوئے ہیں اور وہ کہتا ہے کہ اس جن کو نکال کر ہی اس گھر سے نکلے گا...... میں نے اور میرے دو اور دوستوں نے جو وہاں بیٹھے شکور کی باتیں سن رہے تھے، یہ خاص طور پر دیکھا کہ شکور کو بہت ہی پریشان ہونا چاہئے تھا کیونکہ وہ تو اس لڑکی پر اپنی جان بھی قربان کر دینے کی باتیں کیا کرتا تھا۔میں نے یہ نوٹ کیا کہ شکور جب یہ بات سنا رہا تھا تو ایک دو مرتبہ وہ ہنسا بھی تھا اور مسکراہٹ تو تمام وقت اُس کے منہ پر موجود رہی تھی۔

میں نے اس سے کچھ باتیں پوچھیں اور کچھ باتیں میرے دوستوں نے پوچھیں۔ ہمارے لئے اور کسی کے لئے بھی یہ خبر کوئی عجیب اور نئی نہیں تھی کہ ایک لڑکی پر جن آتا ہے۔ یہ تو ایک عام بات تھی۔تقریباً ہر گاؤں میں ایک دو آدمیوں یا عورتوں پر جن قابض ہوتا ہے اور جامی شاہ نہیں تو کوئی اور شاہ جن کو نکالنے کے لئے آجاتا ہے۔ہر شاہ ایک ہی جیسی باتیں کرتا ہے اور ہر جن ویسے ہی جواب دیتا ہے جو ہم بچپن سے سنتے آئے ہیں اور اب تک سن رہے ہیں۔مجھے کچھ شک ہونے لگا۔میں اتنے دوستوں کی موجودگی میں شکور سے کوئی ایسی بات نہیں پوچھنا چاہتا تھا۔میں اس انتظار میں تھا کہ باقی دوست چلے جائیں اور صرف شہباز خان میرے پاس رہے......آخر دوست اٹھے اور چلے گئے اور شہباز خان وہاں موجود رہا۔وہ شکور کی خاطر ہمارے پاس بیٹھا رہا تھا۔

''ایک بات بتاؤ شکورا!''۔۔۔میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔۔۔''ہم تمہارے جگری یار ہیں۔ہمیں صحیح بات نہیں بتاؤ گے تو ہم تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکیں گے۔یہ تو ٹھیک بات نہیں کہ تم نے یہ بات سنائی ہے اور ہم بیگانوں کی طرح سن کر چپ رہیں...... یہ بتا دو کہ یہ جن تمہارا بلایا ہوا تو نہیں؟''

شکور کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آئی اور اس نے سر جھکا لیا۔مجھے پوری توقع تھی کہ وہ مجھے اور شہباز کو سچی بات بتا دے گا۔ہماری دوستی ہی کچھ ایسی تھی۔اس نے سر اٹھایا، میری طرف دیکھا پھر اُس نے شہباز کو دیکھا اور سر اس طرح اوپر نیچے آہستہ سے ہلایا جیسے

میری بات کا اقرار کیا ہو۔

"تمہیں نہیں بتاؤں گا تو کسے بتاؤں گا" ــــ شکور نے کہا ــــ "تم ٹھیک سمجھے ہو۔ اس کے سوا کوئی اور چارہ نہ تھا۔ میں دو دوستوں کے کہنے پر جامی شاہ کے پاس گیا تھا لیکن اُس وقت میرے دل میں یہ بات نہیں تھی کہ میں اور لڑکی یہ ناٹک کھیلنا چاہتے ہیں۔ دوستوں نے بتایا تھا کہ جامی شاہ کو بتاؤں کہ میں اس لڑکی کے ساتھ شادی کرنا چاہتا ہوں اور لڑکی تو گھر سے بھاگ آنے کو بھی تیار ہے اور وہ کوئی ایسا تعویذ دھاگہ کرے کہ لڑکی کو بھگا لے جانے کی بجائے عزت سے شادی ہو جائے۔ یہ تو مجھے بھی کچھ کچھ معلوم تھا کہ جامی شاہ کے ہاتھ میں کوئی غیبی علم یا طاقت ہے۔ جامی شاہ کے ساتھ کچھ سلام دعا تھی اور وہ مجھے اور میرے خاندان کو اچھی طرح جانتا تھا۔ میں نے اُسے اپنی مراد بتائی تو اُس نے کچھ باتیں پوچھی۔ اُسے یہ بتایا کہ لڑکی کی تو منگنی ہو چکی ہے تو وہ سوچ میں پڑ گیا۔ کچھ دیر بعد اس نے کہا کہ منگنی تڑوانا آسان نہیں، ایک طریقہ اور ہے جس سے میں تمہارا کام کروا سکتا ہوں۔ اُس نے یہ طریقہ بتایا کہ حوصلہ قائم رکھے ورنہ ذرا سا بھی کسی کو شک ہو گیا تو اُس کے لئے بُرا ہوگا"۔

مختصر بات یہ ہے کہ شکور اور لڑکی نے جامی شاہ کی ہدایات کے مطابق یہ ڈھونگ خود رچایا تھا۔ شکور نے ہاتھ جوڑ کر ہمیں کہا کہ ہم یہ بات اپنے کسی عزیز دوست کو بھی نہ بتائیں۔ ہم نے اُسے یقین دلایا کہ اس سے اصل حقیقت معلوم کرنے کی وجہ صرف یہ تھی کہ ہمیں پتہ چل جائے تاکہ کسی بھی قسم کی مدد کی ضرورت ہو تو ہم تیار رہیں اور یہ بات کسی اور کو معلوم نہیں ہوگی...... میں آج یہ راز فاش کر رہا ہوں جب شکور بھی اس دنیا میں نہیں۔ وہ دونوں ہی نہیں بلکہ اُس ڈرامے کے تمام اہم کردار دنیا سے اٹھ گئے ہیں۔

ہمارے لئے اور کسی کے لئے بھی، یہ خبر کوئی عجوبہ نہیں تھی کہ ایک لڑکی نے اپنے آپ پر جن کا قبضہ طاری کر لیا۔ آپ نے ایسی کہانیاں پڑھی ہوں گی اور ایسے واقعات سنے بھی ہوں گے اور ہو سکتا ہے آپ نے ایسی کسی لڑکی کو اس کیفیت میں دیکھا بھی ہو۔ ہمارے علاقے میں ایسے کچھ واقعات ہوئے ہیں لیکن میں حیران ہوں کہ کسی نہ کسی سٹیج پر پتہ چل جاتا ہے کہ فلاں لڑکی نے کسی وقت یہ ڈھونگ رچایا تھا اور اس کی شادی اپنی پسند کے لڑکے کے ساتھ ہو گئی تھی، اس کے باوجود جب اگلا واقعہ کہیں ہوتا ہے تو لوگ ذرا سا بھی شک نہیں کرتے کہ یہ سب ڈھونگ ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ لوگ جنات کو مانتے بھی ہیں لیکن یہ زیادہ مانتے ہیں کہ جن کسی نہ کسی پر قابض ہو جاتا ہے اور کچھ دنوں بعد بتاتا ہے کہ اس نے اس آدمی یا

عورت کو کیوں اپنے قبضے میں لیا ہے۔ جنات کی اکثر شکایت یہ ہوتی ہے کہ اس آدمی یا عورت نے ہماری ہانڈی میں پیشاب کر دیا تھا یا یہ کہ اس نے گزرتے ہوئے ہمارے دو برتن توڑ دیئے تھے۔

عام طور پر مشہور ہے کہ جنات پرنالوں کے نیچے رہتے ہیں۔ میں اکثر حیران ہوا کرتا ہوں کہ اُنہوں نے پرنالوں کے نیچے رہائش کیوں رکھی ہوئی ہیں برسات میں جب پرنالے بہتے ہیں تو پھر یہ جن کہاں شفٹ ہو جاتے ہیں، مجھے آج تک اس سوال کا جواب نہیں ملا۔ بہر حال لوگ یہی صحیح مانتے ہیں کہ جنات پرنالوں کے نیچے بستے رہتے ہیں، اسی لئے بڑے بوڑھے چھوٹوں کو خصوصاً بچوں کو نصیحت کیا کرتے ہیں کہ کسی پرنالے کے نیچے پیشاب نہ کرنا نہ ہی کبھی غلاظت پھینکنا۔ یہ بھی سنا تھا کہ بعض جنات درختوں کے نیچے رہتے ہیں اس لئے وہاں بھی غلاظت نہیں پھینکنی چاہئے لیکن میرے ایک بزرگ نے تردید کرتے ہوئے کہا تھا کہ درختوں کے نیچے پیشاب کرنا یا کسی بھی قسم کی غلاظت پھینکنا اس لئے منع ہے کہ درختوں کے نیچے کی جگہ صاف ستھری رہنی چاہئے۔

یہ جو کبھی کبھار کوئی لڑکی اپنے اوپر جن آنے کا ڈھونگ رچاتی ہے، میں اس سلسلے میں کچھ وضاحت ضروری سمجھتا ہوں...... تین چار دن لڑکی اس قسم کی ایکٹنگ کرتی ہے جیسے اس پر جن آ گیا ہو۔ جامی شاہ جیسے کسی عامل یا شاہ جی کو بلایا جاتا ہے جو جن کے ساتھ مذاکرات کرتا ہے۔ جن اتنی جلدی نہیں بولتا۔ دو تین دنوں بعد جن بول پڑتا ہے اور کہتا ہے کہ جس لڑکے کے ساتھ اس لڑکی کی شادی کی جا رہی ہے، اس کا میں کلیجہ منہ کے راستے نکال لوں گا۔ اگر اس لڑکے کی خیریت چاہتے ہو تو اس کی بارات اس گھر میں نہ آئے۔ لڑکے کے والدین جب جن کی یہ دھمکی سنتے ہیں تو وہ فوراً منگنی منسوخ کر دیتے ہیں۔ اپنے جوان بیٹے کا کلیجہ منہ کے راستے نکلنا کوئی ماں باپ برداشت نہیں کر سکتا۔

شاید دوسری جگہوں پر بھی ایسا ہی ہوتا ہو لیکن میں اپنے علاقے کی بات کر رہا ہوں اس لئے کہتا ہوں کہ جنات کی یہ دھمکی بہت ہی مشہور ہے کہ کلیجہ منہ کے راستے نکال لوں گا۔ چڑیلیں بھی یہی دھمکی دیا کرتی ہیں۔ آج تک کسی نے ایسا آدمی نہیں دیکھا جس کا کلیجہ کسی جن یا چڑیل نے منہ کے رستے نکال لیا ہو لیکن لوگ پورے وثوق سے کہتے ہیں کہ جن اور چڑیلیں بھی انسانوں کے کلیجے منہ کے راستے نکال لیتے ہیں۔

تقریباً تمام عامل اور وہ آدمی جو جن نکالا کرتے ہیں اچھی طرح جانتے ہیں کہ کوئی نہ

کوئی لڑکی کبھی نہ کبھی ایسا ڈھونگ رچا لیا کرتی ہے۔ عامل جب جا کر لڑکی کو دیکھتا ہے تو سب کو باہر نکال کر لڑکی کے پاس تنہائی میں بیٹھ جاتا ہے اور اسے کہتا ہے کہ وہ اپنے دل کی بات بتا دے اور وہ اس کی مراد پوری کر دے گا۔ لڑکی کچھ پس و پیش کے بعد عامل کی یقین دہانی سے دل کی بات بتا دیتی ہے۔ پھر تو عامل کی موج ہی لگ جاتی ہے۔ لڑکی کے ساتھ تنہا کمرے میں رہتا ہے اور دروازہ بند کر لیتا ہے اور گھر والے خوف کے مارے عامل کا ہر حکم مانتے ہیں اور ان میں سے کوئی اندر جھانکنے کی جرأت نہیں کرتا کہ یہ تو دیکھے کہ عامل لڑکی پر صرف پھونکیں مار رہا ہے یا کوئی خاص عمل کر رہا ہے۔ کون نہیں سمجھ سکتا کہ اس تنہائی میں عامل ایسی لڑکیوں سے کس قسم کی قیمت وصول کر لیا کرتے ہیں۔ لڑکی کے والدین سے جو فیس بمعہ انعام لیتے ہیں وہ الگ ہے۔ پھر یہ عامل لڑکی کو اپنی ہدایت کاری پر ایکٹنگ کرواتا ہے اور آخر اس کی مراد پوری کرا دیتا ہے۔ عامل کی بات کو تو شاید لوگ ٹال جائیں لیکن جن کے حکم کو وہ ٹالنے کی جرأت نہیں کرتے۔

اس ناٹک میں ان وجوہات کی بناء پر لڑکیاں کامیاب ہوتی ہیں کہ ایکٹنگ ایسی ہو جو گھر والوں کو خوفزدہ کر دے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ لوگ اپنے ایمان کی طرح مانتے ہیں کہ ان کی لڑکی پر جن کا قبضہ ہے اور پھر کامیابی کا اصل ضامن تو عامل ہوتا ہے۔

میں ایسے دو عاملوں کا ہمراز دوست رہ چکا ہوں جو کسی پہلو عامل نہیں تھے نہ وہ کوئی ایسا علم جانتے تھے لیکن دیہاتی علاقے میں ان کی شہرت ان کے ساتھ ساتھ چلتی تھی اور لوگ ان کی ہر بات مانتے تھے۔ جن نکالنے میں تو وہ خصوصی مہارت رکھتے تھے ان کے ساتھ میری دوستی اُس وقت شروع ہوئی تھی جب میری عمر چالیس برس کے قریب پہنچ گئی تھی۔ یہاں میں صرف ایک واقعہ سنا رہا ہوں اس لئے اپنے ان دوستوں کے فاش کئے ہوئے راز نہیں سناؤں گا۔ انہوں نے اپنی نوسر بازی کی بڑی ہی دلچسپ اور فکر انگیز باتیں سنائی تھیں۔ دونوں فوت ہو چکے ہیں۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ آئندہ ان دونوں کے قصے سناؤں گا۔

اتنی لمبی چوڑی وضاحت سے میرا مقصد یہ ظاہر یا ثابت کرنا ہے کہ یہ واقعہ کوئی انوکھا یا ناقابلِ یقین نہیں۔ مجھے یہ بھی یاد ہے ''حکایت'' میں بیس بائیس سال پہلے ایسا ہی ایک سچا واقعہ شائع ہُوا تھا۔ اس کہانی میں جگہوں اور کرداروں کے نام نہیں لکھے گئے تھے لیکن میں ذاتی طور پر جان گیا تھا کہ یہ واقعہ میرے علاقہ پوٹھوہار کا تھا اور میں ان لوگوں کو جانتا بھی تھا۔

اصل کہانی سے ہٹ کر ایک بات کہنا چاہوں گا جو ذہن میں آ گئی ہے۔ ایک بار عنایت اللہ مرحوم نے مجھے کہا تھا کہ بعض لوگ حیران ہیں کہ یہ صابر حسین راجپوت اتنی زیادہ سچی کہانیاں کہاں سے لے آیا ہے۔ بعض لوگوں کو شک ہے کہ یہ کہانیاں من گھڑت بھی ہو سکتی ہیں۔

میں پہلے بھی ایک کہانی میں یہ کہہ چکا ہوں کہ میں نے زندگی چنڈال چوکڑیوں میں اور چارپائی پر نہیں گزاری نہ حقے کی محفلیں جم جما کر گپ بازی کی ہے نہ تاش کھیلتے وقت گزارا ہے۔ زندگی خطروں میں کھڈوں اور نالوں میں، پُراسرار اور ڈراؤنی جگہوں میں کھوج لگاتے گزری ہے۔ ہم اُن جگہوں تک بھی پہنچے ہیں جہاں شاید آج بھی لوگ جاتے ڈرتے ہیں۔ طرح طرح کے لوگوں سے ملاقاتیں ہوتی ہیں اور ایسے واقعات آنکھوں کے سامنے سے گزرے ہیں جو ہر کوئی نہیں دیکھ سکتا اور یہی وہ واقعات ہیں جنہیں گھروں اور گلیوں میں عمر گزارنے والے ناقابل یقین سمجھتے ہیں۔ دوسری بات یہ کہ چھوٹے بڑے واقعات اتنے زیادہ اپنی آنکھوں کے سامنے ہوئے ہیں کہ ان میں سے کئی ایک ذہن کے قبرستان میں دفن ہو گئے ہیں۔ کبھی کوئی اُس دور کا کوئی آدمی یا عورت سامنے آ جائے یا ذرا سا اشارہ مل جائے تو ذہن سے یادوں کے چشمے پھوٹنے لگتے ہیں۔ یہ جو واقعہ سنا رہا ہوں، اس پگلے آدمی کو دیکھ کر یاد آیا ہے جسے کھیتوں میں دیکھا تھا اور پانچ روپے مانگے تھے۔

شکور نے جب ہمیں اصل بات بتا دی تو میں نے اور بعد میں راجہ شہباز خان نے بھی اسے سختی سے کہا کہ وہ لڑکی تک کسی طرح پیغام بھجوائے کہ وہ ایکٹنگ میں کوتاہی نہ کر بیٹھے ورنہ ماری جائے گی......شکور نے مایوسی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ وہ لڑکی کو دیکھ بھی نہیں سکتا کیونکہ لڑکی ہر وقت گھر میں رہتی ہے اور اس تک وہ پیغام بھی نہیں بھجوا سکتا۔ اُس نے بتایا جامی شاہ چونکہ اس ناٹک میں شامل ہے اس لئے وہ لڑکی سے بڑی ٹھیک ٹھاک ایکٹنگ کروا رہا ہے۔

اس کے چار پانچ روز بعد میں اور شہباز خان شکور کے گاؤں چلے گئے۔ وہ بہت خوش تھا۔ اُس نے بتایا کہ لڑکی کا جن بول پڑا ہے اور اس نے کہا ہے کہ اس لڑکی کی منگنی جس کے ساتھ کی گئی ہے، اگر شادی اس کے ساتھ کرو گے تو لڑکے کا کلیجہ منہ کے راستے نکال کر کوٹھے پر کوؤں اور چیلوں کے آگے پھینک دوں گا۔

شکور نے یہ بھی بتایا کہ جن کی یہ بات لڑکی کے منگیتر کے گھر پہنچی تو انہوں نے فوراً

اعلان کر دیا کہ وہ منگنی منسوخ کرتے ہیں۔ لڑکے کے والدین اور بہن بھائیوں کو خوفزدہ ہونا ہی تھا، خود لڑکا بھی اتنا ڈرا کہ وہ ہر کسی سے کہتا پھر رہا ہے کہ اس لڑکی کے ساتھ منگنی منسوخ ہو گئی ہے اور اس نے لڑکی کو دل سے اتار دیا ہے۔ اس لڑکے نے جو شکور کا ہی ہم عمر تھا، شکور کو بھی بتایا کہ اس نے یہ فیصلہ کیا ہے۔ اسے یہ تو معلوم ہی نہیں تھا کہ شکور اس لڑکی کو چاہتا ہے۔

اب چونکہ جن بول پڑا تھا اس لئے گھر والوں کو کم از کم اتنا سا اطمینان ہو گیا تھا کہ جن کا حکم مان لیا گیا ہے۔ اس لئے اب یہ ان کی بیٹی کو چھوڑ دے گا۔ وہ اب ہر وقت لڑکی کو تنگ نہیں کرتا تھا۔ جامی شاہ دن کا کچھ حصہ لڑکی کے ساتھ تنہائی میں گزارتا تھا اور رات اپنے گھر چلا جاتا تھا۔ شکور شام کے بعد چوری چھپے اس کے گاؤں پہنچ جاتا اور جامی شاہ اسے سب اچھا کی رپورٹ دیتا تھا۔ ابھی آدھی کامیابی حاصل ہوئی تھی یعنی منگنی ٹوٹ گئی تھی۔ اب جن نے دوسرا حکم دینا تھا کہ اس لڑکی کی شادی فلاں لڑکے کے ساتھ کی جائے۔

ہم نے شکور سے پوچھا کہ لڑکی کس حال میں ہے اور وہ ایکٹنگ کیسی کر رہی ہے۔

جامی شاہ نے اُسے یہ ساری بات سنائی تھی۔ لڑکی کی ایکٹنگ ہر لحاظ سے ٹھیک تھی بلکہ ضرورت سے زیادہ ٹھیک تھی۔ وہ چارپائی پر اچھلتی اور فرش پر اپنے آپ کو گرا دیتی تھی۔ فرش کچا تھا جس پر کچھ نہ کچھ دھول اور مٹی رہتی تھی۔ لڑکی فرش پر دوہتڑ مارتی اور پھر اپنے منہ پر ایسے ہی دوہتڑ مارتی اور پھر اپنے بال نوچتی تھی۔ ایک تو اس طرح اس کا حلیہ بگڑا۔ دوسرے اس طرح اس کا چہرہ ڈراؤنا ہوا کہ اُس نے کھانا پینا ہی چھوڑ دیا تھا۔ اپنے بال اس نے بکھیر لئے تھے اور بالوں پر بھی مٹی پڑی ہوئی تھی۔ جامی شاہ نے شکور کو ہنس ہنس کر بتایا تھا کہ شکور اگر اب اس لڑکی کو دیکھے تو کانوں کو ہاتھ لگا کر کہے کہ میں تو اس چڑیل کے ساتھ شادی نہیں کروں گا۔ ورنہ یہ میرا کلیجہ بھی منہ کے راستے نکال دے گی۔

اُس روز تو شکور سے اتنی ہی رپورٹ ملی جو آپ کو سنائی ہے۔ چار پانچ دن اور گزر گئے تو شکور ہمارے ہاں آیا۔ اُس روز تو وہ بہت ہی خوش تھا۔ اُس نے بتایا کہ کل جن نے کہا ہے کہ مجھے اس لڑکی کے ساتھ عشق ہو گیا ہے اس لئے میں اس کی زندگی برباد نہیں ہونے دوں گا چونکہ یہ میری محبوبہ ہے اس لئے اس کی شادی میری مرضی کے مطابق ہو گی۔ میں نے اس کے لئے جو لڑکا چنا ہے وہی اُس کے لئے اور دونوں گھروں کے لئے بابرکت ثابت ہو گا۔

شکور نے بتایا کہ ابھی لڑکی کے منہ سے اس کا نام نہیں نکلا۔ جن نے کہا کہ وہ ایک دو دنوں بعد نام بتائے گا۔ لڑکی کے ماں باپ نے جن سے کہا ہے کہ وہ جو لڑکا بتائے گا، بیٹی کی

شادی وہ اسی کے ساتھ کریں گے۔ باپ نے جن کے آگے ہاتھ جوڑ کر کہا کہ وہ کسی نیچ ذات کا لڑکا نہ بتا دے کیونکہ گاؤں میں اور ساری برادری میں بڑی بے عزتی ہو گی۔ جن نے کہا کہ وہ اپنی محبوبہ کو اونچے خاندان میں بیاہے گا۔

اب تو ہمیں بھی یقین آنے لگا تھا کہ شکور کی مراد پوری ہو جائے گی۔ ہم اب اگلی خبر سننے کو بے تاب ہو گئے۔ تین چار روز بڑی مشکل سے صبر کیا۔ امید تھی کہ شکور اپنی گھوڑی پر سوار کسی بھی وقت آ پہنچے گا اور باچھیں کھلائے خوشخبری سنائے گا لیکن وہ نہ آیا تو ہم دونوں اپنی گھوڑیوں پر سوار ہوئے اور اُس کے ہاں جا پہنچے۔ جس جوش اور شدّت سے وہ ہم سے بغلگیر ہو کر ملا، ہم اس سے سمجھ گئے کہ اُس نے میدان مار لیا ہے۔

''ہو گیا...... فیصلہ ہو گیا''___ اس نے کہا___ ''بات طے ہو گئی ہے۔ اب شادی کا دن مقرر کرنا ہے جو بڑے کریں گے''۔

شکور نے بتایا کہ تین روز پہلے جن نے کہا کہ اس گاؤں میں شکور نام کا ایک لڑکا ہے جو مجھے بہت ہی پسند ہے۔ اس لڑکی کو میں اس کے ساتھ بیاہوں گا۔ اگر شکور کے ماں باپ رضامند نہ ہوئے اور کسی اور لڑکی کو بیاہ لائے تو وہ لڑکی اس گھر میں آباد نہیں ہو سکے گی اور شکور کو بھی کچھ نقصان پہنچے گا۔ ہو سکتا ہے کہ اس کی ایک آنکھ یا ایک بازو یا ایک ٹانگ ضائع ہو جائے اور جس کے ساتھ اس کی شادی ہو گی، وہ لڑکی بہت ہی خجل خراب ہو گی اس کی ساری عمر در بدر ٹھوکریں کھاتے گزرے گی۔

یہ بات شکور کے والدین تک پہنچی تو وہ پریشان ہو گئے۔ یہ تو کسی کو بھی معلوم نہیں تھا کہ شکور اور یہ لڑکی ایک دوسرے کو دل و جان سے چاہتے ہیں۔ یہ بھی کسی کو شک نہ ہوا کہ کوئی جن نہیں آتا اور لڑکی خود ہی جن اور چڑیل بنی ہوئی ہے اور یہ سب ڈھونگ ہے۔ لڑکی کے والدین نے جن کے ساتھ وعدہ کیا کہ وہ اپنی لڑکی کا ہاتھ شکور کو ہی دیں گے لیکن لڑکی کے والدین کے لیے یہ معاملہ خاصا ٹیڑھا تھا کہ وہ شکور کے گھر جا کر لڑکی پیش نہیں کر سکتے تھے کیونکہ یہ طریقہ دیہات میں نہیں چلتا اور بہت ہی معیوب سمجھا جاتا ہے۔ جامی شاہ کے ساتھ بات ہوئی تو اس نے کہا کہ یہ معاملہ وہ خود طے کرے گا۔

جامی شاہ شکور کے باپ سے ملا اور اسے جن کا فیصلہ سنایا اور خوب ڈرایا کہ وہ فوراً اس فیصلے پر عمل کریں کیونکہ یہ جن طبیعت کا بڑا ہی سخت ہے اور وہ ایسا نقصان پہنچائے گا کہ سب پچھتاتے رہیں گے۔

جامی شاہ کے متعلق تو یہ پہلے ہی مشہور تھا کہ اس کے قبضے میں جنّات ہیں اور اس کے ہاتھ میں غیبی طاقت بھی ہے۔ اس نے شکور کے باپ سے کہا کہ وہ لوگ لڑکی دینے کو تیار ہیں اور اب وہ لڑکی کے ہاں جائے اور یہ معاملہ فوراً نمٹا دیا جائے۔ جامی شاہ نے یہ بھی کہا کہ اس نے بڑی ہی مشکل سے جن کی زبان کھلوائی ہے۔ وہ تو لڑکی کو چھوڑ ہی نہیں رہا تھا۔ جامی شاہ نے یہ بھی کہا کہ دیر نہ کریں کہیں ایسا نہ ہو کہ شکور پر جن وار کر جائے۔

شکور نے سنایا کہ اس نے خوفزدگی کی ایکٹنگ اس طرح کی کہ اپنے ماں باپ اور گھر کے دیگر افراد میں بیٹھ کر خوف سے تھر تھر کانپنے لگا اور کہا کہ اس کے دِل کو کچھ ہو رہا ہے اور فوراً لڑکی کے گھر جائیں۔ شکور کے ماں باپ کے تو رنگ ہی اُڑ گئے اور وہ اسی وقت لڑکی والوں کے گھر چلے گئے۔ لڑکی والوں نے دل و جان سے ان کا استقبال کیا اور جن اور جامی شاہ کے ذریعے بات طے ہوگئی اور پھر جو رسم کرنی چاہئے تھی وہ بھی ہوگئی اور اب شادی کا دن مقرر کرنا تھا۔

جن آخری بار حاضر ہوا۔ لڑکی نے اپنا جسم اکڑا لیا اور فوراً ایک گھوڑا جامی شاہ کی طرف بھیجا گیا۔ جامی شاہ آگیا اور اس نے جن کو خوب ڈانٹ پلائی اور کہا کہ تمہاری دونوں باتیں مان لی گئی ہیں۔ جن نے کہا کہ میں دعائے خیر کے لیے آیا ہوں۔ لڑکی اٹھ کر بیٹھ گئی اور ہاتھ دعا کے لیے کھڑے کئے۔ گھر کے سب لوگوں نے بھی دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے۔ لڑکی اَن پڑھ تھی۔ اسے یہ جامی شاہ نے بتایا تھا کہ اس نے اس طرح کرنا ہے اور یہ آخری ایکٹنگ ہوگی۔ جامی شاہ نے چاروں قل پڑھے اور بلند آواز سے دعا کی کہ اللہ لڑکے کو ہمیشہ آباد رکھے، وغیرہ وغیرہ۔ لڑکی نے اپنے جسم کو اکڑایا اور پھر کلمہ شریف پڑھا اور چارپائی سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔

لڑکی کے والدین نے شکور کے والدین سے کہا کہ لڑکی کی صحت بہت ہی گر چکی ہے اور یہ کمزور ہوگئی ہے۔ اسے واپس اپنی صحت میں آنے دیں اور پھر دن مقرر کر لیں...... ہم واپس آگئے۔ آٹھ دس دن گزرے تو ایک روز شکور آیا اور ہمیں شادی کی دعوت دے کر چلا گیا۔

ان تفصیلات میں آپ کے لیے کوئی دلچسپی نہیں کہ شادی کس طرح ہوئی اور اس شادی پر کیسی دھوم دھام تھی۔ اتنا ہی سنا دینا کافی ہے کہ اس لڑکی کی شادی شکور کے ساتھ ہو گئی۔ دو تین بعد میں نے شکور اور اس کی بیوی کو اپنے ہاں کھانے پر مدعو کیا۔ وہ پردہ نہیں کرتی تھی نہ ہمارے دیہات میں برقعے اور پردے کا رواج تھا۔ میں نے پہلی بار لڑکی کو

دیکھا اور اللہ کی قدرت کی تعریف کی جس نے اس لڑکی کو ایسا حسن دیا تھا۔ وہ ہر لحاظ سے خوبصورت تھی۔ اس کے دو روز بعد راجہ شہباز خان نے دونوں کو اپنے ہاں کھانے پر مدعو کیا۔ اس کے کچھ دن بعد شکور نے ہمارے ہاں آکر کہا کہ اب شکار پر چلتے ہیں۔ ہم نے دن مقرر کر لیا اور اس دن ہم صبح سویرے نکلے اور شکور کے گاؤں پہنچے۔ وہ اپنے بھیڑیا نما کتے کے ساتھ تیار تھا اور ہم شکار کے لیے چلے گئے۔

ہم خوش تھے، شکور خوش تھا اور اس کی بیوی تو بہت ہی خوش تھی کہ ایک ڈرامہ بڑے اچھے انجام کو پہنچ گیا ہے لیکن یہ کہانی یہیں پر ختم نہ ہوئی۔ اللہ کو کچھ اور ہی منظور تھا۔

شکور کے ساتھ ہماری ملاقاتیں کم ہونے لگیں۔ ہم نے بھی اس کے گاؤں جانا خاصا کم کر دیا کیونکہ وہ اب اپنی بیوی میں مگن ہو گیا تھا اور اب ہم اس کی زندگی میں زیادہ مخل نہیں ہونا چاہتے تھے۔ دو تین مہینوں بعد وہ آیا اور اس نے یہ خوشخبری سنائی کہ وہ باپ بننے والا ہے لیکن چھ سات مہینے انتظار کرنا ہوگا۔ ایک بار ہم پھر شکار کو بھی گئے۔ میں شکور کو دنیا کا سب سے زیادہ خوش اور مطمئن آدمی سمجھنے لگا تھا۔ اس کے بعد شکور کے ساتھ ہماری ملاقات چار مہینوں کے بعد ہوئی۔ وہ اس طرح ہوئی کہ ایک روز شہباز خان نے کہا کہ چلو اپنے یار کو دیکھ ہی آئیں۔ ہم گھوڑیوں پر سوار ہوئے اور اس کے گاؤں جا پہنچے لیکن اس کے چہرے پر اداسی اور پریشانی دیکھ کر ہم بھی پریشان ہو گئے۔ وہ تو ہمیں بازوؤں میں لے کر ملا کرتا تھا اور ملتا بھی ایسا جیسے بھینچ کر ہماری پسلیاں توڑنے کی کوشش کر رہا ہو لیکن اس روز اس نے ایسی بددلی سے صرف ہاتھ ملایا جیسے ہمیں دیکھ کر ذرا سا بھی خوش نہ ہوا ہو اس کا موڈ ہی بگڑ گیا ہو۔ اس نے ہمیں بٹھایا اور سر جھکا کر بیٹھ گیا۔ تب میں نے اُس سے پوچھا، خیریت تو ہے؟

اس نے سر اٹھایا تو میں اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر لرز گیا۔ یہ تو ہنسنے ہنسانے والا آدمی تھا اور اس کی وہ مراد پوری ہو گئی تھی جس کے پورا ہونے کی ذرا سی بھی توقع نہیں تھی۔

''سمجھ نہیں آتی کیا کروں، کدھر جاؤں!'' ___ شکور نے بڑی ہی دبی اور بجھی ہوئی آواز میں کہا ___ ''ایسی بات ہوگئی ہے جو اب بنتی نظر نہیں آتی...... غیرت کا معاملہ ہے...... میری بیوی نے پہلا بچہ پیدا کر دیا ہے اور شادی کو ابھی آٹھ مہینے بھی پورے نہیں ہوئے۔ صاف ظاہر ہے کہ یہ بچہ میرا نہیں''۔

اس نے جو تفصیل سنائی وہ اس طرح ہے کہ شادی کے آٹھویں مہینے ہی اس کی بیوی نے پہلے بچے کو جنم دیا۔ اس میں کسی شک شبہے کی گنجائش نہیں تھی کہ یہ بچہ شکور کا نہیں تھا اور

شادی سے پہلے اس کی بیوی نے کسی اور کے ساتھ تعلقات پیدا کر لئے ہوں گے۔ شکور قسمیں کھا کھا کر بتاتا تھا کہ اس کی محبت پاک تھی اور اس نے اللہ سے دعا کی اور عہد کیا تھا کہ شادی اسی لڑکی کے ساتھ کرے گا۔

بچہ پیدا ہوا تو شکور کا سارا گھر لرز کر رہ گیا۔ شکور کے ماں باپ اور بہن بھائیوں نے اسے صاف کہہ دیا کہ یہ بچہ اس کا نہیں اور لڑکی یہ بچہ اپنے ساتھ لائی تھی۔ ہمارے دیہات میں نئی تہذیب، باہر کا پیسہ، ٹی وی اور وی سی آر پہنچ گئے ہیں اس لئے اب غیرت مندی تو ہے لیکن ویسی نہیں جیسی ہمارے وقتوں میں ہوا کرتی تھی۔ اس وقت تو ذرا سے شک پر کلہاڑیاں اور لاٹھیاں چل جاتیں، کچھ زخمی ہوتے اور ایک آدھ بندہ قتل ہو جاتا تھا۔ اس طرح جب شکور کے سامنے غیرت آئی تو وہ اپنی محبت کو بھول گیا۔ وہ تنہائی میں بیوی کے پاس بیٹھا اور اسے کہا کہ اب سوائے طلاق کے کوئی اور راستہ نہیں لیکن وہ یہ بتا دے کہ یہ بچہ کس کا ہے۔

اس کی بیوی نے ذرا سی بھی پس و پیش نہ کی اور فوراً بتا دیا کہ یہ بچہ جامی شاہ کا ہے۔ یہ کوئی حیرت ناک بات نہیں تھی۔ آج بھی پیر، شاہ اور عامل ان عورتوں سے یہی قیمت وصول کرتے ہیں جو ان کے پاس اپنی مرادیں اور مسائل لے کر جاتی ہیں۔ میں پہلے سنا چکا ہوں کہ جامی شاہ لڑکی کو بند کمرے میں اپنے ساتھ تنہا رکھتا تھا اور لڑکی کے بزرگ اور لواحقین خوش تھے کہ جامی شاہ جن کو قابو کر رہا ہے۔ لڑکی اس آدمی کو اچھا نہیں سمجھتی تھی جس کے ساتھ اس کی منگنی ہوتی تھی اور وہ شکور کو روحانی طور پر چاہتی تھی۔ جامی شاہ اس کے ڈرامے کا ہدایت کار تھا اور اس کی موجودگی میں اس کی کوشش سے ڈرامہ کامیاب ہو رہا تھا۔ جامی شاہ نے جب لڑکی سے یہ مطالبہ کیا کہ وہ اس کی عزت اور عصمت چاہتا ہے تو لڑکی نے انکار نہ کیا۔ جامی شاہ جتنے دن لڑکی کے ساتھ رہا، وہ یہ کھیل کھیلتا رہا اور پھر اس کے عوض اس ڈرامے کو بڑے کامیاب انجام تک پہنچا دیا۔

جامی شاہ کی تو عیش موج لگ گئی تھی۔ اس نے لڑکی کے والدین سے بھی اور شکور سے بھی نقد معاوضہ الگ لیا اور نئے کپڑے الگ لئے اور لڑکی سے جو معاوضہ وصول کیا وہ کسی کو معلوم ہی نہیں تھا لیکن اللہ کی ذات باری دیکھ رہی تھی جس نے یہ گناہ سب کو دکھا دیا...... لڑکی نے شکور کو صاف الفاظ میں اصل بات بتا دی۔

شکور نے ہمیں بتایا کہ لڑکا پیدا ہوئے تقریباً دو مہینے گزر گئے ہیں اور لڑکی کو اس کے

والدین کے پاس بھیج دیا گیا ہے۔ لڑکی کے والدین اور دیگر لواحقین بھی پریشان تھے کہ یہ ہوا کیا اور کیسے ہوا۔ وہ تو بات کرنے کے قابل نہیں رہے تھے۔ ادھر شکور لڑکی کو یوں اپنے آپ سے جدا نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن اسے اپنی اور اپنے خاندان کی غیرت زیادہ عزیز تھی اور ہونی بھی چاہئے تھی۔ اسے باپ نے کہا کہ یہ بچہ اگر شادی سے پہلے کا تمہارا ہے تو اور بات ہے، اگر نہیں تو اس لڑکی کو چلتا کرو۔ شکور نے باپ کی بات مان لی اور لڑکی کو ہمیشہ کے لیے رخصت کر دیا۔ ابھی طلاق نہیں دی تھی۔

یہ ایسی صورتِ حال تھی کہ ہم اسے کوئی مشورہ نہیں دے رہے تھے نہ اس نے ہم سے پوچھا کہ اس صورتِ حال سے وہ کس طرح نکل سکتا ہے کہ بیوی کو پاس رکھ سکے۔ وہ سوچ سمجھ کر فیصلہ کر چکا تھا۔ البتہ اس نے یہ کہا کہ وہ جامی شاہ کو زندہ نہیں چھوڑے گا اور اپنی بے عزتی کا انتقام لے گا۔

یہ ایسی بات تھی کہ ہم نے شکور کو سمجھانا شروع کر دیا کہ اپنے آپ کو اس تباہی میں نہ ڈالے۔ ہم نے کہا کہ اس نے جامی شاہ کو قتل کر دیا اور کیا بھی ایسے کہ شکور پر قتل کا شک نہ ہو تو بھی پولیس کڑیاں ملا کر اسے پکڑ لے گی۔ اس وقت کی پولیس آج کی پولیس جیسی نہیں تھی۔ تھانیدار زمین کی تہوں کے نیچے سے سراغ نکال لیا کرتے تھے لیکن شکور بڑا ہی پکا ارادہ کر چکا تھا کہ وہ جامی شاہ سے انتقام لے گا اور اسے پھانسی کی سزا مل گئی تو بھی اسے خوشی ہوگی۔

اس روز ہم شکور کے گھر یوں بیٹھے رہے جیسے ختم والے گھر لوگ بیٹھتے ہیں۔ شکور پر بہت بُری بن گئی تھی۔ اس نے کہا کہ اس کی بیوی مر جاتی تو وہ اتنا مغموم نہ ہوتا۔ مغموم تو وہ ضرور ہی ہوتا لیکن اس غم میں ذلت نہ ہوتی، انتقام کا یہ جذبہ نہ ہوتا جو شکور کو پاگل کئے جا رہا تھا۔ میں اور شہباز اسے سمجھاتے رہے کہ وہ اپنی زندگی تباہ نہ کرے۔ وہ تو ابھی جوانی کے آغاز کی عمر میں تھا لیکن وہ کہتا تھا کہ لعنت ہے اس زندگی پر جو بے غیرتی میں گزاری جائے۔ اس نے ہماری صرف یہ بات مانی کہ وہ ایسے طریقے سے قتل کرے گا کہ اس پر کسی کو ذرا سا بھی شک نہیں ہوگا بلکہ وہ کوشش یہ کرے گا کہ قتل کا طریقہ ایسا اختیار کرے کہ یہ بھی شک نہ ہو کہ جامی شاہ کو قتل کیا گیا ہے۔ ہم اسے کوئی محفوظ طریقہ نہ بتا سکے اور بتانا چاہتے بھی نہیں تھے۔

ہم شکور جیسے عزیز دوست کو تنہا نہیں چھوڑنا چاہتے تھے لیکن یہ تو ممکن ہی نہیں تھا کہ ہم اس کے ساتھ ہی رہتے۔ دوپہر کے وقت ہم واپس آ گئے۔ میں اور راجہ شہباز خان پہلے ہی ان پیروں کو اور جامی شاہ جیسے عاملوں اور جنات کو قبضے میں رکھنے اور نکالنے کا دعویٰ کرنے

والوں کو مانتے ہی نہیں تھے اور اسی لئے ہم دونوں بے پیرے مشہور تھے۔ ہم دونوں اس قسم کی باتیں کرتے واپس آئے کہ لوگوں کو کس طرح بتائیں اور دکھائیں کہ وہ دیکھو ایک شاہ نے ایک گھر اُجاڑ دیا ہے اور ایک میاں بیوی کی محبت کو اپنی خباثت کی تلوار سے کاٹ کر دونوں حصے الگ الگ پھینک دیئے ہیں لیکن ہم ایسی بات منہ سے نکال کر لوگوں سے اپنی بے عزتی نہیں کروا سکتے تھے۔ میں نے پہلے کہا ہے کہ لوگ اللہ کی حکم عدولی کر لیتے ہیں، جامی شاہ جیسے عاملوں اور پیروں کا حکم بسر و چشم مانتے ہیں، یہاں تک کہ اپنی کنواری بیٹیوں اور جوان بیویوں کو ان کے حکم سے ان کے پاس تنہا بھیج دیتے ہیں بلکہ خود ان کے پاس چھوڑ آتے ہیں۔ یہ غیر اسلامی سلسلہ جس طرح اس دور میں چلتا تھا آج بھی ویسا ہی چل رہا ہے۔ دیہات میں ہی نہیں شہروں میں بھی یہ ابلیسیت پھل پھول رہی ہے اور لوگوں نے اپنی آنکھوں پر خود فریبی کی پٹی باندھ رکھی ہے۔

چار پانچ مہینے گزر گئے، شکور سے ملاقات نہ ہو سکی۔ نہ وہ آیا نہ ہم گئے۔ اس کے ہاں جانے کی کئی بار سوچی لیکن یہ سوچ کر چپ رہے کہ وہاں جا کریں گے کیا، شکور کی کوئی مدد تو ہم کر ہی نہیں سکتے سوائے اس کے کہ کوئی پند و نصیحت کریں گے لیکن وہ برا منائے گا۔

ایک روز ایک آدمی ہمارے گاؤں میں یہ خبر سنا گیا کہ وہ جو عامل اور جن نکالنے والا جامی شاہ تھا، وہ مارا گیا ہے۔ ہمارے گاؤں میں کچھ ایسے آدمی تھے جو اس کی کرامات کو اور غیبی طاقت کو مانتے تھے۔ انہوں نے اس آدمی سے پوری بات سنی تھی۔ انہوں نے ہمیں سنائی جو اس طرح تھی کہ جامی شاہ اپنی گھوڑی پر کہیں جا رہا تھا۔ وہ ایک ویرانے سے گزر رہا تھا۔ معلوم نہیں کیسے اس کی گھوڑی بدک گئی اور بے لگام ہو کر بھاگ اٹھی۔ جامی شاہ گھوڑی سے گرا، اس کا پاؤں رکاب میں آگے سرک گیا اور رکاب میں پھنس گیا۔ گھوڑی اسے گھسیٹتی پھری اور جرنیلی سڑک تک پہنچ گئی۔ لوگوں نے دیکھ لیا اور گھوڑی کو گھیر کر روکا۔ جامی شاہ خون میں نہایا ہوا تھا اور مر گیا تھا۔ لوگ اسے پہچانتے تھے، انہوں نے اس کی لاش اور گھوڑی اس کے گھر پہنچا دی۔ یہ پتہ نہیں چلا کہ گھوڑی کہاں اور کس طرح بدکی تھی۔ اتنا کہا جا سکتا تھا کہ جامی شاہ کی لاش کی جو حالت تھی وہ بتاتی تھی کہ گھوڑی اسے بہت دور سے گھسیٹتی لا رہی تھی۔

یہ خبر سن کر مجھے اور میرے دوست راجہ شہباز خان کو بہت ہی خوشی ہوئی کہ چلو ایک ابلیس کو تو اللہ نے پکڑا۔ اس سے زیادہ سنگین سزا اور کیا ہو سکتی تھی۔ وہ بڑی ہی اذیت ناک موت مرا تھا۔

ہم اگلے روز صبح سویرے شکور کے گاؤں کو روانہ ہو گئے۔ ہم اسے مبارک دینا چاہتے تھے کہ جو کام وہ کرنا چاہتا تھا وہ اللہ نے کر دیا اور وہ یعنی شکور عمر قید یا سزائے موت سے بچ گیا ہے۔ راستے میں شہباز اور میں اس موضوع پر باتیں کرتے گئے کہ ہم لوگ کتنے کم عقل اور بدنصیب ہیں کہ عبرت حاصل نہیں کرتے اور اپنے عقیدوں اور نظروں کو وہیں کا وہیں رکھا ہوا ہے جہاں ہم نے انہیں اپنے دل میں داخل کیا تھا۔

اس روز شکور ہمیں پہلے والے تپاک اور پیار سے ملا۔ ہم دونوں نے اس کے کان میں سرگوشی کے لہجے میں مبارک دی۔ معلوم ہوا کہ جامی شاہ کو دفن ہوئے سات آٹھ دن گزر گئے ہیں...... شکور نے بتایا کہ اس نے بیوی کو طلاق دے دی تھی۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ ایک عورت کی زبانی بیوی کا پیغام آیا تھا۔ اس نے اللہ اور رسول کے نام پر معافی مانگی تھی اور یہ بھی کہا تھا کہ وہ اس بچے کا گلا گھونٹ کر شکور کے پاس آ جائے گی اور باقی عمر اس کے قدموں میں گزارے گی۔ اگر معاملہ شکور کا ہوتا تو وہ دل پر پتھر رکھ کر بیوی کو معاف کر دیتا لیکن مسئلہ پورے خاندان کی عزت اور غیرت کا تھا۔

شکور نے یہ بھی بتایا کہ اس کی بیوی بچے کو ٹھیک طرح پال پوس رہی ہے لیکن اس کی اپنی صحت بڑی تیزی سے گرتی جا رہی ہے۔ شکور خود بھی پہلے کی طرح شگفتہ اور زندہ دل نہیں رہا تھا لیکن جسمانی طور پر ٹھیک تھا اور جامی شاہ کی موت سے بہت ہی خوش تھا۔ اس نے ہمیں کہا کہ ہم شام اس کے ساتھ رہیں اگر رات بھی وہیں گزاریں تو اسے اور زیادہ خوشی ہو گی۔ ہم رات تو وہاں نہیں گزار سکتے تھے کیونکہ گھر یہی بتا کے آئے تھے کہ شام کو واپس آ جائیں گے۔

دوپہر کا کھانا کھا کر شکور نے کہا کہ چلو ذرا باہر کہیں چل کے بیٹھتے ہیں۔ ہم کھیتوں کی طرف نکل گئے اور ایک بڑی اچھی جگہ درختوں کے نیچے جا بیٹھے۔ وہاں جا کر شکور نے کہا کہ ہم اس کے ایسے دوست ہیں جنہیں وہ اپنا ہر راز بتا دیا کرتا ہے اور اس سے اسے بڑا سکون ملتا ہے۔ اس نے ہمیں اپنی بیوی کے جن کی اصلیت بھی بتا دی تھی اور یہ ایک ایسا راز تھا جو کوئی نہیں بتایا کرتا۔

''اب میرا ایک اور راز دل میں دفن کر لو'' ـــــ شکور نے کہا ـــــ ''جامی شاہ کو میں نے قتل کیا ہے۔ یہ وہ راز ہے جو اللہ کے سوا اور میرے ایک دوست کے سوا کوئی نہیں جانتا''۔

اس نے قتل کا جو طریقہ بتایا وہ بڑی ہی دانشمندانہ تھا۔ جامی شاہ کی موت اسی طرح لکھی ہوئی تھی اور اللہ نے ایسی ہی موت مارنا تھا اس لئے اس کے مؤافق حالات پیدا ہو گئے تھے۔ وہ اس طرح کہ اس روز شکور کا دل کچھ زیادہ ہی اداس ہو گیا تو اس نے ہم جیسے ایک عزیز دوست کو ساتھ لیا اور کہا کہ چلو آج کُتے کو ساتھ لیتے ہیں اور کہیں دور نکل چلتے ہیں، شکار کھیلیں گے۔ شکور کا یہ وہی کتا تھا جو اس کے ساتھ ہماری دوستی کا باعث بنا تھا۔ دونوں دوستوں نے اس کُتے کو ساتھ لیا اور گاؤں سے نکل گئے۔

شکور کا گاؤں اس پہاڑی علاقے کے قریب تھا جس کا میں اکثر ذکر کیا کرتا ہوں۔ دونوں دوست اس علاقے کے کچھ اندر چلے گئے۔ شکور نے شکار کیا کھیلنا تھا وہ تو ذرا دل بہلانے کے لیے آبادیوں سے دور نکل جانا چاہتا تھا۔

کچھ اور آگے گئے تو اچانک ایک طرف سے جامی شاہ اپنی گھوڑی پر سوار سامنے آ گیا۔ جامی شاہ کے پاس کمزور سی گھوڑی تھی۔ کمزور کا مطلب یہ ہے کہ وہ کوئی اعلیٰ نسل کی گھوڑی نہیں تھی۔ جامی شاہ کو دیکھ کر شکور کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ اس نے سوچا کہ آج اس کا کام یہیں تمام کر دیا جائے۔ جامی شاہ سے ملے ایک عرصہ ہو گیا تھا۔ شکور نے سوچا تو یہ تھا کہ جامی شاہ کو گھوڑی سے اتار کر چاقو سے قتل کر دیا جائے لیکن اچانک اس کے دماغ میں روشنی چمکی اور ایک طریقہ سوجھ گیا۔

جامی شاہ کے قریب پہنچنے تک شکور نے اپنے دوست کو بتا دیا کہ وہ کیا کرنے والا ہے۔ اس کا یہ دوست ہماری طرح اس کا ہمراز تھا۔ دوست نے اسے کہا کہ وہ چاقو اسے دے دے اور پھر دونوں نے نہایت تیزی سے قتل کا پلان بنا لیا۔

قریب آ کر جامی شاہ نے گھوڑی روک لی اور آگے کو جھک کر شکور اور اس کے دوست سے ہاتھ ملایا اور خیر خیریت پوچھی۔ گھوڑی شکور کے کُتے کو دیکھ کر ڈرنے لگی تھی۔ وہ جگہ ایسی تھی جسے ایک قلعہ کہا جائے تو غلط نہیں ہو گا۔ میں اور شہباز اس جگہ سے واقف تھے۔ دور دور اور کچھ نزدیک بھی سلوں والی چٹانیں کھڑی تھیں، مٹی کے ٹیلے بھی تھے۔ پھلاہی کے درخت تو بے شمار تھے اور جھاڑیاں وغیرہ بھی تھیں۔ وہاں انہیں دیکھنے والا کوئی بھی نہیں تھا۔ وہ کوئی عام راستہ نہیں تھا۔

شکور نے بڑے اچھے موڈ میں جامی شاہ سے پوچھا کہ وہ کہاں جا رہا ہے۔ اس نے کچھ دور آگے کے گاؤں کا نام لیا۔ شکور نے پھرتی سے جامی شاہ کے دائیں ٹخنے کو پکڑا اور

اس کا پاؤں رکاب کے اندر کر کے رکاب ٹانگ پر چڑھا دی اور اس کے ساتھ ہی اس کے دوست نے پیچھے سے گھوڑی کو چاقو کی نوک زور سے چبھوئی اور پھر شکور نے گھوڑی کے پیٹ میں لات ماری۔ گھوڑی چاقو کی نوک سے گھبرا کر بدکی اور دوڑنے لگی۔ اس سے پہلے شکور نے جامی شاہ کا دایاں بازو پکڑ کر اپنی طرف کھینچا تھا جس سے جامی شاہ کا توازن ٹوٹ گیا اور وہ دائیں کو گرنے لگا۔ گھوڑی بدک کر دوڑی تو شکور نے اپنے کُتے کی زنجیر کھول کر اسے تھپکی دی اور خود دوڑا اس طرح کُتے کو گھوڑی کے پیچھے دوڑا دیا۔ بھیڑیے کی نسل کا کتا گھوڑی تک پہنچ گیا اور اُچھل اُچھل کر بھونکنے لگا تو گھوڑی کی رفتار اور تیز ہو گئی اور جامی شاہ جو دائیں طرف پہلے ہی گر رہا تھا، زمین پر آ گیا۔ اس کا اس طرح کا پاؤں شکور نے رکاب میں پھنسا دیا تھا اس لئے گھوڑی اسے گھسیٹنے لگی۔

کچھ دور تک شکور اور اس کا دوست دوڑے اور پھر شکور نے سیٹیاں بجا کر اور پکار پکار کر اپنے کُتے کو واپس بلا لیا اور اس دوران گھوڑی چٹانوں اور ٹیلوں کے پیچھے غائب ہو گئی۔

شکور اور اس کا دوست وہیں سے ایک طرف نکل گئے اور بہت ہی تیز تیز چلتے موقعۂ واردات سے دور نکل گئے۔ انہیں تسلی تھی کہ کسی نے دیکھا نہیں۔ بہت دور کا چکر کاٹ کر اور ایک خرگوش کا شکار کر کے دونوں دوست واپس آ گئے۔ اگلے روز انہیں خبر ملی کہ جامی شاہ کو گھوڑی نے گھسیٹ گھسیٹ کر مار ڈالا ہے۔

شکور کے گاؤں کے کئی آدمی جامی شاہ کے گاؤں جنازے میں شریک ہونے کے لئے گئے تھے اور شکور بھی چلا گیا۔ وہ صرف یہ یقین کرنا چاہتا تھا کہ جامی شاہ واقعی مارا گیا ہے۔

شکور نے ہمیں یہ راز دیا تو میں نے اسے کہا کہ ایک کام یہ کرو کہ یہ افواہ پھیلا دو کہ جامی شاہ کو جنات نے ہلاک کیا ہے کیونکہ وہ جنات اس سے باغی ہو گئے تھے۔ اس افواہ میں یہ شامل کیا جائے کہ جامی شاہ کے قبضے میں بڑے بڑے خطرناک جنات تھے ان میں سے یہ دو باغی ہو گئے اور اسے گھوڑی سے گرا کر مروایا تا کہ کسی کو شک نہ ہو کہ یہ جنات کی کارستانی ہے۔

ہم شام کو واپس آئے اور اپنے گاؤں میں شہباز خان نے اور میں نے یہ افواہ پھیلا دی کہ جامی شاہ جنات کو قید میں رکھتا تھا اور دو جن فرار ہو گئے اور اس کے اثر سے نکل گئے اور انہوں نے جامی شاہ پر انتقامی وار کیا ہے...... آپ کو حیران نہیں ہونا چاہئے کیونکہ دیہات کے لوگ اس قسم کی سنسنی خیز باتوں پر یقین رکھتے ہیں۔ ہم نے افواہ پھیلائی تو بڑے بوڑھوں نے اس کی تائید میں کئی قصے سنا دیئے جن میں جنات نے جامی شاہ جیسے

عاملوں سے انتقام لیا تھا۔

وقت گزرتا چلا گیا اور پانچ چھ سال گزر گئے۔ یہ تو بڑی لمبی باتیں ہیں کہ شکور کے ساتھ ہماری کس طرح ملاقاتیں ہوتی رہیں اور کیا کچھ ہوا، میں کچھ ضروری باتیں سناتا ہوں۔ شکور کی مطلقہ بیوی بچے کی پیدائش کے بعد چھ ساڑھے چھ سال زندہ رہ کر مرگئی۔ کہتے تھے کہ اسے سوکھا ہوا تھا۔ اسے دراصل غم کھا گیا تھا۔ شکور بھی زیادہ دیر زندہ نہ رہ سکا۔ اس نے دوسری شادی نہیں کی تھی۔ وہ بجھا بجھا سا رہنے لگا تھا اور پھر بیمار رہنے لگا اور چار سال بعد وہ بھی اللہ کو پیارا ہو گیا۔

ایک ضروری بات کہنا چاہوں گا۔ ہوسکتا ہے میری کہانی پڑھنے والے بعض حضرات یقین نہ کریں کہ شکور نے ہمیں اپنا اتنا خطرناک راز دے دیا تھا جو اسے پھانسی کے تختے تک پہنچا سکتا تھا۔ میں اس کے جواب میں یہ کہتا ہوں کہ اس وقت تو ہم بھی حیران ہوئے تھے لیکن یہ سوچا کہ ہماری دوستی ایسی تھی کہ ایک دوسرے سے کچھ چھپاتے نہیں تھے لیکن آگے عمر کے سنجیدہ حصے میں آ کر یہ راز کھلا کہ انسان کا خون کوئی انسان ہضم نہیں کرسکتا۔ آپ تھانیداروں کی کہانیوں میں پڑھتے ہوں گے کہ قاتل جب تک اپنا راز کسی کو نہ دے دے، اُسے چین نہیں آتا۔ یہ ضمیر کا ردِعمل ہوتا ہے۔ شکور نے ہم دونوں دوستوں کو یہ راز دے کر اطمینان اور سکون حاصل کیا تھا۔

وہ پگلا سا آدمی جو مجھے کھیتوں میں ملا تھا اور مجھ سے پانچ روپے مانگے تھے، یہ وہ بچہ تھا جو شادی کے آٹھویں مہینے پیدا ہو گیا تھا اور وہ جامی شاہ کا بچہ تھا۔ جسے شکور کی مطلقہ بیوی نے جنم دیا تھا۔ میں اب اس کا ماضی بیان کر کے کہانی کو طول نہیں دوں گا، یہ سمجھ لیں کہ اسے ماں کے مرنے کے بعد گھر والوں نے پالا پوسا لیکن اس کے ساتھ کوئی اچھا سلوک نہ ہوا اور وہ آوارہ ہوتا چلا گیا۔ جوان ہو کر وہ قبرستانوں کے تکیوں پر جانے لگا جہاں وہ جوا بھی کھیلتا تھا اور چرس بھی پیتا تھا اور پھر یہی اس نے اپنی زندگی بنالی۔ اس آوارگی میں وہ مجھے کھیتوں میں ملا اور میرے گاؤں کے ساتھیوں نے مجھے یاد دلایا کہ یہ کس کا بیٹا ہے اور کیسے پیدا ہوا تھا۔ میں نے اسے پانچ روپے دیئے اور وہ ہنستا ہُوا چلا گیا۔

✦ ✦ ✦

حمیت نام ہے جس کا......

طافو نے اپنی بہن کی لاش گھسیٹی اور اس آدمی کے قریب لاش کو لے گیا۔ اس نے ایک پاؤں اپنی بہن کی لاش پر اور دوسرا پاؤں اس آدمی کی لاش پر رکھا اور دونوں لاشوں پر کھڑے ہو کر دودھ کا پیالہ پیا۔

حمیت نام ہے جس کا......

معلوم نہیں کیوں میں یہ کہانی نہیں سنانا چاہتا تھا لیکن اب معلوم ہے کہ میں کیوں سنا رہا ہوں۔ یہ کہانی پڑھنے والے ضرور کہیں گے کہ یہ تو مجھے سب سے پہلے سنانی چاہئے تھی۔ یہی احساس میرا ہے لیکن جب بھی ارادہ کیا کہ یہ لکھ لوں دل پر ایسا بوجھ پڑا کہ میں برداشت نہ کر سکا۔ زندگی میں عجیب وغریب واقعات اور بڑے ہی ہیبت ناک اور دردناک حادثے اپنی آنکھوں دیکھے ہیں لیکن جتنا اثر اس واقعہ کا میرے دل پر ہے اتنا کسی اور کا نہیں ہوا۔ میں آگے چل کر بتاؤں گا کہ آج میں نے یہ کہانی کیوں سنائی ہے۔

میں نے پچھلی ایک دو کہانیوں میں ذکر کیا ہے کہ اس بڑھاپے میں گھر میں میرا استعمال کیا رہ گیا ہے۔ گاؤں میں کوئی ماتم یا شادی ہو تو مجھے بھیجا جاتا ہے۔ کسی کے ہاں بیٹا پیدا ہو یا کسی کے بیٹے کے ختنے کی تقریب ہو، مجھے بس کا کرایہ دے کر بھیج دیا جاتا ہے۔ کرایے کے علاوہ تھوڑا ٹی اے بھی دے دیتے ہیں۔ میں گاؤں جا کر سلامیاں اور مبارکیاں دیتا ہوں یا لوگوں کے جنازوں میں شریک ہوتا ہوں۔ گاؤں کی زمینیں بٹائی پر دے رکھی ہیں۔ ان کی دیکھ بھال اور جھک جھک بھی میرے ذمے ہے...... تین ساڑھے تین مہینے پہلے کا ذکر ہے کہ میں گاؤں گیا۔ گاؤں سے باہر ہی ایک شخص سے ملاقات ہوئی۔ اس کا نام سلیم ہے لیکن بچپن سے ہی بھولا کے نام سے مشہور ہوا اور اب تک بھولا ہی کہلاتا ہے۔ اس کی عمر پچاس برس سے شاید ڈیڑھ دو برس اوپر ہوگی۔

اس بھولے کے چہرے پر بشاشت اور چلنے پھرنے کے انداز میں چستی ایسی تھی کہ پچاس برس کا لگتا ہی نہیں تھا۔ تیس پینتیس برس کا جوان لگتا تھا۔ ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ رہتی تھی مگر اب اسے دیکھا تو وہ 70 برس سے اوپر کا لگا۔ کندھے کچھ آگے کو اور سر جھکا ہوا دیکھا۔ چہرے سے بشاشت غائب اور اداسی ٹپکتی دیکھی۔ اس سے پہلے وہ مجھے جب بھی ملا، بازو پھیلا کر، قہقہہ لگا کر اور پھر مجھے اپنے بازوؤں میں لے کر ملا مگر اب وہ یوں ملا جیسے اس نے مجھے پہچانا ہی نہ ہو یا وہ زندگی سے تنگ آیا ہوا ہو۔

وہ کوئی غریب اور تنگ دست آدمی نہیں۔ خاصی زیادہ زمین کا مالک ہے اور اس کے دو بیٹے انگلینڈ میں ہوتے ہیں جو ہر مہینے بہت پیسے بھیجتے اس یاس انگیز حالت میں ملا، اس کی بیٹیوں کی شادی کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ مالی لحاظ سے اسے اتنا پریشان نہیں ہونا چاہئے تھا۔ میری زبان پر آیا کہ اس سے پوچھوں، بھولے کیا بات ہے؟ لیکن اس وقت پوچھنا مناسب نہ سمجھا۔ شاید اس لئے کہ وہ جلدی میں معلوم ہوتا تھا۔ مجھے وہیں کھڑا چھوڑ کر آہستہ آہستہ چلتا آگے نکل گیا۔

دو اور آدمی میری طرف آ رہے تھے۔ انہوں نے دور سے سلام دعا لی اور ہاتھ آگے کر کے بڑی تیزی سے میری طرف آئے۔ ان سے مل ملا کر میں نے پوچھا کہ اس بھولے کو کیا ہو گیا ہے؟ یہ تو ہنستا کھیلتا آدمی ہوا کرتا تھا۔ معلوم ہوتا ہے اس کا کوئی مر گیا ہے۔

''اس کی غیرت مر گئی ہے'' ــــ ایک آدمی نے کہا ــــ ''تمہیں اس کا باپ یاد ہوگا صابو! تمہارا تو دوست تھا۔ غیرت پر اپنی جان قربان کر گیا تھا...... اور پھر اس کی ماں کو تم بھولے نہیں ہو گئے جس نے اپنی جوانی اور سہاگ اپنے خاوند کی غیرت پر قربان کر دیا تھا۔ یہ بھولا تو ان کا بیٹا لگتا ہی نہیں''۔

ہاں مجھے اس کا باپ یاد ہے۔ اسے تو میں باقی عمر بھول نہیں سکوں گا اور اس کی ماں کو بھی۔ اس کے باپ کا نام الطاف حسین تھا اور طافو کہلاتا تھا۔ وہ میرا ہم عمر تھا۔ اچھا خوبرو جوان تھا۔ یہ خاص طور پر کہنا ضروری نہیں کہ وہ بڑا غیرت مند تھا۔ اس دور میں ہر کوئی غیرت مند ہوا کرتا تھا۔ صوبہ سرحد کے قبائلی پٹھانوں کو غیور پٹھان کہا جاتا تھا جو سو فیصد صحیح ہے لیکن پوٹھوہار کا علاقہ بھی غیرت مندی میں بہت شہرت رکھتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ پٹھانوں کی طرح پوٹھوہاری بھی بعض اوقات غیرت کے نام پر احمقانہ حرکتیں کر گزرتے تھے لیکن اصل مسئلہ غیرت کا تھا۔

یہاں میں ایک واقعہ مختصراً سنا دینا ضروری سمجھتا ہوں جس سے غیرت اور حماقت کا تعلق واضح ہو جائے گا۔ ہمارے علاقے میں ایک لڑکا سرور نام کا ہوا کرتا تھا۔ بڑا ذہین اور دانشور لڑکا تھا۔ میٹرک کا امتحان دے چکا تھا۔ اس کی ایک بہن جوان اور غیر شادی شدہ تھی۔ ایک روز اپنے گھر میں داخل ہوا تو اپنی اس بہن کو اپنے سگے ماموں کے ساتھ صحن میں چارپائی پر بیٹھے دیکھا۔ وہ دونوں ہنسی مذاق کر رہے تھے۔ سگے ماموں نے اپنی سگی بھانجی کے ساتھ کون سی قابل اعتراض حرکت کرنی تھی!

سرور کو یہی بات قابل اعتراض لگی کہ ماموں اس کی جوان بہن کے ساتھ ہنسی مذاق کر رہا تھا اور غالباً ماموں کا ایک ہاتھ بھانجی کے کندھے پر تھا۔ بہر حال جو کچھ بھی تھا، سرور نے چاقو لیا اور کچھ کہے بغیر ماموں کے سینے میں چاقو گھونپ دیا۔ ماموں نے چاقو کا زخم کھا کر بھی کہا، سرور پتر کیا کر رہے ہو؟ سرور نے سینے میں ہی پھر چاقو مارا۔ ماموں نے پھر اسے بڑے پیار سے یہی الفاظ کہے لیکن سرور کا چاقو تیسری بار ماموں کے سینے میں اتر گیا۔

ماموں گرا پھر اٹھ نہ سکا۔ بہن دوڑ کر کمرے میں چلی گئی اور اندر سے دروازہ بند کر لیا۔ سرور خون آلود چاقو اٹھائے تھانے چلا گیا اور بتایا کہ وہ کیا کر آیا ہے اور کیوں کیا ہے۔ اسے گرفتار کر لیا گیا، اس نے عدالت میں بھی اقبالی بیان دیا اور آخر اسے عمر قید سنائی گئی اور ساتھ یہ کہ اسے کالا پانی یعنی جزائر انڈیمان بھیج دیا جائے۔

سرور نے عدالت میں اپنے بیان میں کہا تھا کہ میں جانتا ہوں کہ میرا ماموں کوئی غنڈہ اور بدمعاش نہیں تھا اور سگی بھانجی پر اس کی نیت خراب ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا تھا لیکن اسے یہ جاننا چاہئے تھا کہ جوان لڑکی کے ساتھ کسی مرد کا جسم نہیں لگنا چاہئے خواہ وہ اس کا سگا بھائی ہی کیوں نہ ہو۔ میں نے یہ قتل غیرت کے نام پر کیا ہے۔

سرور کو اسی نوعمری میں کالا پانی بھیج دیا گیا۔ اسے زیادہ سے زیادہ دس گیارہ سال بعد واپس آ جانا تھا لیکن 1942ء کے آغاز میں جاپانیوں نے جزائر انڈیمان پر اس قدر زیادہ بمباری کی کہ وہاں کوئی بھی انسان زندہ نہ رہا۔ تمام قیدی اور وہاں کے مقامی لوگ مارے گئے اور سرور بھی ان ہی میں تھا...... اس واقعہ پر ہر شخص کی اپنی اپنی رائے ہو گی لیکن جہاں تک غیرت کا سوال ہے، کسی کی رائے مختلف نہیں ہو سکتی۔ یہ میں اپنے دور کی بات سنا رہا ہوں۔ آج کے دور کی بات یوں ہے:

حمیت نام ہے جس کا گئی تیمور کے گھر سے

میری یہ کہانی اسی حمیت اور غیرت کی کہانی ہے جو ہمارے پاک گھر سے رخصت ہو چکی ہے...... میں نے بھولے کے باپ طافو کی بات شروع کی تھی۔ وہ خوبرو اور خوش طبع جوان تھا۔ ہماری شکار پارٹی کا ممبر تو نہیں تھا لیکن ہم عمر ہونے کی وجہ سے ہمارا اچھا خاصا دوستانہ تھا۔ ایک روز وہ ہماری شکار پارٹی میں شامل ہو گیا۔ وجہ یہ ہوئی کہ اس کا ایک ماموں فوج میں حوالدار تھا۔ ایک بار وہ چھٹی آیا تو کتے کا ایک بچہ ساتھ لایا۔ اب وہ بچہ

لڑنے جھگڑنے اور کتیوں کے ساتھ معاشقہ لڑانے اور بڑے نامی گرامی کتوں کو للکارنے کے قابل ہو گیا تھا۔ اس زمانے میں ہماری نظر میں کتا صرف کتا ہی ہوتا تھا اور ہم یہ جان لیتے تھے کہ فلاں کتا اچھی اور فلاں کمزور نسل کا ہے۔ یہ خاصی زیادہ عمر میں آ کر پتہ چلا تھا کہ یہ کتا جرمن شیفرڈ تھا۔ اس کتے نے طافو کو ہماری ٹیم میں شامل کر دیا اور ایک روز ہم شکار کو نکلے۔ ہم جب اپنے کتوں کو ٹہلائی اور سیر سپاٹے کے لئے باہر لایا کرتے تھے تو طافو بھی اپنے کتے کو لے آتا اور ہمارے کتوں میں شامل کر دیا کرتا تھا۔ اس طرح اس کا کتا ہماری ٹیم کے کتوں کے لئے اجنبی نہیں تھا لیکن جب یہ کتا ہمارے کتوں کے ساتھ شکار پر نکلا تو افضل کا بوہلی بار بار اس کی طرف جاتا اور غراتا تھا۔ اگر ہم نے کتوں کو زنجیریں نہ ڈال رکھی ہوتیں تو بوہلی طافو کے کتے پر حملہ کر دیتا۔ اپنے کتوں کی نفسیات سے ہم بڑی اچھی طرح واقف تھے۔ یہ بوہلی کتا شکاری ٹیم کا لیڈر تھا۔

کوئی نیا کتا کبھی ہم اپنی ٹیم میں شامل کرتے تو بوہلی اس کے ساتھ ٹھیک ٹھاک رہتا تھا لیکن جب اس کتے کو ٹیم کے کتوں کے ساتھ پہلی بار شکار پر لے جاتے تو بوہلی پہلا کام یہ کرتا کہ اس نئے کتے پر ٹوٹ پڑتا اور جی بھر کر اسے بھنبھوڑتا اور جھنجھوڑتا اور پھر چھوڑ کر اسے دیکھنے لگتا۔ بوہلی کا مطلب صرف یہ جتانا ہوتا تھا کہ اس ٹیم کا لیڈر یا کیپٹن میں ہوں اور تم پر میری اطاعت فرض ہے۔ وہ یہی احساس طافو کے کتے کو دلانا چاہتا تھا لیکن افضل نے بیچ بچاؤ کیا اور طافو کے کتے کو بچائے رکھا۔

اس روز ہمارے ساتھ سات یا غالباً آٹھ کتے تھے۔ ہم اس پہاڑی خطے میں جا داخل ہوئے جس کا میں کئی بار ذکر کر چکا ہوں۔ یہ پہاڑی سلسلہ جہلم اور گوجر خان کے درمیان واقع ہے۔ اس زمانے میں تو یہ بڑا ہی گھنا جنگل ہوا کرتا تھا۔ تقریباً دو سو گز دور ہمیں جنگلی بلّوں کا ایک جوڑا ایک خرگوش کے پیچھے دوڑتا دکھائی دیا۔ وہاں درخت زیادہ تھے، اونچی نیچی پتھریلی ٹیکریاں تھیں اور زمین کھڈوں والی تھی۔ کبھی ہمیں خرگوش بھاگتا نظر آتا اور کبھی غائب ہو جاتا اور پھر دونوں بلّے نظر آتے جو اس کے تعاقب میں دوڑ رہے تھے۔

آخر اس خونخوار جوڑے نے خوگوش کو اس طرح پکڑ لیا کہ ایک اس کے آگے آ گیا اور دوسرا اس کے پیچھے تھا۔ دونوں نے خرگوش کو بھنبھوڑنا اور اپنی طرف کھینچنا شروع کر دیا۔ یہی تو ہمارا شکار ہوا کرتا تھا۔ وہاں شیر چیتے اور ہرن اڑیال تو نہیں تھے۔

جنگلی بلّے کے متعلق اپنی کہانیوں میں تفصیل سے بتا چکا ہوں کہ یہ شیر جیسا خونخوار ہوتا ہے۔ عام گھریلو بلیوں سے دوگنا بلکہ تین گنا بڑا ہوتا ہے اور شکل وصورت بالکل عام بلیوں جیسی ہوتی ہے۔ انسان کو دیکھ کر بھاگ جاتا ہے لیکن خطرے کی صورت میں اس کا حملہ بڑا ہی خطرناک ہوتا ہے جو اکثر اوقات مہلک ہو جاتا ہے۔

ہمارے کُتوں نے انہیں دیکھ لیا اور ہم نے کُتوں کے پٹوں سے زنجیریں اتار دیں۔ کُتے بھونکتے غراتے دوڑ پڑے اور ہم بھی ان کے پیچھے دوڑتے گئے۔ اصل لطف تو شکار پر جھپٹنے کا ہوتا ہے۔ کُتے قریب پہنچے تو بلّوں نے انہیں دیکھ لیا۔ ایک نے مرے ہوئے خرگوش کو منہ میں لیا اور دونوں بھاگ اٹھے۔

بلّوں کو یہ سہولت حاصل ہے کہ درخت پر چڑھ سکتے ہیں۔ قریب ہی بڑ کا ایک پرانا اور گھنا درخت تھا۔ بلّے اپنے شکار کو اٹھائے ہوئے بڑ کے درخت پر چڑھ گئے اور پھر کُتے اور پھر ہم وہاں پہنچے۔

کُتے منہ اوپر اٹھائے بھونک رہے تھے اور بے تابی کا یہ عالم کہ درخت کے تنے پر اٹھ اٹھ کر پنجے مارتے تھے جیسے درخت کو جڑوں سے اکھاڑ دینا چاہتے ہوں۔ ہم کُتوں سے زیادہ بے تاب تھے۔ اپنے شکار کو درخت سے نیچے لانا تھا جو کوئی آسان کام نہیں تھا۔

ایک ہی طریقہ تھا جو ہم نے اختیار کیا۔ وہ یہ کہ پتھر اٹھا کر بلّوں پر پھینکنے لگے۔ تین لڑکوں کے پاس غلیلیں تھیں۔ وہ غلیلوں میں کنکریاں ڈال ڈال کر بلّوں کو نشانہ بنانے لگے لیکن بڑ کا یہ درخت بہت گھنا تھا۔ ٹہن زیادہ تھے اور بلّے پتوں کے پیچھے چھپ جاتے تھے۔

بلّے اوپر ہی اوپر جا رہے تھے۔ طافو نے کہا کہ وہ درخت پر چڑھ کر بلّوں کو نیچے اتارے گا۔ ہم سب نے اسے روکا اور کہا کہ بلّوں نے جہاں دیکھا کہ ان کے نکل بھاگنے کا کوئی راستہ نہیں رہ گیا تو وہ طافو پر حملہ کر دیں گے لیکن طافو بڑا ہی دلیر آدمی تھا۔ اس نے ہم میں سے کسی کی نہ سنی اور جوتے اتار کر درخت پر چڑھنے لگا۔ بڑ کے درخت پر چڑھنا کوئی مشکل نہیں ہوتا۔ ویسے بھی ہم سب کو درختوں پر چڑھنے کا اچھا خاصا تجربہ تھا۔ ایسا کوئی خطرہ نہیں تھا کہ طافو گر پڑے گا۔

سب سے بڑا خطرہ تو یہ تھا کہ اس وقت طافو ایک بچے کا باپ اور ایک نوجوان لڑکی کا خاوند تھا۔ اس کی عمر چھبیس سال کے لگ بھگ تھی۔ وہ میرا ہم عمر تھا اور میرا پہلا بچہ اس وقت ایک سال کا ہو گیا تھا۔ شادی سے پہلے تو ہم یقینی موت کے منہ میں بھی چلے جایا

کرتے تھے لیکن اب یہ احتیاط لازمی ہو گئی تھی کہ گھر میں ایک بیوی اور ایک بچہ ہے، ان کے لئے اپنے آپ کو زندہ رکھنا ضروری سمجھتے تھے لیکن طافو درخت پر چڑھ گیا تھا۔

طافو اوپر ہی اوپر چڑھتا جا رہا تھا اور ہم سب بلّوں پر پتھر پھینک رہے تھے۔ ہماری کوشش اور خواہش یہ تھی کہ بلّے درخت سے کود آئیں لیکن وہ دیکھ رہے تھے کہ نیچے اتنے سارے کُتے ان کے منتظر ہیں۔ ہمارے زیادہ تر پتھر تو ان تک پہنچتے ہی نہیں تھے۔ ٹہنوں سے ٹکراتے یا پتوں سے الجھتے اور بلّوں سے دور ہی رہتے تھے۔

بلا ہوتا ہی خطرناک جانور ہے لیکن اس وقت یہ دونوں بلّے اس لئے زیادہ خطرناک تھے کہ انہوں نے شکار مارا تھا اور انہیں یہی ایک خیال آ رہا ہو گا کہ ہم لوگ ان سے ان کا شکار چھیننا چاہتے ہیں۔ بھوکا درندہ جب شکار مار لیتا ہے تو اپنے سے بڑے درندے پر بھی جھپٹ پڑتا اور شکار کا تحفظ کرتا ہے۔

طافو بلّوں کے قریب پہنچ گیا۔ وہ ایک نیچے والے ٹہن پر تھا اور اس نے اوپر والا ٹہن پکڑ رکھا تھا۔ بلّے اس سے کچھ اونچے ٹہن پر تھے اور اس سے آگے وہ نہیں جا سکتے تھے کیونکہ آگے ٹہن ختم ہو جاتا تھا۔ طافو بازو لہرا لہرا کر اور منہ سے آوازیں نکال نکال کر بلّوں کو ڈرا رہا تھا۔ بلّوں نے اس پر غرانا شروع کر دیا تھا۔ خرگوش کو انہوں نے ٹہن پر رکھ دیا تھا۔

اچانک ایک بلا تیر کی طرح طافو پر آیا۔ اتفاق سے میں دیکھ رہا تھا اور طافو کی نظر تو تھی ہی بلّوں پر۔ مجھے وہ منظر آج بھی اچھی طرح یاد ہے۔ میں جانتا تھا کہ اب کیا ہو گا۔ میرا تو جیسے دم ہی رک گیا ہو۔ اتنے موٹے تازے خونخوار بلّے نے طافو کی شہ رگ کو منہ میں لے لینا تھا اور پنجے اس کے جسم میں گاڑ دینے تھے۔ ہم طافو کی کوئی مدد نہیں کر سکتے تھے سوائے اس کے کہ میں نے چلا کر کہا، طافو بچو۔

طافو پھرتیلا اور عقل والا جوان تھا۔ اس نے بڑی تیزی سے اوپر والا ٹہن چھوڑا اور نیچے والے ٹہن پر بیٹھ گیا۔ بلّے کے پنجے اس کی پگڑی پر پڑے اور بلا پگڑی اتارتا ہوا سیدھا نیچے آیا۔ ادھر طافو سنبھل نہ سکا اور ٹہن سے پھسل کر گرا لیکن اللہ نے اس کی یوں مدد کی کہ اس نے ایک موٹی شاخ پکڑ لی اور نیچے والے ٹہن پر پاؤں رکھ دیئے پھر بھی وہ سنبھل نہ سکا اور ایک سے دوسرے ٹہن پر گرتا اس ٹہن تک آ گیا جو زمین سے زیادہ اونچا نہیں تھا۔ وہاں سے وہ خود ہی نیچے کو کود آیا اور اس طرح وہ بڑے خطرناک حادثے سے بچ گیا۔

اس پر حملہ کرنے والا بلا نیچے گر پڑا تھا اور اٹھ کر بھاگا لیکن سات آٹھ کُتے اسے

کہاں بھاگنے دیتے تھے، سب اس کے پیچھے دوڑے اور بلا دائیں بائیں مڑتا اچانک پیچھے کو مڑا اور کُتوں کی ٹانگوں میں آ گیا۔ غالباً اس کی کوشش ایک بار پھر درخت پر چڑھنے کی تھی لیکن درخت اب اس سے دور ہو گیا تھا۔

اتنے میں مرا ہوا خرگوش اوپر سے گرا اور اس کے ساتھ ہی دوسرا بلا جو دراصل بلّی یعنی مادہ تھی، بڑی ہی تیزی سے درخت سے نیچے آئی اور اپنے شکار کی طرف دوڑی۔

خرگوش کے گرنے سے دو تین کُتے اس کی طرف چلے گئے۔ بلّی نے ایک کُتے کے منہ پر پنجے مارے اور مقابلے پر اتر آئی۔ ادھر بلا دوسرے کُتوں کے نرغے میں آیا ہوا مقابلے میں ڈٹ گیا تھا۔ میں حیران ہوں کہ وہ کس طرح کُتوں پر ٹوٹ ٹوٹ پڑتا تھا۔ کُتے آخر اس سے بڑے بھی تھے اور تعداد میں بھی زیادہ تھے اس لئے انہوں نے دونوں بلّوں کو مار لیا لیکن دونوں بلّوں نے تین کُتوں کو بری طرح زخمی کر دیا تھا۔ ہمارے ایک دوست کے کُتے کی تو اس نے ایک آنکھ ہی نکال ڈالی تھی اور وہ کتا چیختا چلاتا اِدھر اُدھر دوڑتا پھر رہا تھا۔

ہمیں تو شکار کا لطف آ گیا لیکن تین زخمی کُتوں کی حالت دیکھی تو شکار وہیں پر ختم کر دیا اور زخمی کُتوں کو جو فسٹ ایڈ دے سکتے تھے وہ دینی شروع کر دی۔ پھر لڑکے گھروں سے جو جو کچھ کھانے کے لئے لائے تھے وہ اکٹھے بیٹھ کر بغیر ہاتھ دھوئے کھایا اور واپس چل پڑے۔

طافو سے سب نے پوچھا اور پھر اس کے جسم کا معائنہ بھی کیا کہ کہیں چوٹ آئی ہو گی۔ عجیب بات تھی کہ اسے کہیں بھی اور ذرا سی بھی چوٹ نہیں آئی تھی۔ ہم جب واپس آ رہے تھے تو طافو میرے ساتھ ہو گیا اور دھیمی آواز کہنے لگا کہ صابو، معلوم نہیں کیا بات ہے دل پر کچھ بوجھ سا پڑا ہوا...... ہم اس عمر میں اتنی ڈاکٹری نہیں جانتے تھے لیکن خیال آیا کہ ایک ٹہن سے دوسرے ٹہن پر گرنے اور پھر وہاں سے زمین پر کودنے کی وجہ سے طافو کے دل پر اثر ہوا ہو گا۔ ہو سکتا ہے اسے شدید دھچکا لگا ہو۔ یہ تو مجھے تجربہ تھا کہ بلندی سے پاؤں کے بل زمین پر کودو تو دھمک دماغ تک پہنچتی ہے۔ بہر حال میں نے طافو کو یہی وجہ بتائی اور تسلی دی کہ وہ ٹھیک ہو جائے گا لیکن اس نے کہا کہ اس نے جھٹکے کا کوئی اثر محسوس نہیں کیا۔

ہم دونوں دوسرے لڑکوں سے الگ تھلگ ہو کر چلے جا رہے تھے۔ آج یاد آتا ہے

کہ یہ طافو کی کوشش تھی کہ میں اس کے ساتھ رہوں اور باتیں کرتے چلیں۔ اس نے کچھ اور آگے جا کر اپنے سینے پر ہاتھ پھیرا اور پھر کہا کہ وہ کچھ بوجھ محسوس کر رہا ہے جو بڑھتا جا رہا ہے۔ میں نے اس سے پوچھا کہ اسے کچھ سوچیں آ رہی ہیں یا وہ کوئی جسمانی خرابی محسوس کر رہا ہے۔

طافو صرف چھ جماعتیں پڑھا تھا۔ اس کے پاس الفاظ کا اتنا ذخیرہ نہیں تھا کہ اپنی یہ کیفیت بیان کر سکتا۔ بہت سوچ سوچ کر اس نے کہا ایسا لگتا ہے جیسے کوئی ایسی بات ہونے والی ہے جسے نہیں ہونا چاہئے یا کوئی حادثہ ہونے کو آ رہا ہے۔ پھر اس نے یوں کہا کہ ایسے بھی لگتا ہے جیسے کسی نے اس پر کچھ عمل کر دیا ہو۔

ہمارے علاقے میں کالے جادو اور الٹے تعویذوں کا سلسلہ چلتا ہی رہتا تھا اور آج بھی جاری ہے۔ اگر کسی پر کچھ بھی نہ کیا گیا ہو اور وہ کسی عامل یا شاہ جی کے پاس جا کر طافو جیسی کیفیت کا اظہار کرے تو جناب عامل صاحب اور شاہ صاحب یہی فیصلہ سنائیں گے کہ کسی نے جادو چلا دیا ہے۔ طافو کو چونکہ کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ کیا اور کیوں محسوس کر رہا ہے اس لئے اس نے اپنی یہی تشخیص کر دی۔ طافو تو بڑا ہی زندہ دل جوان تھا۔ اس نے مجھے بھی پریشان کر دیا اور میں اسے جھوٹی سچی تسلیاں دیتا رہا۔ حقیقت یہی ہے کہ میں اس کی اس کیفیت کا اثر اپنے آپ بھی محسوس کرنے لگا اور ہلکا ہلکا سا خوف میرے دل پر بیٹھ گیا۔

ہم گاؤں میں داخل ہوئے تو شام کے چار بجنے والے تھے۔ یہ میں آج کہہ رہا ہوں کہ چار بج رہے تھے، اس دور میں ہم گھڑیوں کے مطابق وقت نہیں بتایا کرتے تھے۔ ہم جب شکار سے واپس آیا کرتے تھے تو گاؤں کے لوگ ہمیں دیکھ کر ایک تو خوش ہوتے اور پھر دور سے ہی کچھ نہ کچھ پوچھنا شروع کر دیتے تھے۔ مختصر یہ کہ ہمارا استقبال شور وغل سے ہوتا تھا لیکن اس روز میں نے دیکھا کہ سب خاموش تھے اور کسی کے منہ سے کوئی بات یا آواز نہیں نکل رہی تھی۔

میں نے یہ بھی دیکھا کہ زیادہ تر لوگ طافو کی طرف دیکھ رہے تھے۔ صاف پتہ چل رہا تھا کہ گاؤں میں کوئی خاص واقعہ ہو گیا ہے۔ میری ٹیم کے دو تین لڑکوں نے قریب آ کر پوچھا، گاؤں میں کیا ہو گیا ہے؟ ہم لوگوں کے قریب سے گزرے تو بھی کوئی نہ بولا۔ میرے والد بھی تین چار آدمیوں کے ساتھ الگ کھڑے ہمیں دیکھ رہے تھے۔ میں ان کے پاس جا رکا اور پوچھا کہ یہ سب چپ چپ کیوں ہیں؟

"طافو کی بہن نکل گئی ہے" — میرے والد نے سرگوشی میں مجھے بتایا۔

میں نے طافو کی طرف دیکھا۔ شاید اسے بھی کسی نے یہ اطلاع دے دی تھی۔ وہ بہت ہی تیز قدم اٹھاتا اپنے گھر کی طرف جا رہا تھا۔ گاؤں کی ایک جوان لڑکی کا گھر سے نکل جانا کوئی معمولی واقعہ نہ تھا۔ میرے شکاری دوستوں کو پتہ چلا تو سب پر وہی خاموشی طاری ہوگئی جو سارے گاؤں پر طاری تھی۔

طافو سے دو سال چھوٹی ایک بہن تھی جس کی ابھی شادی نہیں ہوئی تھی۔ بڑی خوبصورت لڑکی تھی۔ کردار، اخلاق اور چال چلن کے لحاظ سے طافو کا گھرانہ بالکل ٹھیک ٹھاک اور عزت دار تھا۔ اس کی بہن کے خلاف کبھی ایسی بات نہیں سنی گئی تھی کہ وہ کسی کو چاہتی یا پسند کرتی ہے۔ میں یہ بھی بتا دوں کہ اس دور میں بھی بدکار عورتیں پائی جاتی تھیں لیکن بہت ہی کم اور ایسی عورت کو سب جانتے تھے کہ یہ بدچلن عورت ہے۔ البتہ محبت کے متعلق کوئی قسم نہیں کھائی جا سکتی۔ کسی لڑکے لڑکی میں محبت ہو جاتی تھی اور ان کی چوری چھپے کی ملاقاتیں بھی ہوتی تھیں لیکن وہ ان ملاقاتوں کو بدکاری کی حد تک نہیں جانے دیتے تھے۔ کبھی ایسا بھی ہو جاتا تھا کہ کوئی لڑکی کسی لڑکے کے ساتھ گھر سے بھاگ جاتی تھی۔ شاید ہی کوئی قسمت والا جوڑا ہوگا جو غائب ہو گیا ہو ورنہ کہیں نہ کہیں وہ پکڑے جاتے اور گاؤں والے انہیں سزائے موت دیتے تھے۔ پھر دو خاندانوں کی ایسی عداوت شروع ہو جاتی تھی جو نسل بعد نسل چلتی تھی۔

اب جب معلوم ہوا کہ طافو کی بہن گھر سے چلی گئی ہے تو مجھے طافو کے دل کے بوجھ کا خیال آیا جو اس نے اچانک محسوس کیا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ لگتا ہے کوئی ایسی بات ہونے والی ہے جسے نہیں ہونا چاہئے۔ یہ شاید اپنے خون اور غیرت کا اثر تھا جو طافو نے محسوس کیا تھا۔ شام کے وقت میں، راجہ شہباز خان اور افضل طافو کے گھر چلے گئے اور اس سے پوچھا کہ یہ کیا واقعہ ہوا ہے۔ اس نے صاف بتا دیا کہ اس کی بہن چلی گئی ہے اور جس کے ساتھ گئی ہے وہ بھی معلوم ہو گیا ہے۔ یہ ایسی بات تو نہیں تھی کہ ہم طافو سے یہ کہتے کہ چلو یار، برداشت کرو، اللہ کو ایسے ہی منظور تھا۔ ہم نے طافو کو نہ صبر کی تلقین کی نہ کوئی اور مشورہ دیا۔ طافو کا سر ذرا جھکا ہوا تھا۔ اس نے سر اٹھایا اور ہم تینوں کو دیکھ کر کہا — "آ جائے گی..... آ جائے گی"۔

"طافو بھائی!" — افضل نے کہا — "ہم تمہیں کچھ بھی نہیں کہتے کہ کیا کرو اور کیا

نہ کرنا، ہم صرف یہ کہنے آئے ہیں کہ ہم ہر طرح تمہارے ساتھ ہیں اور جو چلی گئی ہے وہ صرف تمہاری نہیں ہماری بھی بہن ہے۔ خون خرابہ کرنا ہے تو بھی ہم تمہارے ساتھ ہیں"۔

"دیکھو، جو اللہ کرے گا" — اس نے کہا — "تم نے میرا دل مضبوط کر دیا ہے، جہاں ضرورت پڑی تمہیں آواز دوں گا"۔

ہماری یہ پیش کش رسمی نہیں تھی۔ دوست دوستوں کے پیچھے جانیں قربان کر دیا کرتے تھے پھر یہ بات بھی تھی جو آج کل نہیں ہے کہ گاؤں کی ہر لڑکی کو ہر کوئی اپنی بیٹی سمجھا کرتا تھا۔ ایک گاؤں کی لڑکی نکل گئی یا اغوا ہو گئی تو یہ پورے گاؤں کی عزت اور غیرت کے لئے چیلنج ہوا کرتا تھا۔

طافو کی بہن اغوا نہیں ہوئی تھی نہ اسے کوئی بہلا پھسلا کر اپنے ساتھ لے گیا تھا بلکہ وہ خود گئی تھی۔ وہ آدمی دو میل دور کے ایک گاؤں کا رہنے والا تھا۔ ہوا یوں تھا کہ ہمارے گاؤں کے باہر ایک کنواں تھا جس سے سارے گاؤں کی عورتیں پانی بھرتی تھیں۔ دن کے پچھلے پہر کنوئیں پر عورتوں کا میلہ لگا ہوتا تھا۔ ایک ایک عورت دو دو گھڑے اٹھاتی تھی۔

اس روز یوں ہوا کہ طافو کی بہن کنوئیں سے پانی بھرنے گئی۔ کنوئیں پر کئی اور عورتیں بھی تھیں۔ عورتوں سے پتہ چلا کہ اس لڑکی نے گھڑے رکھے اور ایک طرف دیکھتی رہی۔ اس کی ایک دو سہیلیاں بھی وہیں تھیں۔ انہوں نے اس سے پوچھا کہ وہ کھڑی کیا دیکھ رہی ہے، پانی کیوں نہیں بھرتی؟ لیکن وہ کچھ بھی نہ بولی۔

اتنے میں لڑکیوں نے دیکھا کہ دو تین کھیت پرے ایک گھوڑ سوار نظر آیا۔ عورتیں اسے اچھی طرح پہچانتی تھیں۔ اس سوار نے ہاتھ اوپر کر کے ہلایا۔ طافو کی بہن نے اپنی سہیلیوں سے کہا کہ میں جا رہی ہوں اور میرا انتظار نہ کرنا۔ وہ دوڑ پڑی اور تمام عورتیں اسے دیکھتی رہیں۔ وہ اس سوار تک پہنچی۔ سوار نے جھک کر بازو نیچے کیا اور لڑکی کو بازو میں لے کر اوپر اٹھایا۔ اپنے آگے گھوڑے پر بٹھا لیا۔ لڑکی نے ہاتھ اوپر کیا اور بڑی خوشی اور فخر سے کنوئیں پر کھڑی عورتوں کو ہاتھ ہلا کر الوداع کیا اور سوار نے گھوڑے کو ایڑ لگا دی۔

اس میں کوئی شک نہ رہا کہ لڑکی کی اس آدمی کے ساتھ در پردہ محبت چلتی رہی تھی اور انہوں نے طے کر رکھا تھا کہ لڑکی کنوئیں پر فلاں دن اور وقت آئے گی اور وہ گھوڑے پر آ جائے۔ دونوں کی دلیری اور جرأت دیکھیں کہ اس آدمی نے بھی اپنے آپ کو نہ چھپایا نہ لڑکی نے اس کے ساتھ جانے میں کچھ حیاء محسوس کی۔ وہ شاید سب کو دکھانا چاہتے تھے کہ

محبت ہوتو ایسی ہو۔

وہ ایک جواں سال آدمی تھا۔ دومیل دور ایک گاؤں کا رہنے والا تھا۔ بڑا خوبرو اور ہر وقت اچھے لباس میں رہنے والا تھا اور کبڈی اور نیزہ بازی کا کھلاڑی تھا۔ عمر چھبیس ستائیس سال ہوگی۔ ہمارے گاؤں میں اس کے قریبی رشتہ دار رہتے تھے جن کا گھر طافو کے بالمقابل تھا۔

اس گھر کی ایک لڑکی طافو کی بہن کی سہیلی تھی۔ کسی کو معلوم نہ ہوسکا کہ طافو کی بہن اور اس آدمی کا معاشقہ کب اور کس طرح چلا اور ان کی ملاقاتیں کہاں اور کس طرح ہوتی رہیں۔ یہ آدمی اپنے رشتہ داروں کے ہاں آتا رہتا تھا اس لئے اس کے ساتھ ہم سب کی سلام دعا تھی۔ بڑا خوش طبع آدمی تھا۔ ہم یہ بھی جانتے تھے کہ اس کی شادی ہوئی تھی لیکن اس نے بیوی کو پسند نہ کیا اور ڈیڑھ دو سال بعد اسے طلاق دے دی تھی۔

گاؤں کے بزرگوں نے مل بیٹھ کر فیصلہ کیا کہ اس گاؤں جائیں گے اور اس آدمی کے اور گاؤں کے بزرگوں سے مل کر لڑکی واپس لائیں گے لیکن طافو اور اس کے باپ نے صاف الفاظ میں سب کو روک دیا اور کہا کہ لڑکی کو وہ خود لائیں گے۔

مجھے طافو کے الفاظ یاد ہیں۔ اس نے کہا تھا کہ وہ اپنی بہن کا جنازہ لائے گا۔ گاؤں کے بزرگ خاموش ہو گئے۔ انہوں نے طافو کے باپ کے ساتھ ہمدردیاں جاری رکھیں اور اسے مشورے بھی دیتے رہے لیکن ہم نے دیکھا کہ باپ اور طافو پر بھی عجیب طرح کی خاموشی طاری رہی اور دن دو گزر گئے۔

دومیل دور کوئی فاصلہ نہیں تھا۔ وہاں سے خبریں خفیہ خفیہ آتی رہیں۔ اگلے ہی روز خبر ملی کہ اس آدمی نے طافو کی بہن کے ساتھ باقاعدہ نکاح کرلیا ہے۔ اس آدمی کا اور کوئی بھائی نہیں تھا۔ باپ مر گیا تھا اور ساری زمین جائیداد کا مالک یہ اکیلا تھا۔ ماں تھی اور دو شادی یدہ بہنیں تھیں۔

تیسرے روز سورج ابھی نکلا ہی تھا کہ مجھے کسی نے باہر سے پکارا۔ میں باہر نکلا تو میرے تمام دوست باہر موجود تھے اور طافو گھر کی طرف سے آرہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں کلہاڑی تھی۔

کلہاڑی سے آپ یہ نہ سمجھیں کہ لکڑیاں چیرنے والی عام سی کلہاڑی ہوگی۔ اس زمانے میں لوگ بڑی خوبصورت کلہاڑیاں بنواتے تھے اور ان کا پھل (بلیڈ) چاندی کی

طرح چمکتا تھا اور یہ بلیڈ بڑا ہی تیز رکھا جاتا تھا۔ لوگ بڑے فخر سے کلہاڑی ساتھ رکھتے تھے۔ طافو کے پاس ایسی ہی کلہاڑی تھی۔

طافو نے ہم سب کو دیکھ کر دور سے ہی کہا۔۔۔ ’’اللہ بیلی دوستو، کہا سنا معاف کر دینا، زندہ رہا تو ملیں گے‘‘۔

طافو کی بیوی اس کے ساتھ تھی اور اس نے اپنے ہاتھ میں چینی کا ایک پیالہ اور دوسرے ہاتھ میں گڑوی اٹھا رکھی تھی۔ ہم جان گئے کہ طافو کہاں جا رہا ہے۔ ہم نے اسے روکا۔ اسے کہنا یہ چاہتے تھے کہ سوچ سمجھ کر کچھ کرے لیکن اس کی بیوی جو ابھی نوجوانی کی عمر میں تھی، ہمارے اور طافو کے درمیان آگئی۔

’’مت روکو اسے‘‘۔۔۔ طافو کی بیوی نے کہا۔۔۔ ’’اس کی غیرت کو سلاؤ نہیں۔ میں اس کے ساتھ جا رہی ہوں۔ ہمارے راستے سے ہٹ جاؤ۔ یہ ہماری عزت اور غیرت کا سوال ہے‘‘۔

اپنی بیوی کے ساتھ طافو کا خون کا کوئی رشتہ نہیں تھا لیکن وہ اس رشتے کی لاج رکھ رہی تھی کہ طافو اس کا خاوند تھا اور اس کے خاوند کی غیرت پر زد پڑی تھی۔ وہ خاوند کے ساتھ دشمنوں کے گھر جا رہی تھی۔

ہمیں جو باتیں بعد میں معلوم ہوئیں وہ میں یہیں سنا دیتا ہوں۔ ہم نے طافو اور اس کی بیوی کو راستہ دے دیا۔ طافو کی ماں بھی اور باپ بھی اس کے پیچھے آرہے تھے۔ طافو پیچھے مڑا اور باپ کے گھٹنوں کو ہاتھ لگا کر اس سے مصافحہ کیا اور باپ نے اسے گلے لگایا۔ پھر طافو نے ماں کے پاؤں اور گھٹنے چھوئے اور اس سے پیار کر کے چل پڑا۔ اس کی بیوی بھی اس کے ماں باپ سے اسی طرح رخصت ہوئی ہم دونوں کو جاتے دیکھتے رہے۔

انہوں نے پروگرام یہ بنایا تھا کہ طافو اس آدمی کے گھر جائے گا جو اس کی بہن کو لے گیا تھا اور اسے للکارنے لگا۔ اگر طافو نے اسے قتل کرلیا تو طافو کی بیوی پیالے میں دودھ ڈال کر طافو کو دے گی جو طافو اس آدمی کی لاش پر بیٹھ کر پیئے گا۔ تب ہم سمجھے کہ بیوی کے ہاتھ میں چینی کا پیالہ تھا جس میں طافو نے دودھ پینا تھا۔

اس آدمی کے گھر میں جو واقعہ ہوا وہ بعد میں ہمیں معلوم ہوا۔ وہاں یوں ہوا کہ طافو اس آدمی کے گھر میں چلا گیا۔ دیہات میں گھر بہت ہی کشادہ اور صحن تو اور ہی زیادہ کشادہ ہوتے ہیں۔ طافو نے صحن میں کھڑے ہو کر اس آدمی کو للکارا۔ گھر میں اس آدمی کی ماں تھی

جو طافو کو دیکھ کر دوڑی آئی اور اس کی منتیں کرنے لگی۔ فوراً بعد وہ آدمی اندر سے نکلا۔ اس کے پیچھے طافو کی بہن نکلی۔

طافو نے اس آدمی سے کہا کہ میرے پاس کلہاڑی ہے۔ تم بھی کلہاڑی لے کر میرے قریب آؤ۔ پہلا وار تم کرو گے۔

اس آدمی نے ابھی کوئی جواب نہیں دیا تھا کہ طافو کی بہن دوڑی آئی اور بازو پھیلا کر طافو کے گلے لگنا چاہتی تھی۔ وہ طافو کو میرا ویر، میرا ویر کہتی آئی۔ طافو نے کلہاڑی گھما کر پوری طاقت سے اپنی بہن کو ماری۔ کلہاڑی کا آدھا پھل اس لڑکی کی کھوپڑی میں اتر گیا۔ لڑکی گری تو طافو نے دوسرا وار اس کی گردن پر کیا اور اس طرح اپنی بہن کو ختم کر دیا۔

اس آدمی کی ماں دوڑی باہر گئی اور چیخنے چلانے لگی لیکن کوئی بھی اندر آنے کی جرأت نہیں کر رہا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ سب جانتے تھے کہ طافو کی بہن گھر سے نکل آئی ہے اور طافو کو حق پہنچتا ہے کہ وہ بہن کو پیار اور محبت سے لے جائے یا اس پورے خاندان کو قتل کرے یا ان کے ہاتھوں خود قتل ہو جائے۔ مطلب یہ کہ گاؤں والے جانتے تھے کہ طافو جو کچھ کر رہا ہے یہ دیہات کے دستور کے عین مطابق ہے۔

وہ آدمی پہلے تو شاید لڑنے کے موڈ میں نہیں تھا۔ اس نے جب دیکھا کہ طافو نے اپنی بہن کو قتل کر ڈالا ہے تو وہ بھی اندر سے کلہاڑی لے آیا۔ طافو نے کہا کہ پہلا وار تم کرلو تاکہ تمہیں افسوس نہ رہے کہ میں نے تمہیں وار کرنے کی مہلت نہیں دی تھی۔

وہاں جو لوگ کھلے دروازے میں سے دیکھ رہے تھے ان کی زبانی پتہ چلا کہ اس آدمی نے پہلا وار کیا جو طافو بڑی پھرتی سے بچا گیا اور اس آدمی کی کلہاڑی کا پھل زمین پر پڑا یعنی وہ آدمی جھک گیا۔ طافو نے اس کے سر پر کلہاڑی نہ ماری کیونکہ اس نے سر پر پگڑی باندھ رکھی تھی جس نے کلہاڑی کا پھل روک لینا تھا۔ اس کی بجائے طافو نے بڑی پھرتی سے اس آدمی کی گردن پر ایک طرف بڑی زور سے کلہاڑی ماری اور وہ آدمی سیدھا ہو کر پیچھے ہٹا تو طافو نے گردن پر ہی دوسرا وار کیا۔ وہ آدمی گر پڑا۔ طافو نے تیسری بار اس کی گردن پر ہی کلہاڑی ماری اور گردن صاف کٹ گئی۔

طافو کی بیوی قریب کھڑی لڑائی دیکھ رہی تھی۔ طافو نے اپنی بہن کی لاش گھسیٹی اور اس آدمی کے قریب لاش کو لے گیا۔ اس نے ایک پاؤں اپنی بہن کی لاش پر اور دوسرا پاؤں اس آدمی کی لاش پر رکھا اور اور دونوں لاشوں پر کھڑے ہو کر بیوی سے کہا دودھ کا

پیالہ دے دو۔

بیوی نے گڑوی میں سے دودھ پیالا میں ڈال اور طافو کو دیا۔ طافو نے پورا پیالہ پی لیا۔ بیوی نے بڑی زور سے طافو کو خراج تحسین پیش کیا۔ جس طرح دیہات کی عورتیں کیا کرتی ہیں۔

میاں بیوی باہر نکلے اور طافو نے باہر کھڑے لوگوں سے کہا کہ وہ بھاگے گا نہیں، تھانے جا رہا ہے۔ اس نے کیا بھی یہی کہ وہیں سے کلہاڑی سمیت تھانے چلا گیا اور وہاں بتایا کہ وہ کیا کر آیا ہے۔ تھانیدار نے اسے گرفتار کر لیا اور اس کی بیوی کو گھر بھیج دیا۔ اس زمانے میں مک مکا کے نام سے بھی کوئی واقف نہیں تھا ورنہ تھانیدار سودا کر کے اس کے بچنے کا راستہ نکال لیتا۔ طافو سزا سے بچنے کے لئے تھانے نہیں گیا تھا۔ وہ بچ سکتا ہی نہیں تھا۔ اس نے بہت سے لوگوں کے سامنے دو قتل کئے تھے۔

ہم سب اپنے گاؤں میں گھروں سے باہر ایک جگہ کھڑے طافو اور اس کی بیوی کا یا کسی سنسنی خیز خبر کا انتظار کر رہے تھے۔ تین گھنٹے گزر گئے اور دور سے ہمیں طافو کی بیوی آتی نظر آئی۔ وہ اس گاؤں کی طرف سے آ رہی تھی جس گاؤں میں تھانہ تھا۔ طافو کی ماں، بڑی بہن اور اس کا باپ طافو کی بیوی کی طرف دوڑ پڑے۔ ہم سب بھی اس طرف گئے۔ اس کی بیوی کی آنکھوں میں آنسوؤں کا نشان تک نہ تھا۔ اس نے بتایا کہ وہاں کیا ہوا ہے اور طافو اس وقت تھانے میں ہے۔

ہم سب گاؤں میں آئے تو سارا گاؤں اکٹھا ہو گیا۔ مجھے آج تک طافو کی بیوی کا مردانہ انداز اور اس کے یہ الفاظ اس طرح یاد ہیں جیسے اب بھی وہ میرے سامنے کھڑی کہہ رہی ہے___ ”سنو لوگو! اگر طافو پھانسی چڑھ گیا تو ساری عمر شادی نہیں کروں گی، اسی گھر میں عمر گزار دوں گی اور اس بچے کو پالوں گی“۔

اس وقت یہ بچہ دو اڑھائی سال کا تھا جس کا نام سلیم تھا اور اسے بچپن سے ہی بھولا کہتے تھے۔ اب وہی سلیم پچاس برس سے اوپر عمر کا ہو گیا اور سر جھکائے پھرتا تھا اور ایک آدمی نے کہا تھا کہ اس کی غیرت مر گئی ہے۔

ہم سب دوست طافو کو دیکھنے تھانے گئے تھے۔ تھانیدار نے ہمیں اس سے ملنے کی اجازت دے دی تھی۔ یہاں تک کہ اسے حوالات سے نکال کر اپنے کمرے میں بٹھایا اور ہمیں بھی اس کمرے میں بٹھا دیا۔ طافو خوش تھا۔ یہ خوشی کچھ اور قسم کی ہوتی ہے جو سیدھی

موت تک لے جاتی ہے۔ طافو نے سزائے موت کو قبول کر رکھا تھا۔ تھانیدار کہتا تھا کہ وکیل لائق ہو تو طافو کو بری بھی کروا سکتا ہے نہیں تو عمر قید ہی دلوا سکے گا۔ مطلب یہ کہ طافو پھانسی سے بچ سکتا ہے۔

''نہیں جی!''___ طافو نے بڑے خوشگوار لہجے میں کہا___ ''اس زندگی سے مر جانا ہی اچھا ہے۔ میں بری ہو کر آ گیا تو لوگوں کی انگلیاں مجھ پر اٹھیں گی اور لوگ کہیں گے کہ اس کی بہن دن دیہاڑے ایک آدمی کے ساتھ نکل گئی تھی اور یہ زندہ سلامت پھر رہا ہے۔ پھانسی چڑھ جاؤں گا تو لوگ یہ تو کہیں گے کہ یہاں ایک غیرت مند دفن ہے جس نے اپنی عزت پر دشمن کو للکارا اور لوگوں کے سامنے قتل کیا تھا''۔

پھر وہی ہوا جو طافو چاہتا تھا۔ کیس عدالت میں گیا اور وکیل کے منع کرنے کے باوجود اس نے عدالت میں جاتے ہی کہہ دیا کہ وہ قاتل ہے اور اس نے اس وجہ سے اور اس طرح اپنی بہن کو اور اس کے یار کو قتل کیا ہے۔ کیس سیشن کورٹ میں گیا اور تین مہینوں کے بعد سزائے موت سنا دی گئی۔ اپیل صرف اس لئے کی گئی کہ یہ طافو کا حق تھا۔ اپیل ہائی کورٹ نے نامنظور کر کے سزائے موت بحال رکھی۔

یہ مقدمہ راولپنڈی سیشن کورٹ میں چل رہا تھا۔ تین پیشیوں پر ہم تین چار دوست راولپنڈی گئے اور طافو سے ملے تھے۔ اس کے انداز اور رویے سے پتہ ہی نہیں چلتا تھا کہ اس کے خلاف دہرے قتل کا مقدمہ چل رہا ہے اور اسے سزائے موت ہو جائے گی۔ وہ خوش تھا کہ اس نے وہ فرض ادا کیا ہے جو غیرت نے اس کے سپرد کر رکھا تھا۔ اس نے کبھی ایسی بات نہیں کہی تھی کہ دوستو، دعا کرنا میں بری ہو جاؤں۔ اس نے بری ہونے کی امید دل میں رکھی ہی نہیں تھی۔

جب ہائیکورٹ سے اپیل نامنظور ہو گئی تو پھانسی کا دن مقررہ ہو گیا۔ ہم پانچ دوست طافو کے دوسرے رشتہ داروں کے ساتھ طافو سے آخری ملاقات کے لئے گئے تھے۔ پھانسی کی کوٹھڑی میں بھی ہم نے اسے خوش دیکھا۔

ہم سے وہ منظر برداشت نہیں ہوتا تھا جب طافو کا بچہ اپنے باپ کو سلاخوں کے پیچھے کھڑا دیکھتا تھا۔ کبھی تو بچہ حیرت سے باپ کو دیکھنے لگتا اور کبھی سلاخیں پکڑ کر رونے لگتا اور باپ سے کہتا کہ وہ باہر آ جائے یا اسے اندر لے جائے اور اٹھا لے۔ اس وقت ہم نے طافو کی آنکھوں میں آنسو دیکھے۔

طافو نے اپنی بیوی سے کہا کہ تم ابھی جوان ہو اور اپنی زندگی برباد نہ کرنا، دوسری شادی کر لینا لیکن میرے اس بچے کو اسی طرح غیرت مند بنانا جس طرح میں تھا اور اس کا دادا ہے۔

''ایسی بات زبان پر نہ لا طافو!''___ بیوی نے پُرعزم آواز میں کہا___ ''اللہ کا نام لے کر تیرے نام پر انگوٹھا لگایا تھا۔ جب تک زندہ ہو تمہیں ہی اپنا خاوند سمجھتی رہوں گی اور اس بچے کے لئے اکیلی زندہ رہوں گی۔ اپنے اس بیٹے کو تو دیکھے گا تو تیری روح خوش ہو جایا کرے گی''۔

ہم دو دوست طافو کی ملاقات کے لئے گئے تھے، سب جوانی کی عمر میں تھے۔ ہم کبھی روئے نہیں تھے بلکہ ہم مغموم ہونا بھی نہیں جانتے تھے لیکن میاں بیوی کے یہ مکالمے سنے تو آنکھیں بھر آئیں۔ میں اپنی بتاتا ہوں کہ بہت صبر کیا لیکن میری سسکیاں نکل گئیں اور میرے دوستوں کا بھی یہی حال ہوا۔

''کیا کر رہے ہو یارو!''___ طافو نے ہمیں ڈانٹ کر کہا___ ''تم تو میرا حوصلہ اور دل توڑ رہے ہو۔ مجھے ہنسی خوشی دنیا سے رخصت کرو۔ میں نے چوری اور ڈاکے کی واردات کرتے ہوئے تو کسی کو قتل نہیں کیا۔ میں خدا کے حضور بڑے صاف اور شفاف دل سے جا رہا ہوں''۔

طافو نے آخری وصیت یہ کی کہ پھانسی کے بعد جب اس کی لاش گاؤں لے جائی جائے گی تو لاش اس کے مقتول کے گاؤں کے قریب سے نہ گزارنا، دور کا چکر کاٹ کر اپنے گاؤں پہنچنا...... راستہ ایسا تھا کہ پہلے مقتول کا گاؤں آتا تھا اور راستہ گاؤں کے بالکل ساتھ سے گزرتا تھا۔ طافو اس میں اپنی توہین سمجھتا تھا کہ اس کی لاش اس گاؤں کے قریب سے گزاری جائے جس گاؤں میں اس کی بہن گھر سے بھاگ گئی تھی۔

ایک اور بات بھی سنانے کے قابل ہے۔ طافو نے اپنی بہن کو بھی قتل کر دیا تھا۔ وہ جس آدمی کے پیچھے چلی گئی تھی اس آدمی کی ماں نے اپنے ایک نوکر کو طافو کے گھر بھیجا تھا کہ اپنی بیٹی کی لاش لے جائیں اور اگر چاہیں تو وہ لوگ لاش بھیج دیں گے۔ طافو کے باپ نے بڑی ہی توہین والا جواب دیا تھا۔ اس نے یہ بھی کہا تھا کہ جو آدمی اس کی بیٹی کی لاش لے کر میرے گھر آئیں گے ان سب کی لاشیں اسی ایک چارپائی پر ڈال کر واپس بھیجی جائیں گی۔ اس طرح ان لوگوں نے طافو کی بہن کو بھی اپنے آدمی کے ساتھ دفن کر دیا تھا۔

آخری ملاقات کے سات دن بعد طافو کی لاش گاؤں میں آگئی۔ گاؤں کا بچہ بچہ جنازے میں شریک تھا اور ہر کسی کی زبان پر یہی ایک بات تھی کہ غیرت ہو تو ایسی ہو۔

طافو تو قبر میں اتر کر دنیا کے جھنجھٹ سے آزاد ہو گیا اور پیچھے اس کی بیوی بڑی صبر آزما آزمائش میں پڑ گئی لیکن وہ اپنے باپ کے ہاں نہ گئی اور طافو کے ماں باپ کو ہی اپنے ماں باپ سمجھ کر وہیں رہی اور ایسی خوبصورت اور ایسی جوان لڑکی کا خاوند کے بغیر وقت گزارنا کوئی معمولی مسئلہ نہیں تھا۔ میں جانتا ہوں کہ بعض لوگ اسے چوری چھپے بھی دیکھا کرتے تھے کہ اس نے اپنی تسکین کا کوئی نہ کوئی ذریعہ بنا لیا ہو گا لیکن حقیقت حال جاننے والے قسم بھی کھاتے تھے کہ طافو کی بیوہ ہر لحاظ سے ایمان دار اور غیرت مند ہے۔ کچھ باتیں ایسی ہیں جو میں سنانا چاہتا تھا لیکن یہ ذرا لمبی باتیں ہیں۔ مختصر یہ کہ اس لڑکی نے اپنے دل پر پتھر رکھ لیا اور اپنے جذبات کچل ڈالے یا یوں کہیں کہ اپنی زندگی اپنے بیٹے پر مرکوز کر دی۔

پاکستان وجود میں آچکا تھا۔ طافو کا بیٹا بھولا بڑا ہونے لگا اور جب اس کا چہرہ نکھر کر سامنے آیا تو یہ طافو کے چہرے سے ملتا جلتا تھا۔ دادا دادی اور ماں نے بھولے کو شہزادہ بنا کر پالا پوسا۔ اسے سکول داخل کرایا اور اس نے میٹرک پاس کر لی۔ عجیب بات ہے کہ اتنے لاڈ اور پیار سے پالا ہوا بچہ بگڑا نہیں۔ گاؤں کے لوگ اس کے ساتھ پیار کرتے تھے اور ہم جو طافو کے دوست تھے، اس کے بیٹے کو تو بہت ہی اچھا سمجھتے اور اپنے ساتھ لگائے رکھتے۔ اس کی ماں اسے باقاعدگی سے باپ کی قبر پر لے جایا کرتی تھی جس طرح کوئی کسی پیرومرشد کے مزار پر جاتا ہے۔

بھولے نے میٹرک پاس کر لی تھی لیکن اس لئے نہیں کہ وہ کہیں نوکری کرے گا۔ اسے نوکری کی ضرورت نہیں تھی۔ اس کی زمین خاصی زیادہ تھی۔ جب بھولے نے دس جماعتیں پاس کر لیں اس وقت ٹرانسسٹر دیہات میں بھی پہنچ گئے تھے۔ ان کے ذریعے فلمی گانے بھی دیہات میں پہنچے لوگ اپنے روایتی گیتوں کو بھول گئے۔ ہمارے علاقے میں جو پگڈنڈیاں تھیں وہ سڑکیں بننے لگیں اور بسیں اور ویگنیں دیہات میں دور دور تک جانے لگیں۔ اس سے یہ ہوا کہ لوگوں نے پیدل چلنا چھوڑ دیا اور دیہاتیوں کا رشتہ شہروں کے ساتھ بہت قریبی ہو گیا۔ اس سے ہمارے نوجوانوں نے یہ فائدہ اٹھایا کہ صبح گھر سے نکلتے اور رات کو راولپنڈی یا جہلم سے سینما ہال میں فلم دیکھ کر آجاتے۔

مختصر بات یہ ہے کہ پاکستان کے کلچر کی اور دیہاتی معاشرے کی اقدار کی تباہی کا عمل شروع ہو گیا۔ لوگوں کے خیالات اور انداز بدلنے لگے۔ تفصیل سے بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ آپ سب دیکھ رہے ہیں کہ ہم کیا تھے اور کیا بن گئے ہیں اور یہ انقلاب کس طرح آیا ہے۔

ان ہی دنوں باہر کے ملکوں کی نوکریوں کے دروازے کھل گئے اور لوگوں کا رخ سمندر پار کی طرف ہو گیا۔ ہر کسی کی یہ کوشش کہ اس کا بیٹا کسی عربی ملک میں یا انگلینڈ چلا جائے۔ ہمارے علاقے کے کئی نوجوان دوسرے ملکوں میں چلے گئے۔

بھولے کی شادی بڑی دھوم دھام سے ہوئی۔ بارات تین میل دور ایک گاؤں میں گئی تھی اور ہم سب بارات میں شامل تھے۔ اس روز بھولے کی ماں کی خوشی دیکھنے والی تھی۔

پھر ہمارے گاؤں میں بجلی آگئی اور اس کے ساتھ ہی ٹی وی بھی آگیا۔ رہی کسر بھی پوری ہو گئی۔ میں نے اپنے گاؤں کی ابھرتی ہوئی نسل کو دیکھا۔ وہ ہم سے بالکل ہی مختلف تھی۔ یہ بچے ہمیں پلے ہی نہیں باندھتے تھے اور ہمیں جاہلؔ اور پسماندہ سمجھتے تھے۔ یہ تو خوشی کی بات تھی کہ گاؤں میں تعلیم آگئی تھی اور اب ایسا نہیں ہوتا تھا کہ بچوں کو اعلیٰ تعلیم وہی دلا سکتا جس کے پاس پیسے ہوتے۔ مڈل اور ہائی سکول قریب ہو گئے تھے اور ٹرانسپورٹ نے تعلیم والا مسئلہ اور زیادہ سہل کر دیا تھا، لیکن اس تعلیم کا اثر الٹا ہی ہوا۔ اب ماں باپ اپنی اولاد کو نہیں بلکہ اولاد ماں باپ کو سمجھانے بجھانے لگی کہ زندگی کیسے بسر کرنی چاہئے۔

میرا خیال ہے کہ میں اپنی کہانی کو طافو مرحوم کے بیٹے تک ہی محدود رکھوں ورنہ کہانی ایک مضمون بن جائے گی اور پڑھنے والے اس میں بوریت محسوس کریں گے۔

ہمارے دیہاتی علاقے کے بہت سے نوجوان انگلینڈ اور عربی ممالک میں چل گئے تھے اور جا رہے تھے۔ وہاں سے وہ جو روپیہ پیسہ بھیجتے تھے، اس نے بھی ہمارے کلچر کو بہت مجروح کیا۔ بعض لوگوں کو پتہ ہی نہیں چلتا تھا کہ اتنا پیسہ کہاں خرچ کریں اور اس کا کیا بنائیں۔ کچھ گھروں نے شومارنی شروع کر دی اور ان میں تکبر اور غرور آگیا۔ اس سے بھائی چارے اور بھائی بندی والا کلچر تباہ ہو کر رہ گیا۔

بھولے کو اللہ نے دو بیٹے اور دو بیٹیاں دیں۔ بھولا اس قدر خوش رہتا تھا کہ اسے پتہ ہی نہ چلا کہ وہ جوانی میں سے نکل کر بڑھاپے میں داخل ہو گیا ہے اور اس کی اولاد جوان

ہوگئی ہے۔اس کے دو قریبی رشتہ دار انگلینڈ میں نوکریاں کر رہے تھے۔ان کی رہنمائی سے اور کوششوں سے بھولے کے دونوں بیٹے انگلینڈ چلے گئے۔ایک نے ایف اے پاس کی تھی اور دوسرے نے میٹرک۔

انہوں نے گھر پیسے بھیجنے شروع کر دیئے۔بھولے کی ماں بھی جوانی سے نکل گئی تھی اور گاؤں میں اسے قدر اور احترام کی نگاہوں سے دیکھا جاتا تھا لیکن اولاد نے اس خاندان کی قدر و قیمت اور احترام کو خاک میں ملا ڈالا۔وہ اس طرح کہ دونوں بیٹیاں آزاد خیال ہوگئیں۔گھر میں ٹی وی آ گیا تھا اور پھر وی سی آر بھی آ گیا۔نوکر کو جہلم، گوجر خان اور راولپنڈی تک بھیج کر فلمی کیسٹ منگوائے جاتے اور اس گھر میں دیکھے جاتے تھے۔

اس کے باوجود ایسی کوئی بے حیائی کی حرکت نہ ہوئی کہ لوگ ان لڑکیوں کو بد چلن کہتے لیکن وہ قابلِ تعریف بھی نہیں تھی۔یہ تو میں نے اور میری بیوی نے خاص طور پر دیکھا تھا کہ اب اس گھر سے غیرت اٹھ گئی ہے اور شرافت بھی برائے نام رہ گئی ہے۔

طافو کے والدین فوت ہو چکے تھے۔اس خاندان کا سربراہ بھولا تھا جو اپنے بیٹوں کی آمدنی دیکھ کر بہت ہی خوش ہوتا تھا۔اس نے ابھی تک محسوس نہیں کیا تھا کہ اس کے گھر میں جو نئی روشنی آ گئی ہے یہ دراصل ایک تاریکی ہے جس میں اس کی اولاد راستہ بھول گئی ہے لیکن بھولا خوش رہتا تھا اور اسی خوشی نے اسے بڑھاپے میں بھی جوان رکھا ہوا ہے۔

ایک بار اس کے دونوں بیٹے تین مہینوں کے لئے انگلینڈ سے آئے۔وہ سال میں پندرہ بیس دنوں کے لئے آیا کرتے تھے اور لوگ دیکھتے تھے کہ وہ اپنے آپ کو انگریز سمجھ رہے تھے۔گاؤں والوں کے ساتھ وہ رسمی طور پر ملتے ملاتے اور زیادہ وقت نمود و نمائش میں گزارتے تھے۔اب وہ تین مہینوں کے لئے آئے تو آتے ہی راولپنڈی گئے اور ایک کار لے آئے۔ان بھائیوں کی بہنیں تو ہر وقت کار میں ہی سوار رہتی تھیں اور بھائی انہیں سیر سپاٹا کرواتے تھے۔اس طرح بہنوں کے دماغ خراب ہو گئے۔اگر اس گھر میں کوئی دکھی تھا تو وہ طافو کی بیوی یعنی بھولے کی ماں تھی وہ زیادہ وقت گاؤں کے گھروں میں گھوم پھر کر، پرانی عورتوں سے باتیں کہہ سن کر اپنے آپ کو بہلانے کی کوشش کرتی تھی لیکن اسے ناکامی ہی ہوتی تھی۔غالباً یہی صدمہ تھا جس نے اسے وقت سے پہلے ضعیف العمر کر دیا اور ایک روز وہ اس دنیا سے ہی منہ موڑ گئی۔

اس کے انتقال کے بعد بھولے کی بڑی بیٹی کی شادی ہوئی۔وہ لوگ جہلم کے رہنے

والے ہیں جنہیں یہ لڑکی دی گئی تھی۔وہ لڑکا بھی انگلینڈ ہوتا تھا۔

میں گاؤں سے ہجرت کر گیا تھا اور راولپنڈی اپنے ایک بیٹے کے ساتھ رہ رہا تھا۔ میں جب بھی گاؤں آیا، بھولے کو خوش و خرم دیکھا اور واقعی وہ پچاس برس کی عمر میں تیس پینتیس سال کا جوان لگتا تھا لیکن اب اسے دیکھا تو وہ ستر برس کا بوڑھا لگا، چہرے پر اداسی، کندھے یوں جھکے جھکے سے جیسے ان پر بڑا ہی زیادہ وزن رکھ دیا گیا ہو۔

اس سے پہلے جب میں کبھی گاؤں جاتا تھا تو میرے وقتوں کے لوگ مجھے بتاتے تھے کہ طافو کے گھر کا حال اب کیا ہے۔میں نے کئی بار سوچا کہ بھولے کو بٹھا کو سمجھاؤں اور یاد دلاؤں کہ وہ کس غیرت مند باپ کا بیٹا ہے لیکن دوستوں نے بتایا تھا کہ اسے کچھ کہنا محض بے کار ہے۔اب وہ بھولا اس حال میں دیکھا تو جی میں آیا کہ اس سے پوچھوں کہ اس پر کیا مصیبت آ پڑی ہے لیکن وہ بے خبری اور غیر حاضر دماغی کی سی کیفیت میں آگے نکل گیا۔

میں نے سنایا کہ دو آدمی آ رہے تھے جو مجھے بڑے تپاک سے ملے۔ان سے پوچھا کہ اس بھولے کو کیا ہو گیا ہے تو ایک نے کہا کہ اس کی غیرت مر گئی ہے۔انہوں نے یہ خبر سنائی کہ بھولے کی بڑی بیٹی کی شادی ہو گئی تھی لیکن چھوٹی بیٹی کوئی ایک مہینہ ہوا گھر سے بھاگ گئی ہے۔

میں گاؤں میں داخل ہوا۔دن وہیں گزارا۔کئی پرانے یار دوست ملے، میرے پاس بیٹھے اور سب نے طافو کو یاد کیا اور بھولے کو بے غیرت کہا۔معلوم ہوا کہ یہ لڑکی اپنی بہن سے ملنے جہلم جایا کرتی تھی۔وہاں کسی کے ساتھ اس کی دوستی ہو گئی۔مجھے یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ اس لڑکے کے ساتھ اس لڑکی کی شادی کیوں نہیں ہو سکی تھی۔ہوا یہ کہ لڑکی ماں باپ کو بتائے بغیر گھر سے نکل گئی اور پھر یہ بھی پتہ چل گیا کہ وہ جہلم گئی ہے۔اس کی بڑی بہن نے اپنے ماں باپ کو گاؤں آ کر بتایا کہ وہ سیدھی اس لڑکے کے پاس گئی اور دوسرے دن انہوں نے نکاح پڑھوا لیا۔لوگوں کو یہ بھی شک ہے کہ اس ڈرامے میں بڑی بہن کا بھی ہاتھ ہے۔

لوگ ایک شک یہ کرتے ہیں کہ لڑکی کی ماں اس کا رشتہ اپنے بھانجے یا بھتیجے کو دینا چاہتی تھی۔وہ بڑی سخت طبیعت کی عورت ہے جو کسی کی سنتی ہی نہیں۔لڑکی نے یا دونوں بہنوں نے یہی بہتر سمجھا کہ لڑکی گھر سے نکلے اور اپنے دوست کے پاس پہنچ جائے۔

اس طرح مجھے معلوم ہوا کہ وہ کیا غم ہے جس نے بھولے کو قبل از وقت ضعیف العمر

کر دیا ہے۔ دیکھا جائے تو یہ قصور اس کا اپنا ہے۔ اللہ نے اسے بیٹوں کے ذریعے دولت دی تھی تو وہ اللہ کا شکر ادا کرتا اور اس کے ساتھ ہی اپنے بیٹوں اور بیٹیوں کو ذہن نشین کراتا کہ وہ اس دولت کے عوض خاندان کی غیرت ہاتھ سے نہیں جانے دے گا لیکن دولت کی چکا چوند نے اسے ایسا اندھا کیا کہ وہ جان ہی نہ سکا کہ غیرت کہاں کھوگئی ہے۔

میں مزید تبصرہ نہیں کروں گا۔ ایک بات کہنا چاہوں گا۔ میں نے اس کہانی کے شروع میں کہا ہے کہ میں یہ کہانی نہیں سنانا چاہتا تھا لیکن بات کچھ ایسی اپنے ذہن سے اٹھی ہے کہ یہ کہانی سنا دی ہے۔ اگر آپ یہ سمجھیں کہ میں وعظ پر اتر آیا ہوں تو میں کسی سے معافی نہیں مانگوں گا۔ غور فرمالیں یہ ایک ہی خاندان نہیں جو غیرت سے محروم ہوگیا ہے، ہمارا پورا ملک غیرت سے دست بردار ہو چکا ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ ہم امریکی یہودیوں کے غلام بن گئے ہیں۔ اپنی معاشرتی اقدار سے نظریں پھیر کر ہم مغرب کے کلچر کے دلدادہ ہو گئے ہیں۔

میں یہ کہانی غلام قادر روہیلہ کے ہاتھوں تیمور کی شکست کے حوالے سے ختم کروں گا۔ تیمور کو آپ جانتے ہوں گے۔ وہ جابر فاتح تھا۔ وہ جب اٹھا تھا تو اس نے تاریخ کا رخ پھیر ڈالا تھا اور دنیا میں تہلکہ مچا دیا تھا۔ اپنی فوج کو اور اپنی بادشاہی کو وہ بجا طور پر ناقابل تسخیر سمجھتا تھا لیکن آخر غلام قادر روہیلہ نے اسے شکست فاش دی اور تیمور شاہی کو ہمیشہ کے لئے خت کر ڈالا۔

اس نے تیمور کے محل میں قیام کیا اور تیمور کی جوان بیٹیوں کو اپنے پاس بلا کر برہنہ کرایا اور انہیں رقص کرنے پر مجبور کیا اور پھر جو بے ہودہ حرکت اس کے ذہن میں آئی وہ اس نے ان لڑکیوں کے ساتھ کی۔ پھر اس نے یوں کیا کہ وہیں سو گیا اور سونے سے پہلے اس نے اپنا خنجر اپنے پلنگ پر رکھ دیا۔ صبح وہ اٹھا اور دیکھا کہ اس کا خنجر اس کے پلنگ پر پڑا ہے۔ اس نے اسی وقت لڑکیوں کو بلایا اور تیمور کے جو آدمی اس کے ہاتھ آئے تھے انہیں بھی بلایا اور اپنے سامنے کھڑا کر لیا۔ اس نے ان سب سے کہا کہ میں سویا نہیں تھا، میں نے صرف آنکھیں بند کی تھیں اور تم لوگ سمجھے کہ میں سو گیا ہوں۔ میں نے اپنا خنجر اس لئے پلنگ پر رکھ دیا تھا کہ تم میں اگر غیرت ہوئی تو یہ خنجر اٹھا کر میرے سینے میں اتار دو گے لیکن رات بھر خنجر میرے پاس پڑا رہا اور تمہاری غیرت نہ جاگی۔

حکیم الامت علامہ اقبال نے یہ واقعہ بانگِ درا میں لکھا ہے۔ میں اس نظم کے آخری

دو شعر پیش کرتا ہوں۔

یہ مقصد تھا میرا اس سے کوئی تیمور کی بیٹی
مجھے غافل سمجھ کر مار ڈالے میرے خنجر سے
مگر یہ راز آخر کھل گیا سارے زمانے پر
حمیت نام ہے جس کا گئی تیمور کے گھر سے

پاکستان کا بھی یہ راز سارے زمانے پر کھل گیا ہے کہ حمیت اور غیرت اُس ملک سے اٹھ گئی ہے۔

+++

اللہ کا جلوہ اور جنّات

ہماری عمر کے اس حصے میں ہمارے اس عقیدے کو ہمارا ڈھیٹ پن یا ضدی پن کہا جا سکتا تھا لیکن میں جب سنجیدہ عمر میں پہنچا اور چار کتابیں بھی پڑھ لیں تو مجھے خیال آیا کہ یہ تو اللہ کا نور تھا یا ایمان کی روشنی تھی جو اس کی ذات باری نے ہماری فطرت میں ڈال دی تھی۔

اللہ کا جلوہ اور جنّات

ہر کسی کی اپنی اپنی سوچ ہوتی ہے ایسے بھی اللہ کے بندے ہیں جو اچھی بات پر بھی رنجیدہ ہو جاتے ہیں اور وہ بھی ہیں جو رنجیدہ کر دینے والی بات پر بھی مسکرا دیتے ہیں۔

یہ سوچ والی بات اس طرح میرے ذہن میں آئی ہے کہ برصغیر ابھی تقسیم نہیں ہوا تھا۔ پنڈت نہرو کی ایک سالگرہ آئی۔ ہندو لیڈر ہمارے لیڈروں جیسے نہیں جو بڑی شان و شوکت سے سالگرہ مناتے اور بڑے بڑے کیک کاٹتے ہیں۔ ہندو لیڈر مسلمانوں کی گردنیں کاٹ دیتے ہیں، اپنی سالگرہ پر کیک نہیں کاٹتے۔

پنڈت نہرو کی سالگرہ کے دن یاد نہیں وہ کون سے دو ہندو لیڈر تھے جو اسے سالگرہ مبارک کہنے گئے۔ پنڈت نہرو نے ان پر غصہ جھاڑ دیا۔ اس نے کہا کہ یہ کون سی خوشی والی بات ہے کہ عمر میں سے ایک اور سال کم ہو گیا ہے۔

بہر حال میری یہ دعا ہے کہ اللہ ''حکایت'' کی عمر میں سالوں کا اضافہ کرتا چلا جائے۔

بات سوچوں کی چل نکلی ہے تو ایک بڑا ہی پرانا واقعہ سن لیں۔ میں جو واقعہ سنانے لگا ہوں یہ ہے تو بہت پرانا لیکن لوگوں نے اسے پرانا نہیں ہونے دیا۔ آج بھی ایسے واقعات ہوتے ہیں اور لوگ اپنی اپنی سوچ کے مطابق باتیں کرتے ہیں۔

کبھی کبھی میں سوچا کرتا ہوں کہ ہمارے لڑکپن اور نوجوانی کے زمانے کی عام سی باتیں یا روز مرہ معمول کے واقعات آج کے دور میں بڑے دلچسپ اور سنسنی خیز بھی لگتے ہیں۔ کبھی تو مجھے خدشہ محسوس ہوتا ہے کہ آج کے نوجوان یہ نہ سمجھ بیٹھیں کہ میں افسانے گھڑ گھڑ کر سناتا رہتا ہوں۔ سچی بات ہے کہ اس وقت کے بعض واقعات آج مجھے بھی افسانہ ہی لگتے ہیں۔

مثال کے طور پر ٹونے ٹوٹکے، عملیات، کالا جادو اور جنات کا انسانوں میں وارد ہونا بڑی ہی پرانی بلکہ قدیم چیزیں ہیں یا انہیں آپ علوم کہہ لیں۔ سائنس نے بڑی گہری

تاریکیوں سے پردے اٹھا کر اپنا اجالا ایسا پھیلایا ہے کہ تاریکیاں چھٹ گئی ہیں لیکن ہم لوگ ابھی تک ان پرانے توہمات کی دلدل میں پھنسے ہوئے ہیں اور انہیں برحق مانتے ہیں۔ سائنس کو الگ رکھیں، اپنے دین اسلام کو سامنے رکھ کر دیکھیں تو ان پیروں اور عاملوں وغیرہ کی قلعی کھل جاتی ہے لیکن ہم اللہ کی بات بعد میں مانتے ہیں پہلے عامل کی آواز پر لبیک کہتے ہیں۔

میں وعظ نہیں کروں گا، ایک بات پر اپنی حیرت کا اظہار کرتا ہوں۔ وہ یہ کہ کہا جاتا ہے کہ عملیات، پیر پرستی اور جنات وغیرہ پر سب سے زیادہ عقیدہ دیہاتیوں میں ہے اور دیہاتی لوگ ان خرافات کو مذہب سمجھتے ہیں لیکن اندازہ کریں کہ میری نوجوانی کا دور کتنا پسماندہ ہوگا لیکن میں اور میرے تین چار دوست نہ پیروں کو مانتے تھے نہ ٹونے ٹوٹکوں پر یقین رکھتے تھے اور انسانوں میں جنات کے وُرود کے بارے میں بھی ہمارے خیالات کچھ اور تھے۔

حیرت اس پر ہے کہ ہم کوئی زیادہ تعلیم یافتہ نہیں تھے اور سمندر پار کے کسی ملک سے بھی ڈگری حاصل نہیں کی تھی پھر بھی ہم اس توہم پرستی کو نہیں مانتے تھے۔ ہم چار دوستوں کو بددعائے ہوئے کہا گیا، بے پیرا بھی کہا گیا اور پیر کی طرف سے ہمیں اس کے خاص چیلوں کے ذریعے دھمکیاں بھی ملتی تھیں۔ آپ کو شاید علم نہ ہو کہ بددعایا ہوا اور بے پیرا ایسے فتوے ہوتے ہیں جیسے کسی کو کافر کہا جائے یا کافر قرار دیا جائے۔

ہم نے عملی طور پر بھی لوگوں کو دکھا دیا تھا کہ یہ ان کے وہم ہیں لیکن لوگ ان توہمات سے دستبردار نہیں ہوتے۔ میری کہانیوں میں آپ کو ایسی ایک یا شاید دو کہانیاں ملیں گی جن میں ہم نے ان توہمات کو جھٹلایا تھا۔ مثلاً یہ بات آج بھی مانی جاتی ہے کہ جمعرات کی شام فلاں خانقاہ سے ایک دیا جلتا ہوا اٹھتا ہے اور آہستہ آہستہ اڑتا اڑتا فلاں اور فلاں خانقاہ کے دیے جلاتا اور واپس آجاتا ہے۔ ہم نے اس اڑتے ہوئے دیے کی حقیقت بھی کھول دی تھی لیکن لوگ اسے آج بھی صحیح مانتے ہیں۔

اب جو واقعہ سنانے لگا ہوں یہ مجھے اس طرح یاد آیا کہ میں ''حکایت'' میں پڑھ رہا ہوں کہ کسی کے گھر میں پتھر گرتے ہیں اور آگ لگتی ہے۔ اخباریں پڑھنے والے اکثر ایسا واقعہ پڑھتے ہی رہتے ہیں۔ کسی نہ کسی جگہ سے خبر آتی ہے کہ ایک گھر میں اچانک لٹکے ہوئے کپڑے جلنے لگتے ہیں یا کسی وقت پتھر گرنے لگتے ہیں۔ یہ کوئی نئی بات نہیں اور نئی خبر نہیں۔

ایسا واقعہ جہاں بھی ہوتا ہے وہاں سب سے پہلے اس علاقے کے پیر صاحب پہنچتے ہیں پھر جنات پر قابو پانے والے شاہ صاحب آتے ہیں اور مختلف عاملوں کو بلا کر دکھایا جاتا ہے۔ یہ سب جانتے ہیں کہ اصل میں کیا ہو رہا ہے لیکن کہتے ہیں کہ یہ جنات کی کارستانی ہے اور جنات کسی وجہ سے اس گھر کے کسی آدمی کو یا سب کو سزا دے رہے ہیں۔ ٹریجیڈی یہ ہے کہ تعلیم یافتہ لوگ بھی بات یہیں پر ختم کر دیتے ہیں کہ یہ جنات کر رہے ہیں۔

میں ایک عرصے سے سوچ رہا تھا کہ یہ واقعہ سنا دوں لیکن کچھ ایسی وجہ سامنے آجاتی تھی کہ چپ رہتا تھا۔ ایک وجہ تو یہ تھی کہ بعض لوگ اسے من گھڑت قصہ کہیں گے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو ہر اچھی بری بات جنات کے کھاتے میں ڈال دیتے ہیں۔ پھر میں یہ سوچ کر بھی چپ رہا کہ اس واقعہ میں ایک واقعہ ایسا ہو گیا جو محض اتفاق تھا اور پردہ اٹھ گیا لیکن جنات کو ماننے والے کہیں گے کہ یہ اتفاق میں نے خود پیدا کیا ہے۔ دراصل اللہ کا پیدا کیا ہوا اتفاق تھا جس کا مطلب یہ تھا کہ اللہ نے اپنی عظیم حقیقت بے نقاب کرنی تھی۔

میں نے تمہید بہت لمبی کر دی ہے، آیئے آپ کو اصل واقعہ سنا دوں۔ اس وقت میری عمر انیس یا بیس سال تھی۔ یہ ہمارے شکار کا ابتدائی دور تھا۔ ہمارے گاؤں سے تقریباً دو میل دور ایک چھوٹا گاؤں تھا۔ کچھ دن پہلے ہمارے گاؤں میں یہ خبر پہنچی تھی کہ اس گاؤں کے ایک گھر میں پتھر گرتے ہیں اور کسی نہ کسی کپڑے کو آگ لگ جاتی ہے۔ ہم دوستوں نے یہ فیصلہ بلکہ ارادہ کر لیا کہ وہاں جا کر یہ تماشا دیکھیں گے۔ ہماری شکار پارٹی میں جتنے لڑکے تھے وہ سب آپس میں دوست تھے لیکن ہم چار دوست ذرا الگ قسم کے لڑکے تھے۔ ایک تو راجہ شہباز خان تھا جس کا میں اکثر کہانیوں میں ذکر کیا کرتا ہوں۔ میرے دوستوں میں وہی ابھی زندہ ہے، بہت ہی دلیر اور جرأت والا آدمی ہے اور اس کا یہ وصف لڑکپن ہی میں ابھر آیا تھا۔ دوسرا دوست افضل تھا جس کے بوہلی کُتے کا میں بہت ہی ذکر کیا کرتا ہوں۔ وہ بھی بڑے مضبوط دل گردے والا اور عقل و ہوش والا لڑکا تھا۔ تیسرا مشتاق تھا جس کا نام شاید اس کے ماں باپ کو ہی یاد رہ گیا تھا اور وہ خود بھی اپنا اصل نام بھول گیا تھا کیونکہ ہم اسے موٹر کہا کرتے تھے۔ موٹر سے مراد موٹر کار تھی اور اس دور میں ہم موٹر کار کو یہ درجہ دیتے تھے کہ اس سے زیادہ تیز رفتار اور کوئی چیز نہیں ہو سکتی۔ ہمارا یہ دوست ہر کام میں تیز اور بڑی تیزی سے خطروں میں کود جانے والا لڑکا تھا اس لئے اسے ہم نے موٹر نام

دے دیا تھا۔ اس کے ماں باپ بھی اسے اسی نام سے پکارنے لگے تھے۔

ایک روز ہم چاروں دوست اس گاؤں جا پہنچے جس گاؤں کے گھر میں پتھر گرتے اور آگ لگتی تھی۔ وہاں ہماری جان پہچان والے دونو جوان مل گئے اور ہمارے میزبان بن گئے۔ دیہات میں میزبانی کو بڑا اونچا مقام حاصل تھا اور لوگ ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کے لئے کوئی اجنبی گاؤں میں آنکلتا تو اسے گھسیٹ گھسیٹ کر اپنے گھر لے جاتے۔ اگر آپ کا پیٹ حلق تک بھرا ہوا اور ایک ذرے کی بھی گنجائش نہیں تو بھی میزبان پرواہ نہیں کرے گا۔ وہ خاطر مدارات کا اعزاز حاصل کرنے کے لئے آپ کو مجبور کر دے گا کہ اس نے آپ کے آگے جو کچھ رکھا ہے وہ کھائیں خواہ بسیار خوری سے آپ کی موت ہی واقع کیوں نہ ہو جائے۔ یہی سلوک ہمارے ساتھ ہوا۔

ہمارے میزبان نے اپنے گھر کے ایک بچے کی ڈیوٹی لگا دی کہ وہ متاثرہ گھر کے سامنے کھڑا رہے اور جب پتھر گرنے لگیں یا آگ لگے تو دوڑ کر آئے اور اطلاع دے......

کوئی ایک گھنٹے بعد بچے نے آکر اطلاع دی اور میزبان ہمیں وہاں لے گیا۔

وہ ایک کچا مکان تھا جس کا صحن دیہات کے صحنوں کی طرح خاصا کشادہ تھا۔ وہ درمیانہ درجے کے ایک کسان کا گھر تھا۔

دروازہ کھلا ہوا تھا۔ ہم نے پتھر گرتے دیکھے۔ گھر والوں نے ہمیں اندر بلا لیا۔ انہیں شاید یہ امید تھی کہ ہم ان کی نجات کا کوئی بندوبست کر دیں گے۔ تھوڑی دیر بعد ایک پتھر صحن میں گرتا تھا۔ ہم اِدھر اُدھر دیکھتے۔ کچھ پتہ نہیں چلتا تھا کہ یہ پتھر کدھر سے آیا ہے۔ دیوار کے ساتھ ایک سیڑھی لگی ہوئی تھی۔ ہم سب اوپر چھت پر چلے گئے۔ ایک پتھر جس کا وزن تقریباً ایک پاؤ ہوگا ہمارے سامنے چھت پر آ گرا۔ ہم نے اس طرف دیکھا جس طرف خیال تھا کہ پتھر اس طرف سے آیا ہے۔ پھر نیچے ایک اتنا ہی وزنی پتھر گرنے کی آواز آئی اور اس کے ساتھ ہی کسی نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا اندر ایک چارپائی کو آگ لگ گئی ہے۔

ہم سب دوڑے نیچے پہنچے۔ گھر والے وہ چارپائی باہر کو گھسیٹ کر لا رہے تھے۔ اس چارپائی پر ایک دری اور اس پر چادر بچھی ہوئی تھی۔ آگ چادر کو لگی تھی۔ گھر کے دو آدمیوں نے چادر کھینچ کر وہیں فرش پر پھینکی اور پاؤں اوپر مار کر آگ بجھا دی۔ اس کے بعد کچھ بھی نہ ہوا، نہ پتھر آیا نہ آگ لگی۔ گھر والوں نے بتایا کہ دوسرے تیسرے دن ان کے ساتھ اسی

طرح ہوتا ہے۔ ہمیں کچھ سمجھ نہیں آتی تھی کہ کیا کریں۔ ہم نے یہ خاص بات دیکھی کہ گھر والوں کو جتنا پریشان اور خوف زدہ ہونا چاہئے تھا وہ اتنے زیادہ پریشان نہیں تھے۔ گھر کا سربراہ کہتا تھا کہ پیر صاحب ہر روز ایک نیا تعویذ بھیجتے ہیں جو ہم صحن میں بیری کے درخت کے ساتھ باندھ دیتے ہیں اور پہلے روز والا تعویذ جلا دیتے ہیں۔

ایک شاہ صاحب اس گھر کے ایک کمرے میں بیٹھے مراقبے میں گئے ہوئے تھے۔ ہم نے انہیں دیکھا اور انہوں نے ایسی پوزیشن اختیار کئے رکھی جیسے انہیں ہوش ہی نہیں کہ کوئی ان کے قریب کھڑا انہیں دیکھ رہا ہے۔ گھر والے اس شاہ صاحب سے بھی مطمئن تھے۔ پھر انہوں نے بتایا کہ چار میل دور ایک اور شاہ جی ہیں جنہوں نے تعویذ دیئے ہیں۔ پیر اور ان دونوں شاہ صاحبوں نے گھر والوں کو یقین دلا رکھا تھا کہ گھر کے کسی فرد نے کسی جن کے برتن میں غلطی سے پیشاب کر دیا ہے۔ وہ جن اس طرح اس سارے گھر سے انتقام لے رہا ہے لیکن ابھی اس جن کی نشاندہی نہیں ہو رہی۔ البتہ پیر صاحب اور شاہ صاحبوں کے تعویذوں اور مراقبوں کا یہ اثر ہوا کہ پتھر گرنے اور آگ لگنے میں کمی واقع ہوگئی ہے۔

ہم نے عجیب بات یہ دیکھی کہ پتھر کسی کو لگتا نہیں تھا اور آگ لگتی تھی تو وہ بہت تیزی سے نہیں پھیلتی تھی بلکہ آہستہ آہستہ پھیلتی تھی۔ اتنے میں گھر والے اسے وہیں بجھا دیتے تھے۔ آگ کا نقصان کچھ نہ کچھ ضرور ہوتا تھا مثلاً چادر کو آگ لگی جو فوراً اُچھالی گئی لیکن چادر ایک طرف سے جل کر بے کار ہو گئی۔

میرا خیال ہے کہ میں کوئی نئی بات نہیں سنا رہا۔ آپ میں سے کئی ایک حضرات نے ایسے گھر دیکھے ہوں گے جن پر یہ پُراسرار آفت پڑی ہوگی۔ اگر دیکھے نہیں تو اس آفت کی تفصیلات ضرور سنی ہوں گی۔ اس کے ساتھ آپ نے پورے یقین کے ساتھ سنا ہوگا کہ یہ جنات کی کارستانی ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ کسی کا کوئی دشمن کالے جادو کے ذریعے بھی یہ کام کروا سکتا ہے لیکن اس کی روک تھام کے لئے جو کارروائی ہونی چاہئے وہ نہیں ہوتی۔ وہ یہ ہے کہ پولیس تحقیقات کرے کہ متاثرہ گھر کا ایسا دشمن کون ہے اور پھر خفیہ طریقوں سے یہ معلوم کرنے کی کوشش کرے کہ فلاں شخص نے جادو کروایا ہے لیکن دیکھا گیا ہے کہ متاثرہ گھر والے پولیس تک پہنچتے ہی نہیں اور پولیس اپنے آپ کچھ کرتی بھی نہیں۔ انگریزوں کے وقتوں کی کچھ اور بات تھی، پاکستان ایک اسلامی ملک ہے جس میں دین اسلام اور شریعت کے چرچے رہتے ہیں۔ یہاں تو ایسے واقعات تحقیقات قانونی طور پر

ہونی چاہئے۔

ہم نے اس نوجوانی میں یہ واقعہ اپنی آنکھوں دیکھا لیکن ہم کوئی تجربہ اور تحقیقات کرنے کے قابل نہیں تھے۔ اپنے چاروں دوستوں میں صرف میں دس جماعت پاس تھا اور کوئی تعلیم نہیں تھی۔ میرے باقی تین دوست بہت تھوڑا پڑھے لکھے تھے۔ ہم علم سے تو بے بہرہ تھے لیکن ہم چاروں اس شک میں متفق تھے کہ یہ جنات نہیں کچھ اور ہی ہے۔ ہم نے گھر کے بڑے آدمی کے ساتھ بات کی۔ شہباز خان نے اس سے پوچھا کہ وہ نماز پڑھتا ہے یا نہیں اور کیا اس نے کبھی اللہ سے دعا مانگی ہے کہ اس مصیبت سے نجات مل جائے؟

''ہم گنہگار لوگ ہیں بیٹا!'' ___ اس نے کہا ___ ''پیر سرکار سب کچھ کر رہے ہیں اور دو چار دنوں بعد یہ مصیبت ٹل جائے گی''۔

''اور یہ جو دونوں شاہ جی ہیں یہ کیا کہتے ہیں؟'' ___ افضل نے پوچھا۔

''ان کی کرامات سے تم واقف نہیں'' ___ اس نے کہا ___ ''ان کے بغیر اللہ کی درگاہ میں رسائی ہو ہی نہیں سکتی''۔

ہم اسے اللہ کی طرف لانے کی کوشش کر رہے تھے لیکن وہ پیر اور شاہ جی کے سوا کوئی بات سنتا اور سمجھتا ہی نہیں تھا اور شاید وہ اللہ کو بعد کی کوئی چیز سمجھتا تھا۔ اس نے غالباً یہ اندازہ کر لیا تھا کہ ہم ذرا بہتر حیثیت والے نوجوان ہیں اس لئے وہ کچھ عزت سے پیش آ رہا تھا۔ اس کا ایک بھائی ہمارے پاس آ بیٹھا۔ یہ شخص کچھ تیز طبیعت کا آدمی لگتا تھا۔ اسے شاید ہماری باتیں اچھی نہ لگیں لیکن اسے معلوم نہیں تھا کہ ہم چاروں کتنے سرکش اور باغی نوجوان ہیں۔ ہماری کمزوری صرف یہ تھی کہ ہمارے پاس علم نہیں تھا۔ ہم یہی کہے جا رہے تھے کہ جن بھوت ایسے کام نہیں کیا کرتے۔

بحث میں گرما گرمی پیدا ہو گئی اور اب میں نے کہا کہ ان پیروں اور شاہوں پر بھروسہ چھوڑ دو اور اللہ کو یاد کرو۔ اس پر دوسرا شخص غصے میں آ گیا اور اس نے ڈانٹ کر کہا کہ ہم نے پیر کے خلاف کوئی اور بات کی تو اچھا نہیں ہوگا۔

''کس پیر کی بات کرتے ہو؟'' ___ ہمارے دوست موٹر نے اپنی مخصوص تیزی دکھائی، بولا ___ ''یہ پیر!...... یہ تو چور ہے۔ خود بھی بدکار ہے اور اس کا بیٹا اس سے بڑھ کر بدکار ہے۔ ایک عورت پیر کے کمرے سے نکلتی ہے تو اس کا بیٹا اسے اپنے کمرے میں لے جاتا ہے''۔

موٹر نے یہ بات ویسے ہی نہیں کہہ دی تھی۔ یہاں میں اس کی تفصیل میں نہیں جاؤں گا یہ ایک الگ کہانی ہے۔ آپ کو شاید اندازہ نہ ہوکر موٹر نے ایسی بات کہہ دی تھی کہ اسے قتل کیا جا سکتا تھا۔ گالی گلوچ تک تو بات پہنچ گئی تھی۔ ہمارا میزبان بیچ بچاؤ نہ کرتا تو بات بہت دور جا پہنچتی۔ گاؤں کے تین چار اور آدمی بھی آ گئے تھے۔ انہوں نے بھی بیچ بچاؤ کیا لیکن وہ ہمارے خلاف تھے اور کہتے تھے کہ فوراً اس گاؤں سے نکل جاؤ۔

ہم وہاں لڑائی کرنے نہیں گئے تھے، اسی میں عافیت سمجھی کہ وہاں سے کھسک ہی آئیں۔ ان لوگوں کو ہمارے خاندانوں کی حیثیت کا علم تھا یا ہو گیا ہو گا ورنہ وہ ہم چاروں کی خوب پٹائی کرتے۔ یہ لوگ ماں بہن کی گالی برداشت کر لیتے تھے لیکن اپنے پیر کے خلاف بالکل بے ضرر سی بات بھی برداشت نہیں کرتے تھے۔ اب بھی دیہات میں لوگوں کا رویہ اور عقیدہ یہی ہے۔

ہمارا میزبان بڑا شرمسار تھا۔ اس نے کہا کہ ہمیں ایسی بات نہیں کہنی چاہئے تھی۔ وہ بھی ان لوگوں کا ہی ہم خیال تھا لیکن ہمیں مہمان سمجھ کر ہماری عزت کر رہا تھا۔ ہم اس کی دل جوئی کر کے وہاں سے آ گئے۔

تو کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ بات یہیں پر ختم ہو گئی ہو گی؟...... توبہ کرو جی!...... میں نے پہلے کہا ہے کہ ہم معمولی اور غریب سے کسانوں کے بیٹے ہوتے تو اس گاؤں والے ہمیں مار مار کر بے ہوش کر دیتے اور اٹھا کر گاؤں سے باہر پھینکتے۔ بات یہاں پر ختم نہیں ہو گئی تھی۔ ہم اپنے گاؤں پہنچ گئے۔ ہمیں غم یہ لگا ہوا تھا کہ موٹر نے پیر کو چور کہہ دیا تھا۔ اب ہم سوچ رہے تھے کہ بات بڑھ گئی تو موٹر کا دفاع کس طرح کریں گے۔ دوست کہتے تھے کہ صاف جھوٹ بول دیں گے کہ ایسی کوئی بات ہوئی ہی نہیں۔ پھر ہم نے یہ سوچا کہ اپنے بزرگوں کو پہلے ہی بتا دیا جائے کہ اس گاؤں میں یہ بک بک ہوئی تھی۔

یہ فیصلہ ہم نے گاؤں میں پہنچنے سے پہلے ہی کر لیا تھا۔ گاؤں میں داخل ہوئے تو گاؤں کے چار پانچ بزرگ بڑ کے درخت کے نیچے چار پائیاں بچھائے بیٹھے تھے۔ انہوں نے پوچھا کہ ہم کہاں سے آ رہے ہیں ہم نے بتایا تو انہوں نے ہمیں پاس بٹھا لیا۔ وہ اپنی دلچسپی کی خاطر یہ ساری بات سننا چاہتے تھے جو ہم نے سنا دی۔

اس کے بعد ہم نے باری باری کچھ باتیں گھڑ کر اور کچھ پردہ ڈال کر انہیں بتایا کہ وہاں کیا بات ہو گئی تھی۔ ہم دراصل اپنے بزرگوں کو ان لوگوں کے خلاف بھڑکانا بھی نہیں

چاہتے تھے ورنہ لڑائی جھگڑا ہو جاتا۔ بہر حال ان کے کانوں میں ڈال دیا کہ یہ بات ہوئی ہے۔

اگلے روز صبح ہی صبح اس گاؤں کے چار بزرگ ہمارے گاؤں میں آئے اور نمبردار سے ملے۔ انہوں نے زبردست شکایت کی کہ اس گاؤں کے لڑکے وہاں کیا ناروا باتیں کہہ آئے ہیں اور ایک نے پیر جی کو چور کہا ہے۔

ہماری طلبی ہوئی اور ہمارے بزرگوں کو بھی بلا لیا گیا۔ وہ لوگ بڑے ہی غصے میں تھے۔ ہم چاروں وہاں پہنچے تو ہمارے بزرگوں نے لعن طعن کی اور کہا کہ دیکھو یہ معزز اور شریف لوگ کیا گلہ لے کر آئے ہیں۔ ہم نے اپنا رویہ بالکل نرم بلکہ برخورداروں جیسا رکھا اور سر جھکا لئے۔ ہمارے بزرگ بھی بھانپ گئے کہ ہم نے وہاں اچھی خاصی بدتمیزی کی ہے۔ انہوں نے یہ بات یہیں پر ختم کرنے کے لئے ہمیں خوب لتاڑا اور گالیاں والیاں دیں۔

''یہ خوش قسمت ہیں کہ آپ کے بیٹے ہیں''___اس گاؤں کے ایک بزرگ نے کہا___''کوئی اور ہوتے تو ان کے ماں باپ کو ان کی لاشیں ہی ملتیں''۔

آپ تصور میں لا سکتے ہوں گے کہ ان لوگوں کو راضی کرنے میں ہمارے بزرگوں کو کتنا جھکنا پڑا ہوگا۔ بہت ہی جھک جھک ہوئی تھی۔ ان میں ایک بندہ ایسا تھا جو بڑے رعب سے بات کرتا تھا۔ ایک بار پھر اس نے ایسا ہی رعب جمانے کی کوشش کی تو میرا والد سیدھا ہو گیا۔ اس نے اس شخص سے کہا کہ ہم تمہارا غصہ برداشت کئے چلے جا رہے ہیں اور تم سر چڑھتے جا رہے ہو۔ تم بھی سر نیچے کر لو ورنہ ہم کہیں گے کہ ہمارے لڑکوں کا کوئی قصور نہیں اور تم لوگ ہم پر رعب جمانے آ گئے ہو۔

بات بڑھ چلی تھی لیکن اس شخص کے ساتھ آئے ہوئے بزرگوں نے صورتِ حال کو سنبھال لیا اور آخر صلح صفائی ہو گئی۔ ان میں سے ایک نے کہا کہ اپنے لڑکوں کو اچھی طرح سمجھا دو کہ خدا کی نگاہ میں پیر کا کیا درجہ ہوتا ہے اور پھر جو شاہ جی ہیں جن کے تعویذ اور پھونکیں جنات کو بھگا دیتی ہیں یہ خدا کے بڑے ہی پیارے بندے ہوتے ہیں۔ ان کو سمجھائیں کہ ان کی انہوں نے اس طرح توہین کی تو تمہارے گاؤں پر ایسی لعنت پڑے گی کہ مویشی بیمار پڑ جائیں گے اور فصل پک کر جل جائیں گے۔

خدا خدا کر کے یہ معاملہ رفع دفع ہو گیا اور ان بزرگوں کی خاطر تواضع کر کے عزت

سے رخصت کر دیا گیا۔ ہمارے بزرگ تو مطمئن ہو گئے لیکن ہم جل بھن کر رہ گئے۔ ہم سوچتے تھے کہ کس طرح ثابت کیا جائے کہ یہ پتھر اور آگ جنات کی کارستانی نہیں۔ یہ کچھ اور ہے اور کسی پیر اور کسی شاہ جی کے پاس اس کا علاج نہیں۔

یہاں میں پھر کہوں گا کہ ہمارے پاس کوئی علم اور کوئی ایسا استدلال نہیں تھا جو عالم فاضل پیش کیا کرتے ہیں۔ ہم تو قرآن کی کسی آیت کا یا کسی حدیث کا حوالہ دینے کے بھی قابل نہیں تھے۔ اس کے باوجود ہم تسلیم نہیں کرتے تھے کہ یہ جنات اپنا کوئی انتقام لے رہے ہیں اور دوسرے یہ کہ پیر اور شاہ جی وغیرہ جنات کو قابو میں کر لیتے ہیں۔ ہماری عمر کے اس حصے میں ہمارے اس عقیدے کو ہمارا ڈھیٹ پن یا ضدی پن کہا جا سکتا تھا لیکن میں جب سنجیدہ عمر میں پہنچا اور چار کتابیں بھی پڑھ لیں تو مجھے خیال آیا کہ یہ تو اللہ کا نور تھا یا ایمان کی روشنی تھی جو اس کی ذات باری نے ہماری فطرت میں ڈال دی تھی۔

اب دیکھئے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کس طرح اپنی حقیقت کھول کر دکھاتا ہے......جس دن ہم متاثرہ گھر والے گاؤں گئے تھے اس سے چھ سات دنوں بعد ہم نے شکار کا پروگرام بنایا اور ایک صبح ہم شکار پر روانہ ہو گئے۔ یہ تو بتانے کی ضرورت نہیں کہ جب شکار پر نکلا کرتے تھے تو ہماری مائیں کس طرح رخصت کیا کرتی تھیں۔ یہ میں اپنی کہانیوں میں کئی بار سنا چکا ہوں۔ اس صبح بھی ہم اسی طرح گاؤں سے نکلے اور سورج نکلنے تک ہم بہت دور نکل گئے۔ اس روز اللہ نے ہمیں اپنا جلوہ دکھانا تھا۔

ہمیں ایک گھوڑے کے سرپٹ دوڑنے کی آوازیں سنائی دیں اور اس کے ساتھ ہی کوئی آدمی مدد کے لئے چیخ و پکار کر رہا تھا۔ وہ جگہ اونچی نیچی تھی اس لئے نظر نہیں آتا تھا کہ گھوڑا کدھر جا رہا ہے اور کسی آدمی کی یہ آوازیں کدھر سے آ رہی ہیں۔ ہم دوڑتے ہوئے ایک بلند جگہ جا چڑھے اور دیکھا کہ تقریباً ایک سو قدم دور ایک گھوڑی سرپٹ دوڑی جا رہی تھی۔ اس پر ایک آدمی سوار تھا۔ اس نے ایک بازو کی لپیٹ میں ایک بچہ جکڑا ہوا تھا اور دو بھیڑیے گھوڑی کے تعاقب میں دوڑ رہے تھے۔

میں نے اپنی کہانیوں میں پہلے بتایا ہے کہ اس زمانے میں ہمارے علاقے میں بھیڑیے ہوتے تھے لیکن اتنے عام نہیں کہ وقتاً فوقتاً نظر آتے۔ یہ دو بھیڑیے علی الصبح شکار کے لئے نکلے ہوں گے اور انہیں یہ گھوڑی نظر آئی اور اس کے پیچھے ہی دوڑ پڑے۔

گھوڑی کے پیچھے بھیڑیے دراصل اس وجہ سے دوڑے جا رہے تھے کہ گھوڑی ڈر کر

دوڑ پڑی تھی۔ اگر سوار گھوڑی کو قابو میں رکھتا اور اسے دوڑنے نہ دیتا اور بھیڑیوں کے مقابلے میں رک جاتا تو بھیڑیے اس طرح اس کے پیچھے نہ پڑتے۔

ہم نے یہ منظر دیکھا تو کُتوں کے پٹوں سے زنجیریں اتار دیں اور انہیں چھوڑ دیا۔ کُتوں نے تو پہلے ہی بھیڑیوں کو دیکھ لیا تھا اور وہ آزاد ہونے کو تڑپنے لگے تھے۔ زنجیریں کھلتے ہی وہ ہوا ہو گئے۔

مجھے بڑی اچھی طرح یاد ہے کہ اس روز ہمارے ساتھ سات کُتے تھے اور ہم لڑکے گیارہ تھے یا بارہ۔ ان کُتوں میں افضل کا بوہلی بھی تھا جو اس وقت نوجوانی کی عمر میں تھا۔ ایک کتا تازی تھا جسے ہماری زبان میں جہازی کہا کرتے تھے۔ اس کی رفتار تو حیران کر دیتی ہے۔

یہ اس سوار کی خوش قسمتی تھی کہ ہم وہاں تک پہنچ گئے اور اسے دیکھ لیا تھا ورنہ بھیڑیے گھوڑی تک پہنچ گئے تھے اور ذرا ہی آگے تک وہ گھوڑی کو ٹانگوں سے پکڑ کر گرا لیتے پھر اس سوار اور اس کے بچے کا اللہ ہی حافظ تھا۔ کُتے بڑی جلدی ان تک جا پہنچے اور دونوں بھیڑیوں نے رخ بدلا اور بھاگ نکلے۔ کُتے ان کے پیچھے چلے گئے اور ہم سب گھوڑی کی طرف دوڑے جو خوف زدگی کے عالم میں بھاگی ہی جا رہی تھی۔ وہ سوار کے قابو سے نکلی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ سوائے اس کے رخ بدل لیتی وہ ایک چکر میں دوڑنے لگی۔ ہم نے آگے ہو کر گھوڑی کو پکڑ لیا۔

یہ کوئی طاقتور گھوڑی نہیں تھی۔ بری طرح ہانپ رہی تھی اور اس کا جسم خوف سے کانپ بھی رہا تھا۔ سوار اترا اس نے جس بچے کو بازو میں لے رکھا تھا اس کی عمر ایک سال سے تین چار مہینے ہی اوپر تھی۔ وہ تو ہمارا شکریہ ادا کرنے کو تڑپ رہا تھا لیکن صاف پتہ چلتا تھا کہ اسے الفاظ نہیں مل رہے۔ ہمیں اپنے کُتوں کا کوئی غم نہیں تھا۔ بھیڑیا درندہ ہوتا ہے اور وہ مقابلے میں ڈٹ جائے تو کُتوں کا بُرا حال کر سکتا ہے لیکن ہمیں تسلی تھی کہ بھیڑیے دو تھے اور کُتے سات تھے۔

اس سوار کو ہم نے بٹھا لیا اور تسلی دلاسے دینے لگے۔ اس کی عمر پینتیس سال کے لگ بھگ تھی۔ وہ تو رونے پر آیا ہوا تھا۔ اس نے بتایا کہ اللہ نے تین لڑکیوں کے بعد اسے یہ بیٹا دیا ہے۔ اس بچے کو ایک روز پہلے سے بخار ہو رہا تھا۔ میں نے بچے کے ماتھے پر ہاتھ رکھا تو بچہ بخار سے جل رہا تھا۔ اس کے گاؤں کے تین چار آدمیوں نے اسے کہا کہ وہ بچے کو پیر

جی کے پاس لے جائے ورنہ اس کا بچنا مشکل ہو جائے گا چنانچہ وہ صبح سویرے بچے کو اٹھائے گھوڑی پر سوار ہوا اور پیر کے گاؤں کی طرف چل پڑا۔ وہ اچھے درجے کا زمیندار معلوم ہوتا تھا۔

آج کل دیہاتی علاقے میں ڈسپنسریاں کھل گئی ہیں اور کہیں کہیں ہسپتال بھی بن گئے ہیں اور ڈاکٹر دیہات میں پہنچ گئے ہیں۔ میں جس زمانے کی بات کر رہا ہوں اس زمانے میں کوئی کسی بھی مرض میں مبتلا ہو جاتا وہ سب سے پہلے پیر کے ہاں جاتا تھا۔ پیر تعویذوں سے اس کا علاج کرتا اور عموماً تشخیص یہی ہوتی تھی کہ مریض نے قبرستان میں کسی قبر کی بے ادبی کی ہے یا کسی جن کو کوئی تکلیف پہنچائی ہے۔ یقین کریں کہ اکثر مریض عام قسم کے بخار میں جل جل کر مر جاتے تھے لیکن کسی ڈاکٹر یا حکیم کے پاس نہیں جاتے تھے۔ یہ پیر نمونیا تک کو پکڑا اور آسیبی حملہ کہہ دیا کرتے تھے۔

''چاچا جی!'' ___ شہباز خان نے کہا ___ ''اگر آپ اس بچے کی زندگی چاہتے ہیں تو ہماری ایک بات مان لیں...... گوجر خان یہاں سے پانچ میل دور ہے اور آپ کو معلوم ہو گا کہ وہاں ہسپتال ہے جس میں ڈاکٹر ہوتا ہے۔ گھوڑی آپ کے پاس ہے، پیر کے پاس جانے کی بجائے سیدھے گوجر خان پہنچ جائیں اور ہسپتال جا کر ڈاکٹر کو دکھائیں''۔

''وہ چپ چاپ شہباز خان کے منہ کی طرف دیکھتا رہا جیسے فیصلہ نہ کر سکتا ہو کہ اس کی بات مان لے یا نہیں۔ پھر افضل نے بھی اسے یہی بات کہی اور میں نے پرزور تائید کی اور اسے کچھ اور بھی ڈرایا۔ اس نے سر جھکا لیا اور ہم اس کے پیچھے ہی پڑ گئے اور کہا کہ وہ گھوڑی پر سوار ہو جائے اور سیدھا گوجر خان پہنچے۔

''بھیڑیے پھر گھوڑی کے پیچھے نہ آ جائیں!'' ___ اس نے ڈرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''میری بات مانو چاچا!'' ___ میں نے کہا ___ ''اللہ کا نام لو اور یا اللہ یا اللہ کا ورد کرتے ہوئے گوجر خان ہسپتال جا پہنچو...... بڑی ذات اللہ کی ہے پیر کی نہیں۔ زندگی اور موت اللہ کے ہاتھ میں ہے کسی پیر کے ہاتھ میں نہیں''۔

اس عمر میں تو ہم نفسیات نہیں سمجھتے تھے اس لئے یہ ہماری سمجھ سے بالا تھا کہ اس شخص کو چپ کیوں لگ گئی ہے۔ آج میں اس کی ساری کیفیت بیان کر سکتا ہوں۔ مختصر یہ کہ وہ اللہ اور پیر کے درمیان بھٹک رہا تھا اور اس کے لئے یہ فیصلہ محال ہو گیا تھا کہ اللہ سے بچے

کی صحت اور زندگی مانگوں یا پیر سے۔ اتنے میں بچہ بڑی زور سے چیخا وہ تکلیف میں تھا اور شاید وہ باپ کے بازوؤں میں سو گیا تھا۔

باپ نے چونک کر بچے کی طرف دیکھا اور پھر اس نے ہم سب کی طرف دیکھا اور گھوڑی کی لگام کو جھٹکا دیا اور ہلکی سی ایڑ لگائی اور گھوڑی چل پڑی۔ ہمیں معلوم نہیں تھا کہ وہ کس طرف جا رہا ہے، پیر کے پاس یا ڈاکٹر کے پاس!

میں نے پہلے بتایا ہے کہ ہم چار دوست تھے جو پیر پرستی کے سخت خلاف تھے، ہمارے باقی دوست اس بات پر ہمارے خلاف تھے۔ وہ اسی دیہات کی پیداوار تھے اور بالکل اَن پڑھ۔ وہ کہتے تھے کہ پیروں کے خلاف باتیں کر کے بہت بڑا گناہ ہم اپنے سر لے رہے ہیں۔ ہم چار ''بے پیرے'' دوست بڑی ڈھیٹ مٹی کے بنے ہوئے تھے۔ موڑ نے پیر کو چور کہا تھا اور اس پر ہماری بے عزتی ہوئی تھی۔ ہم پیر کے اور ہی زیادہ خلاف ہو گئے اور اب انتقام پر اترے ہوئے تھے...... میں نے پہلے کہا ہے کہ عظیم اور برحق ذات اللہ ہی ہے۔ ہمیں معلوم نہیں تھا کہ آج اللہ ہمیں اپنا جلوہ دکھانے کا انتظام کر رہا ہے۔ وہ گھوڑ سوار ہماری نظروں سے اوجھل ہو گیا اور ہم اپنے شکار کو چل پڑے تب ہم نے توجہ دی کہ کُتے بھیڑیوں کے پیچھے چلے گئے تھے۔ اس طرف دیکھا، کُتے واپس آ رہے تھے۔ ہم بڑی تیزی سے چلتے ہوئے ان تک پہنچے۔ کچھ دور ہمیں ایک بھیڑیا پڑا نظر آیا۔ کُتوں نے اسے مار لیا تھا۔ ہمارے دو ساتھی جو پہلے ہی کُتوں کے پیچھے چلے گئے تھے وہاں کھڑے مرے ہوئے بھیڑیئے کو دیکھ رہے تھے۔ دوسرا بھیڑیا بھاگ گیا تھا۔

ہم آگے چل پڑے اور ہمارے ایک دوست نے کہا کہ یارو، آج ایک زندہ گوہ ملنی چاہئے۔ میری کہانیاں پڑھنے والے خواتین وحضرات جانتے ہوں گے کہ گوہ کس قسم کا جانور ہوتا ہے۔ ایک گھنٹے سے زیادہ وقت گزر گیا۔ ہم گوہ کی تلاش میں تھے اور دیکھتے پھر رہے تھے کہ کون سی جگہ گوہ مل سکتی ہے۔ سورج بہت اوپر آ گیا تھا اور ہم بھوک محسوس کرنے لگے۔ ایک بڑے چوڑے سایہ دار درخت کے نیچے جا بیٹھے اور اپنے ساتھ لایا ہوا کھانا سامنے رکھ لیا اور کھانے لگے۔

ہم کھانا کھا رہے تھے کہ ہمارے ایک ساتھی نے ایک طرف دیکھا اور کہا، آ دوست کھانا کھاؤ۔ ہم نے اس طرف دیکھا۔ پندرہ سولہ سال عمر کا ایک لڑکا ہمارے قریب کھڑا بڑی مایوسی کے عالم میں کچھ عجیب سی نظروں سے ہمیں دیکھ رہا تھا اور وہ بالکل چپ تھا۔ اس

کا چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ بھوکا ہے اگر بھوکا نہیں تو کھانا ضرور کھانا چاہتا ہے۔ ہم نے اسے اپنے ساتھ بٹھا لیا اور وہ کھانا کھانے لگا۔

کھانے کے دوران ہم اس سے پوچھنے لگے کہ وہ کون سے گاؤں کا رہنے والا ہے اور یہاں کیسے آ گیا ہے۔ پہلے وہ کچھ گول گول سے جواب دیتا رہا آخر اس نے کہا کہ کھانا کھا کر وہ بتائے گا۔ ہم نے اس میں کوئی خاص بات نہیں دیکھی تھی کہ اس کے پیچھے پڑ جاتے کہ وہ کہاں سے آیا ہے اور کہاں جا رہا تھا اور اس کی حالت بتا رہی تھی کہ وہ کسی بڑے خاندان کا نوکر ہے اور کسی کام سے ادھر سے گزر رہا ہوگا کہ ہمارے پاس رک گیا اور بھکاریوں کی طرح ہمارے کھانے کی طرف دیکھنے لگا۔

کھانا کھا چکے تو ہم میں سے کسی نے بھی اس سے اس کے متعلق کچھ پوچھنے کی ضرورت محسوس نہ کی۔ ہمارے ایک دوست نے مذاق کے رنگ میں اس سے پوچھا کہ وہ کہاں جا رہا تھا۔ اس نے جب بات شروع کی تو ہم ذرا چونکے اور اس کی طرف متوجہ ہوئے۔ بولتے بولتے اس کے آنسو بہنے لگے۔ اس نے جو بات سنائی وہ میں آپ کو مختصراً سنا دیتا ہوں۔

یہ لڑکا ایک غریب آدمی کا بیٹا تھا جو ہر گھٹیا کام بھی تھوڑے سے پیسے لے کر کر دیا کرتا تھا۔ بہت ہی چھوٹی اور کمین ذات کا آدمی تھا۔ یہ لڑکا جس کا نام اشرف تھا اور اچھو کے نام سے پکارا جاتا تھا، وہ دس گیارہ سال کا تھا کہ اس کی ماں مر گئی۔ پانچ چھ مہینوں بعد اس کے بعد باپ نے اپنے درجے کی ایک عورت کے ساتھ شادی کر لی۔ ظاہر ہے کہ یہ عورت بھی بہت چھوٹی ذات کی تھی۔

میں جب چھوٹی ذات یا کمین ذات لکھتا ہوں تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ یہ لوگ صرف ذات کی وجہ سے قابلِ نفرت تھے بلکہ یہ آدمی اور یہ عورت نیت اور ذہنیت کے لحاظ سے بہت ہی گھٹیا اور کمینے تھے۔ اچھو نے بتایا کہ اس عورت نے اس کے باپ کی بیوی بنتے ہی اچھو کو اپنا ذاتی نوکر سمجھ لیا۔ اس سے مٹھی چاپی کرواتی اور پھر تیسرے چوتھے روز سارے جسم کی تیل مالش کرواتی تھی۔ چاہئے تو یہ تھا کہ وہ اس بچے کو ان کاموں کے عوض پیار اور شفقت دیتی لیکن اس نے یہ رویہ اختیار کر لیا کہ ذرا ذرا سی بات پر بچے کو ڈانٹتی، گالیاں دیتی اور غصہ ٹھنڈا نہ ہوتا تو دو تین تھپڑ جڑ دیتی۔ مختصر بات یہ ہے کہ سوتیلی ماؤں میں جو خرابیاں ہوتی ہیں وہ سب اس ماں میں تھیں۔ یہ عورت اتنی کمینہ تھی کہ اس نے اچھو کے

خلاف جھوٹی شکایتیں گھڑ گھڑ کر اس کے باپ کو اس کے خلاف کر دیا۔

اچھو ماں باپ کا اکلوتا بیٹا تھا اس لئے ماں باپ اس سے بہت پیار کرتے تھے لیکن اب وہ پیار سے بالکل ہی محروم ہو گیا اور پیار کی جگہ اسے دھتکار اور پھٹکار ملنے لگی۔ باپ نے اس کے ساتھ بولنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ ایک سال گزرا تو اچھو کی سوتیلی ماں کا پہلا بچہ پیدا ہوا۔ ماں نے بچہ بھی اچھو کے ہی حوالے کر دیا۔

یہ تو ماں کا سلوک تھا جو میں بہت ہی مختصر لکھ رہا ہوں۔ آپ نے سوتیلی ماؤں کی کہانیوں میں ان کے ظالمانہ سلوک کی تفصیلات کئی بار پڑھی ہوں گی اس لئے میں نے بات مختصر کی ہے۔ اچھو کی عمر دو سال اور زیادہ ہوئی یعنی وہ تیرہ سال سے اوپر کا ہو گیا تو باپ نے اس سے ایک اور کام لینا شروع کر دیا۔ وہ یہ کہ باپ کبھی کبھی آدھی رات کے وقت جگا لیتا اور قبرستان میں لے جاتا۔ اسے انسانی جسم کی کوئی ہڈی سمجھا کر کہتا کہ فلاں جگہ جاؤ، وہاں تین چار قبریں بہہ گئی ہیں اور مُردوں کے پنجر ننگے ہو گئے ہیں ان میں سے کسی کی یہ ہڈی اٹھا لاؤ۔

یہ کام چاندنی رات میں ہوتا تھا۔ ہمارا علاقہ سطح مرتفع ہے۔ کہیں اونچا کہیں نشیبی۔ ساون کی بارشوں میں پانی سیلاب کی طرح بہتا قبروں میں سے گزرتا ہے تو زمین کو اپنے ساتھ ہی بہا لے جاتا ہے۔ اس طرح بڑے پرانے دفن کئے ہوئے مردے ننگے ہو جاتے ہیں۔ ان کی صرف ہڈیاں رہ جاتی ہیں۔ انسانی ہڈیوں میں سے بعض کالے جادو میں استعمال ہوتی ہیں۔ کھوپڑیوں کے ٹکڑے بھی اس شیطانی استعمال میں آتے ہیں۔

اچھو کے باپ نے غالباً کوئی خاص عمل کرنا ہوتا تھا جس میں لازمی تھا کہ مطلوبہ ہڈی چھوٹی عمر کا کوئی لڑکا لائے۔ پہلے تو ہم یہ سمجھے کہ اچھو کا باپ غریب آدمی تھا اور وہ کالے جادو کے کسی عامل کے کہنے پر یہ کام کرتا ہو گا اور اسے کچھ پیسے مل جاتے ہوں گے لیکن اچھو نے بتایا کہ یہ عمل اس کا باپ کیا کرتا تھا۔ اس کا باپ پوری پوری رات جاگتا اور عجیب حرکتیں کرتا رہتا تھا لیکن ہر رات نہیں۔ یہ کام وہ کبھی کبھی کرتا تھا۔

اچھو نے یہ بھی بتایا کہ اس کے باپ کے پاس کبھی کبھی کوئی اونچی ذات کا آدمی آتا اور کبھی کوئی عورت آ جاتی تھی۔ وہ اسے الگ بٹھا لیتا اور معلوم نہیں ان کے ساتھ کیا باتیں کرتا تھا...... میں آپ کو زیادہ سسپنس میں نہیں رکھنا چاہتا۔ آپ سمجھ ہی گئے ہوں گے کہ اچھو کا باپ کالا جادو کرتا تھا اور اس میں وہ اچھو کو استعمال کیا کرتا۔ اسے زیادہ تر رات کو

قبرستان میں بھیجتا تھا اور اچھو تن تنہا آدھی رات کے وقت قبرستان میں مارا مارا پھرتا رہتا۔ اکثر وہ ڈر بھی جایا کرتا تھا۔ ایک بار وہ اتنا ڈرا کہ ہڈی اٹھائے بغیر باپ کے پاس آیا جو قبرستان کے باہر اس کا انتظار کر رہا تھا۔ باپ نے تسلی دلاسہ دینے کی بجائے اچھو کو گالیاں دیں اور کہا کہ وہ ہڈی لے آئے ورنہ وہ اسے بہت مارے پیٹے گا۔

اچھو نے ایک راستہ سوچ لیا تھا۔ وہ یہ کہ گھر سے بھاگ جائے۔ غور کریں کہ اس بے چارے کی زندگی ہی کیا بن گئی تھی۔ باپ اس سے یہ ڈراؤنے کام لیتا اور اس کے عوض اسے باپ کا ذرا سا پیار بھی نہ ملتا بلکہ یوں معلوم ہوتا تھا کہ باپ اس انتظار میں رہتا تھا کہ اچھو کوئی غلط حرکت کرے تو باپ اسے مارے پیٹے۔ ادھر سوتیلی ماں تھی جو اچھو کو انسان کا بچہ سمجھتی ہی نہیں تھی۔ اسے وہ بے حس جانور سمجھتی اور جانوروں کی طرح ہی استعمال کرتی تھی۔

اچھو کو کبھی موقعہ ملتا تو ماں کی قبر پر جا کر اتنا روتا کہ اپنے آپ پر قابو پانا مشکل ہو جاتا تھا۔ ایک روز اچھو ماں کی قبر پر رو رو کر گھر آیا تو سوتیلی ماں نے اس کی آنکھیں دیکھیں جو لال سرخ ہو گئی تھیں۔ صاف پتہ چلتا تھا کہ روتا رہا ہے۔ سوتیلی ماں نے پوچھا کہ کیا ہوا ہے اور وہ کیوں روتا رہا ہے۔ اس نے بتایا کہ وہ ماں کی قبر پر چلا گیا تھا اور وہاں روتا رہا ہے۔ سوتیلی ماں نے اپنا سلیپر اتارا اور یہ سلیپر اچھو کے سر پر اور پھر منہ پر مارا اور بولی کہ وہ ماں مر گئی ہے اور اب میں تمہاری ماں ہوں، خبردار جو مری ہوئی ماں کی قبر پر کبھی روئے تو جان سے مار کر اسی قبر میں دفن کر دوں گی۔

اچھو مسلسل برداشت کرتا چلا آیا اور اس عمر کو پہنچ گیا۔ اب اس کی عمر سولہ سال ہو گئی تھی۔ اس نے ایسے ظالمانہ حالات میں پرورش پائی تھی ان حالات نے اسے بارہ تیرہ سال کی عمر میں ہی جوان کر دیا تھا اور اس کے اندر بارود بھرتا جا رہا تھا۔ وہ جب ہمارے پاس بیٹھا اپنی مظلومیت کی باتیں بتا رہا تھا، اس سے ایک دو روز پہلے رات کو باپ نے اسے پھر قبرستان میں بھیجا اور انسانی جسم کی خاص ہڈی لانے کو کہا۔ یہ کام تو وہ کرتا ہی رہتا تھا، اس رات اس نے عہد کر لیا کہ یہ کام نہیں کرے گا۔ وہ قبرستان میں چلا گیا اور کچھ دیر بعد واپس آ کر باپ کو بتایا کہ ہڈی نہیں ملی۔ باپ نے گالی گلوچ کی اور اچھو باپ کے آگے ڈٹ گیا۔ اس نے کہا کہ وہ آج رات ایک بار پھر قبرستان میں نہیں جائے گا۔ باپ شاید بھانپ گیا تھا کہ لڑکا خودسر ہو گیا ہے۔ باپ نے اپنا رعب رکھنے لئے کہا کہ چلو، آج نہ سہی،

کل تمہیں یہ ہڈی لانی ہی لانی ہے خواہ تمہاری جان چلی جائے۔ یہ کہہ کر باپ اسے واپس لے آیا۔

اگلے روز اچھو کا باپ گھر نہیں تھا۔ اس کی سوتیلی ماں نے کسی بات پر اسے گالی دے کر کہا کہ وہ ابھی یہ کام کرے۔ اچھو نے صاف انکار کر دیا۔ وہ دراصل باغی ہو چکا تھا۔ پہلی بار اس نے سوتیلی ماں کی حکم عدولی کی اور اس طرح بولا تھا۔ سوتیلی ماں نے حسب معمول اپنی جوتی اتاری اور اچھو کو مارنے کے لئے اس کی طرف بڑھی۔ اچھو نے اس کا بازو پکڑ لیا اور ایک جھٹکے سے اس کا بازو مروڑا اور کہا کہ آج کے بعد وہ اپنی یہ بے عزتی برداشت نہیں کرے گا۔ سوتیلی ماں نے بہت بک بک کی لیکن اچھو گھر سے نکل گیا تھا۔ اچھو کو یہ نظر آ رہا تھا کہ سوتیلی ماں اس کے باپ سے شکایت کرے گی۔ اچھو باپ کے آگے ڈٹ جانے کا فیصلہ کر چکا تھا۔

باپ گھر آیا تو بہت حیران ہوا کہ اس کی سوتیلی ماں نے اس کے باپ کے ساتھ ذکر تک نہ کیا کہ آج اچھو نے بدتمیزی کی ہے۔ شام کے بعد سب حسبِ معمول سو گئے۔ آدھی رات کے وقت باپ نے اچھو کو جگایا اور اسے قبرستان لے گیا۔ اچھو خاموشی سے اس کے ساتھ چلا گیا۔ قبرستان پہنچ کر باپ پیچھے ہی رک گیا اور اچھو سے کہا کہ کل والی ہڈی آج لے کر ہی آئے۔

اچھو کوئی اور ہی ارادہ کر چکا تھا۔ وہ قبرستان میں چلا گیا اور دوسری طرف سے قبرستان سے نکل گیا اور پھر چلتا ہی رہا۔ اس نے گھر سے بھاگ جانے کا پکا ارادہ کر لیا تھا۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ وہ کہاں جائے گا۔ وہ چلتا ہی گیا اور جب اس نے محسوس کیا کہ اس کا باپ اس کے پیچھے نہیں آئے گا تو وہ ایک جگہ رک گیا اور زمین پر لیٹا اور فوراً ہی اس کی آنکھ لگ گئی۔ ہمارا علاقہ ایسا ہے کہ مویشی ہو یا انسان، تھوڑی ہی دور جا کر اس طرح غائب ہو جاتا ہے جیسے اسے زمین نے نگل لیا ہو۔

اگلی صبح اس کی آنکھ اس وقت کھلی جب سورج بہت اوپر آ گیا تھا۔ وہ اٹھا اور چل پڑا۔ بھوک نے اسے پریشان کرنا شروع کر دیا تھا۔ وہ چلتا گیا اور اس جگہ آن پہنچا جہاں ہم بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ اس کی فوری ضرورت کھانا ہی تھی جو اسے مل گیا اور جب اس نے دیکھا کہ ہمارے دلوں میں اس کے لئے ہمدردی اور پیار ہے تو اس پر جو گزری تھی وہ اس نے ہمیں سنا ڈالی۔

ہم نے اس سے پوچھا کہ وہ کہاں جانا چاہتا ہے۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ پھر اس نے کہا کہ اسے کچھ پتہ نہیں کہ وہ کہاں جائے۔ وہ پہلی بار اپنے گاؤں سے نکلا تھا۔ ہم نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ ہم میں سے بولا کوئی بھی نہیں۔ خاموشی خاموشی میں ہم نے طے کر لیا کہ اس لڑکے کو اپنے گاؤں لے چلتے ہیں۔ اسے کہا کہ وہ ہمارے گاؤں چلا چلے، اسے روٹی بھی ملے گی اور کچھ پیسے بھی مل جایا کریں گے۔ وہ تو پناہ ڈھونڈ رہا تھا۔ اس نے روتے ہوئے کہا کہ وہ سب کی خدمت کرے گا۔ اسے کوئی اپنی پناہ میں لے لے۔

اس نے اپنی مظلومیت کی جو داستان سنائی تھی وہ میں نے آپ کو بہت تھوڑی سنائی ہے۔ اس نے تو ذرا ذرا سی باتیں بھی سنائی تھیں اور اس کے باپ نے اور اس کی سوتیلی ماں نے اس پر ایسے ایسے ستم توڑے تھے کہ ہمارے دل موم ہو گئے۔ میں آپ کو اپنی بات بتاتا ہوں۔ میرے دل میں ایسی ہمدردی پیدا ہوئی کہ دل میں آئی کہ اسے اپنا بھائی بنا کر رکھوں گا اور اس کی سوتیلی ماں کو قتل کرنے سے بھی گریز نہیں کروں گا۔

اس کے ساتھ ہم نے کچھ ضروری باتیں طے کر لیں اور اسے کہا کہ ہم ساری عمر اسے اپنے گاؤں میں رکھیں گے اور اگر اس نے ہمیں دھوکہ دیا تو پھر اس کے لئے ٹھیک نہیں ہو گا۔ اس نے آنسو بہاتے ہوئے ہاتھ جوڑ کر کہا کہ وہ اپنی جان دے دے گا دھوکہ نہیں دے گا۔

ہم اپنے شکار پر کچھ اور آگے گئے۔ دو خرگوش کُتوں سے مروائے اور واپس چل پڑے۔ وہ گاؤں جس کے ایک گھر میں آگ لگتی اور پتھر گرتے تھے ہمارے راستے سے ڈیڑھ دو فرلانگ ہٹ کر تھا۔ واپسی پر ہم نے سوچا کہ اس گاؤں میں جانا تو ابھی مناسب نہیں کیونکہ وہ لوگ ابھی غصے میں ہوں گے لیکن اس گاؤں کے ذرا قریب سے گزریں گے۔ گاؤں کا کوئی آدمی کھیتوں میں کام کرتا مل ہی جائے گا۔ اس سے اس گھر کے متعلق کوئی نئی خبر پوچھیں گے۔

ہم اس گاؤں کے قریب پہنچے تو راستہ بدل لیا تاکہ گاؤں کے بالکل قریب سے گزریں۔ ہم گاؤں کے بالکل ہی قریب چلے گئے اور گاؤں کے کچھ آدمی اور بچے اتنے سارے کُتے دیکھ کر ہمارے پاس آ گئے۔ ہم چار دوست اس گاؤں میں گئے اور وہاں ٹھہرے بھی تھے اس لئے دو تین آدمیوں نے ہمیں پہچان لیا۔ ہم نے اس گھر کے متعلق

پوچھا تو ہمیں بتایا گیا کہ اس گھر کا وہی حال ہے جو پہلے تھا۔ کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔

اتنے میں ایک بڑا ہی معزز آدمی آ گیا۔ معزز سے میری مراد یہ ہرگز نہیں کہ وہ کوئی باعزت آدمی تھا یا اس قابل تھا کہ ہر کوئی اس کی عزت کرتا۔ معزز اس لئے کہہ رہا ہوں کہ اس نے دو گھوڑا بوسکی اور لٹھے کی شلوار پہنی ہوئی تھی اور سر پر مشہدی لنگی تھی جو زری کلے پر بندھی ہوئی تھی۔ یہ لباس دیہات میں کسی بڑے امیر آدمی کا ہوتا ہے۔ اس نے مونچھوں کو تاؤ دے رکھا تھا۔ ہمارے پاس آ کر اس نے بڑے رعب دار لہجے میں بات کی۔ وہ ہمارے کتوں کو دیکھ رہا تھا۔ اس کے ساتھ کچھ باتیں ہوئیں۔ اس دوران اس نے ہم چاروں دوستوں کو پہچان لیا اور اس طرح کی پند ونصیحت شروع کر دی کہ خدا کے بعد پیر کا درجہ ہوتا ہے اور ہم پیروں کی بے ادبی سے توبہ کریں ورنہ خدا کی طرف سے ہمیں بہت بری سزا ملے گی۔ ہم نے کچھ بھی نہ کہا، اس کی باتیں سنتے رہے اور وہاں سے چل پڑے۔ گاؤں سے کچھ دور چلے گئے تو اچھو نے ایک انکشاف کیا۔

''اس آدمی کو میں جانتا ہوں''۔۔۔ اچھو نے کہا۔۔۔ ''یہ تین چار بار میرے باپ کے پاس آیا تھا۔ مجھے پورا یقین ہے کہ یہ کوئی عمل کروانے آیا تھا۔ یہ جب آخری بار آیا تو میں نے اپنے باپ کو دو راتیں جاگتے اور عمل کرتے دیکھا تھا''۔

اچھو کی اتنی سی بات سن کر سب سے پہلے میں نے کہا کہ یہ شخص اسی گھر پر عمل کروانے گیا ہوگا جس گھر میں پتھر گرتے ہیں اور آگ لگتی ہے۔ کسی طرح یہ معلوم کروایا جائے کہ اس کی اس خاندان کے ساتھ کوئی دشمنی ہوگی۔ میرے دوستوں نے میری بات سے اتفاق کیا۔ اس گاؤں کے جو بزرگ ہمارے بزرگوں کے پاس ہماری شکایت لے کر آئے تھے ان میں یہ بھی تھا اور سب سے زیادہ باتیں اسی نے کی تھیں۔ یہ یقین دلا رہا تھا کہ یہ جنات ہیں جو اس گھر سے انتقام لے رہے ہیں۔ وہ ادھیڑ عمر آدمی تھا۔ چہرے پر جوانی کا تاثر ابھی باقی تھا۔

ہم چاروں دوستوں نے طے کر لیا کہ اس گاؤں میں تھوڑی جاسوسی کریں گے۔ ہم ان میزبانوں سے معلوم کر سکتے تھے جن کے ہاں ہم اس گاؤں جا کر ٹھہرے تھے۔ ہم اپنے گاؤں پہنچے اچھو کو میں نے اپنے گھر رکھ لیا۔ ایک غریب لڑکے کو گاؤں رکھنا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ اگلے ہی روز میں اور شہباز خان اس گاؤں چلے گئے اور اپنے پہلے میزبان کے گھر گئے۔ ہمیں ڈر تھا کہ وہ ہم سے ناراض ہوگا کیونکہ ہم پیروں کے خلاف تھے لیکن وہ بڑی

خندہ پیشانی سے ملا۔

ہم نے اس سے اس شخص کا نام لے کر پوچھا کہ متاثرہ گھر کے کسی آدمی کے یا پورے خاندان کی فلاں شخص کے ساتھ کوئی دشمنی ہے؟

''زبردست دشمنی ہے''۔۔۔ ہمارے میزبان نے بتایا۔۔۔ ''یہ دشمنی کچھ پرانی چلی آ رہی ہے۔

ہمارے علاقے میں خاندانی اور پرانی دشمنی کوئی عجیب بات نہیں ہوتی تھی۔ یہ تو جیسے ہمارے کلچر کا ایک حصہ تھا۔ ہمارے میزبان نے ہمیں اس دشمنی کی پوری ہسٹری سنائی جو میں آپ کو نہیں سناؤں گا کیونکہ بات لمبی ہو جائے گی۔ یہ سمجھ لیں کہ یہ دشمنی روز بروز پکی ہی ہوتی جا رہی تھی۔ ہم نے یہ ساری تفصیل سن کر کہا کہ یہ آگ اور پتھروں کا سلسلہ اس شخص نے چلایا ہے اور ہم جانتے ہیں کہ یہ جادو اس نے کہاں سے کروایا ہے۔ اپنے میزبان سے ہم نے کہا کہ ابھی وہ کسی کے ساتھ یہ بات نہ کرے۔

ہم یہی بھید لینا چاہتے تھے جو ہمیں مل گیا۔ کچھ دیر اور وہاں گپ شپ لگا کر ہم واپس اپنے گاؤں آ گئے۔ ہمیں اس گھر سے جس گھر میں پتھر گرتے تھے کوئی ہمدردی یا دلچسپی تھی یا نہیں، یہ الگ بات ہے۔ ہمیں جوابی حملہ کرنے کا سامان مل گیا تھا۔ ہم نے اپنی بے عزتی کا انتقام لینا تھا۔

اس سے اگلے روز ہم چاروں دوست گھوڑیوں پر سوار ہوئے اور اس گاؤں جا پہنچے جس گاؤں میں اچھو کا باپ رہتا تھا۔ اس گاؤں میں ہم اجنبی تھے۔ ہم نے اچھو کا نام لے کر پوچھا کہ اس لڑکے کا گھر کہاں ہے۔ ہمیں اس کے گھر کا پتہ چلا تو وہاں جا کر اچھو کے باپ کو باہر بلایا۔ وہ ہمیں دیکھ کر حیران بھی ہوا اور مرعوب بھی۔ اس نے ہمیں اندر چلنے کو کہا۔ اس کا گھر بالکل چھوٹا سا تھا۔ ہم گھوڑیوں سے اترے اور اس کے گھر گئے۔ اس نے صحن میں چار پائیاں رکھیں اور ہم بیٹھ گئے۔ وہ زمین پر ہی بیٹھ گیا۔

ہم نے کوئی تمہید نہ باندھی۔ اسے کہا کہ اس نے فلاں گاؤں کے فلاں گھر پر جادو کیا ہے اور فلاں آدمی کے کہنے پر یہ چکر چلایا ہے۔ وہ کچھ گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔

''دیکھ اوئے چوہڑے!''۔۔۔ افضل نے کہا۔۔۔ ''ہم تیری یہ ساری نسل ختم کر ڈالیں گے''۔

اس نے ہاتھ جوڑ دیئے۔ ہمارے لباس، ہمارے جسم اور چہرے اور ہماری گھوڑیاں

دیہات میں ہماری حیثیت کا پتہ دے رہی تھیں۔ وہ جان گیا تھا کہ ہم معمولی گھرانوں کے لڑکے نہیں۔ اس نے ہاتھ جوڑ کر پوچھا کہ اس سے کیا قصور ہوگیا ہے۔ افضل نے اس گاؤں کا نام لیا اور اس گھر کے سربراہ کا نام لیا۔

''تو نے اس گھر پر کالا عمل کیا ہے'' ـــ افضل نے کہا ـــ ''وہاں کئی دنوں سے پتھر گر رہے ہیں اور آگ لگ رہی ہے''۔

''بولنے سے پہلے سن لے!'' ـــ شہباز خانے کہا ـــ ''اگر تو نے یہ کہا کہ تو نے کچھ نہیں کیا تو پھر تیرا یہ گاؤں دیکھے گا کہ تیری اور تیری اس بیوی کی کیا حالت ہوتی ہے۔ کہہ دے یہ چکر تو نے چلایا ہے۔

''مائی باپ!'' ـــ اس نے ہاتھ جوڑ کر کہا ـــ ''آپ جیسے مہاراجے آتے ہیں اور جو حکم دیتے ہیں وہ بجالاتا ہوں اور ان معصوم بچوں کے لئے چار پیسے ہاتھ آجاتے ہیں۔ میں انکار تو نہیں کر رہا سرکار!...... پرانی بات ہے، ایک پیر استاد کی خدمت کی تھی اور وہ یہ عمل دے گیا ہے''۔

ہم نے جب دیکھا کہ اس نے ہتھیار ڈال دیئے ہیں اور اس نے انکار نہیں کیا تو ہم نے اپنا رویہ ذرا نرم کرلیا اور آدمی کا نام لیا جس کے متعلق اس شخص کے بیٹے اچھو نے بتایا تھا کہ یہ شخص اس کے باپ کے پاس آتا رہا ہے اور یہ عمل اس نے کروایا ہے...... اس نے فوراً مان لیا کہ اسی کے کہنے پر اس نے یہ عمل کیا ہے۔

ہم نے اس پر بڑی بُری طرح دہشت طاری کردی تھی۔ اس کے بعد ہم اصل بات پر آئے جو یہ تھی کہ وہ اپنا عمل یہیں یہ ختم کردے۔

''میرے لئے تو ہر طرف عذاب ہے راجہ جی!'' ـــ اس نے کہا ـــ ''عمل ختم کرتا ہوں تو یہ راجہ صاحب ڈنڈا لے کر میرے سر پر آن کھڑے ہوں گے۔ آپ کی نہیں مانتا تو آپ کا قہر مجھ پر پڑے گا۔ آپ ہی بتائیں میں غریب آدمی کدھر جاؤں''۔

ہم نے اسے تسلی دی کہ وہ اس شخص سے نہ ڈرے، اسے ہم سنبھال لیں گے اور وہ اس کے پاس نہیں آئے گا۔ موٹر نے اسے کہا کہ وہ آ بھی گیا تو اسے کہنا کہ استاد کسی بات پر مجھ سے ناراض ہوگیا ہے اور اس نے مجھے اس عمل کی طاقت سے محروم کردیا ہے اور میں اب مجبور ہوں۔

اس سے پوچھا کہ وہ یہ عمل جلدی سے جلدی کب تک ختم کرسکتا ہے۔ اس نے کہا کہ

وہ یا تین دن لگیں گے۔ ہم اس کے ساتھ طے کر کے اٹھے کہ وہ یہ عمل جتنی جلدی ہوسکے ختم کردے۔

اس زمانے میں دیہات کا کلچر کچھ اور ہوتا تھا۔ ہم باہر نکلے تو چار پانچ معزز سے آدمی کھڑے تھے جن میں سے ایک کے متعلق پتہ چلا کہ نمبردار ہے۔ ہم ان کے لئے اجنبی تھے اس لئے وہ ہمیں مہمان سمجھ رہے تھے۔ انہوں نے ہمیں خاطر تواضع کے لئے لے جانا چاہا لیکن ہم نے اپنی مجبوری ظاہر کر کے معذرت کرلی۔ نمبردار نے پوچھا کہ ہم کس کام سے آئے تھے۔ ہم نے صاف صاف بتا دیا اور کہا کہ انہیں شاید معلوم ہی نہیں کہ ان کے گاؤں میں ایک شیطان رہتا ہے جو لوگوں کے لئے نئی سے نئی مصیبت کھڑی کردیتا ہے۔

معلوم ہوا کہ گاؤں میں کسی کو پتہ ہی نہیں تھا کہ یہ شخص پیسے لے کر لوگوں پر جادو کرتا ہے۔ نمبردار نے اسے باہر بلایا اور ایک ہی سانس میں بہت سی گالیاں دے ڈالیں اور اسے کچھ دھمکیاں دیں۔ وہ غریب آدمی اور ہی زیادہ کانپنے لگا۔

ہم نے اسے یہ نہ بتایا کہ اس کا بیٹا جو گھر سے بھاگ گیا ہے وہ ہمارے پاس ہے۔ یہ ایک خطرہ تھا جو ہم مول لے رہے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمیں پورا یقین تھا کہ اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ ہے اور ہمیں ناکامی نہیں ہوگی۔ اگلے روز ہم اس گاؤں چلے گئے جہاں آگ لگتی اور پتھر گرتے تھے۔ ہم سیدھے نمبردار کے گھر گئے۔ وہ ہمیں دیکھ کر خوش نہ ہوا کیونکہ ہم پیر کے خلاف باتیں کر آئے تھے۔ ہم نے اسے بتایا کہ جس گھر میں پتھر گرتے ہیں اس گھر کو ہم اس آفت سے نجات دلا سکتے ہیں۔ اس کے لئے ہمیں اس گھر کے صحن میں دو رکعت نفل پڑھنے ہوں گے۔ اس کے دو دنوں بعد یہ سلسلہ ختم ہوجائے گا۔

نمبردار طنزیہ سی ہنسی ہنس پڑا اور وہ ہمیں نصیحت کرنے لگا کہ ہم ان باتوں میں دخل نہ دیں۔ ہم نے اسے کہا ہم نے نفل ہی پڑھنے ہیں کوئی بُرا کام تو نہیں کرنا۔ ہم دراصل یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ یہ کام جنات کا نہیں۔ یہ کالا جادو ہے۔ نمبردار مان گیا۔

نمبردار نے گاؤں کے بزرگوں کو اطلاع دی اور بزرگ نمبردار کے گھر آگئے۔ پہلے تو انہوں نے ہم پر غصہ جھاڑا جو ہم نے خندہ پیشانی سے برداشت کیا اور اپنی بات کی اور کہا کہ ہم اللہ کی مدد مانگیں گے اور اللہ انشاء اللہ ضرور مدد کرے گا۔ انہوں نے ہمیں اجازت تو دے دی لیکن اس میں طنز بڑی نمایاں تھی۔

آہستہ آہستہ یہ بات سارے گاؤں میں پھیل گئی اور لوگ ہمیں دیکھنے کے لئے آنے

لگے۔ وہ شخص بھی بڑے رعب سے ہمارے پاس آیا جس نے یہ جادو کروایا تھا۔ وہ تو سب سے زیادہ باتیں کرتا تھا اور اس کی ہر بات ہمارے خلاف تھی۔ میں اور شہباز خان اس شخص کو الگ لے گئے اور اسے بتایا کہ ہم راز معلوم کر آئے ہیں اور بہتر ہے کہ وہ چپ رہے۔

ہم نے اس سے کہا کہ اس کا راز کسی کو نہیں بتائیں گے اور اگر اس نے ہم پر رعب جھاڑنے کی کوشش کی تو پھر اس گاؤں میں اس کی بڑی زیادہ بے عزتی ہوگی۔ ہم نے یہ بھی کہا کہ اس نے جس گھر پر کالا جادو کرایا ہے ان لوگوں کو پتہ چل گیا کہ یہ اس نے کروایا ہے تو بڑا خون ریز دنگا فساد ہوگا اور ہم یہ معاملہ تھانے تک پہنچا دیں گے۔

ہم گاؤں کے بڑوں کو بتا آئے کہ ہم کل کس وقت نفل پڑھنے آئیں گے۔ ہم دیکھ رہے تھے کہ گاؤں کے بڑے کچھ خوش نہیں ہوئے تھے وہ صرف اس لئے خاموش رہے کہ ہم اللہ کا نام لے رہے تھے اور نفل پڑھنے کو کہہ رہے تھے۔

اگلے روز ہم پھر اس گاؤں جا پہنچے۔ ظہر کی نماز کے بعد ہم نے نفل پڑھے۔ متاثرہ گھر کے آدمیوں کو خاص طور پر اس عبادت میں شامل کیا اور اس شخص کو بھی جس نے یہ جادو کروایا تھا۔ یہ تو ہم نے ظاہر ہونے ہی نہیں دیا تھا کہ ہم اصل حقیقت معلوم کر آئے ہیں۔

ظہر کے بعد پیش امام کے پیچھے دو رکعت نفل پڑھے گئے۔ پھر ہمارے کہنے پر پیش امام نے دعا کی کہ اس گھر کو اس مصیبت سے نجات دلائے۔ دعا کے بعد راجہ شہباز خان اٹھا اور اس نے اتنا ہی کہا کہ ایک دن بعد یہ مصیبت ختم ہو جائے گی اور یہ کوئی جن بھوت نہیں صرف اللہ پر بھروسہ رکھو اور اللہ ہی کی مانو۔

یہ عمل کرنے والے کے ساتھ تو ہم بات پکی کر آئے تھے کہ وہ اپنا عمل جلدی ختم کر دے۔ اللہ نے ہماری کوششیں کامیاب کر دیں اور ایک دن بعد یہ آفت ہمیشہ کے لئے ٹل گئی۔ اس گھر کا سربراہ اور تین اور مرد ہمارے گاؤں میں آئے اور ہم سب کا شکریہ ادا کیا کہ ہم نے اسے نجات دلائی ہے۔ اگر ہم ان آدمیوں کو یہ بتا دیتے کہ یہ کالا جادو تھا اور ان کے فلاں دشمن نے کرایا تھا تو اس گاؤں میں خون خرابہ ہو جاتا۔

اب دیکھئے کہ اللہ نے ہمیں ایک جلوہ اور بھی دکھا دیا۔ وہ اس طرح کہ وہ گھوڑی سوار جو بیمار بچے کو پیر کے پاس لے جا رہا تھا، آٹھ دس دنوں بعد ہمارے گاؤں آیا۔ وہ پوچھتا پھر رہا تھا کہ اس گاؤں کے کچھ لڑکے کتوں کو ساتھ لئے شکار کو گئے تھے۔ ہم اسے ملے۔ اس نے پہلی خبر یہ سنائی کہ وہ اس روز سیدھا گوجر خان ہسپتال چلا گیا اور ڈاکٹر نے

بتایا تھا کہ بچے کو ملیریا ہو گیا ہے۔ ڈاکٹر نے اسے ایک ہفتے کی دوائی دی تھی اور بچہ صحت یاب ہو گیا۔ اس نے بتایا کہ گاؤں کے ایک سیانے نے اسے بتایا تھا کہ بچے پر آسیبی سایہ پڑ گیا ہے اور اسے پیر صاحب کے پاس لے جاؤں اگر وہ بچے کو پیر کے ہاں لے جاتا تو پھر بچہ زندہ بھی نہ رہتا۔

مجھے احساس ہے کہ میں نے ایک بڑی لمبی کہانی بہت ہی مختصر کر کے سنائی ہے جس سے مجھے خطرہ نظر آ رہا ہے کہ میں اس میں وہ دلچسپی پیدا نہیں کر سکا جو کہانیوں میں لازمی سمجھی جاتی ہے لیکن میں خود مطمئن ہوں کہ میں نے جو بات کہنی تھی وہ کہہ دی ہے۔

+++

راز اُس روز کا

ہمارے وقتوں میں جو محبت ہوتی تھی وہ پاک ہوتی تھی کیونکہ وہ روح کی گہرائیوں میں اتری ہوئی ہوتی تھی۔ ایک بار ہوگئی تو اس میں کوئی تبدیلی نہیں آتی تھی لیکن یہ ہابی نہیں تھی۔ اس پر جانیں قربان کردی جاتی تھیں۔

جب کبھی گزری ہوئی زندگی پر غور کرتا ہوں تو واقعات کی ایک فلم سی ذہن کے پردے پر چلنے لگتی ہے۔ ایسے ہی لمحات میں مجھے ایک واقعہ یاد آ گیا تھا اور یہ واقعہ میرے دل میں کانٹے کی طرح چبھنے لگا۔ یہ ایک راز تھا جسے میں نے عرصہ تین سال اور سات آٹھ مہینوں سے اپنے دل کے ایک کونے میں دبا رکھا ہوا تھا۔ اب اگر میں یہ راز فاش کر بھی دوں تو کچھ نہیں ہوگا۔ یہ جس کا راز تھا وہ فوت ہوگیا ہے۔ تین سال گزر گئے ہیں۔ وہ اپنے خاندان کا آخری فرد تھا۔ دوسرا خاندان جس کے ساتھ اس راز کا تعلق تھا، وہ بھی سمجھو ختم ہی ہوگیا۔

یہ بہت پرانا واقعہ ہے۔ ہم اس وقت نوجوان ہوا کرتے تھے۔ آج اپنی اولاد کی اولاد نوجوانی کو پہنچ رہی ہے۔ میں یہ کہانی اپنی نوجوانی سے شروع نہیں کروں گا۔ بلکہ بڑھاپے سے شروع کروں گا...... آج سے تین سال اور سات آٹھ مہینے پہلے سے...... اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ راز اب کھلا ہے۔ کبھی کبھار اپنے گاؤں جایا کرتا ہوں۔ کبھی کسی کی وفات اور پھر چالیسویں پر اور کبھی کسی کی شادی اور پھر ولیمے پر۔ باپ بوڑھا ہو جائے تو اس کا گھر میں یہی استعمال رہ جاتا ہے کہ برادری میں کہیں غمی شادی ہو تو سو روپے کا ایک نوٹ دے کر اسے بھیج دیا جاتا ہے کہ یہ وہاں دے دینا۔

ہمارے دور پار کے ایک رشتہ دار کے بچے کا ختنہ تھا۔ اس نے پانچ بیٹیوں کے بعد یہ بیٹا دیا تھا اس لئے اس کی وہ بیٹے کی شادی ہی جیسی خوشیاں منا رہے تھے۔ ختنے پر انہوں نے بارات جتنے لوگ اکٹھے کر لئے تھے۔ میں راولپنڈی سے گیا اور اس تقریب میں شمولیت کی۔ میں نے دو دن اپنے گاؤں میں گزارے۔ اگلی صبح قبرستان چلا گیا۔ اپنے بزرگوں کی قبروں پر اور پھر اپنے دوستوں کی قبروں پر فاتحہ پڑھی۔ ہر قبر پر کوئی نہ کوئی پرانی بات یاد آئی جس کا تعلق مرحوم کے ساتھ تھا۔

ہمارے گاؤں کے قبرستان کے ساتھ ایک وسیع نشیب ہے۔ بارشوں کے موسم میں قبرستان کا پانی اس نشیب میں جمع ہو جاتا ہے اور یہ جوہڑ بن جاتا ہے۔ اسے چھپڑ کہہ لیں، تالاب کہہ لیں۔ اس کے کنارے پر بڑ کا بہت ہی پرانا درخت ہے۔ اس کے کنارے قبرستان کی طرف دس سے پندرہ فٹ تک اونچے ہیں۔ ایک طرف تو یہ دیوار کی طرح سیدھے ہیں اور دوطرف ڈھلانی ہیں۔ بارش برستی ہے تو ان کناروں کے اوپر سے سیلاب کی طرح پانی آتا ہے اور کنارے جو چٹانی یا پتھریلے نہیں بلکہ مٹی کے ہیں، پانی کے ساتھ بہتے رہتے ہیں۔

میری جوانی کے وقت میں یہ نشیب اتنا زیادہ لمبا چوڑا نہیں تھا جتنا اب ہو گیا ہے۔ آدھی صدی کی بارشوں نے اس کے کنارے کو بہا بہا کر اسے بہت وسیع و عریض کر دیا ہے۔ اس نے ان قبروں کے مُردوں کو بھی ننگا کر دیا ہے جو اس کے دیوار جیسے کنارے سے ہٹ کر تھیں۔ کنارے کے وسط میں ہڈیوں کے سالم ڈھانچے پھنسے ہوئے ہیں۔ کچھ عرصے بعد یہ ڈھانچے بھی ہڈی ہڈی ہو کر بہہ جائیں گے۔

میں قبرستان میں ٹہلتا ٹہلتا اس نشیب تک چلا گیا۔ اس کے درمیان میں تھوڑا سا پانی تھا اور اس کے اردگرد خشکی تھی۔ میں اس میں اتر گیا اور دیوار جیسے کنارے کے وسط میں لیٹے ہوئے ڈھانچوں کو قریب سے دیکھنے لگا۔ یہ پانچ تھے اور یہ ہر قبر کی لحد تھی۔ مجھ پر ایسی کیفیت طاری ہو گئی جس میں اداسی تھی اور عبرت بھی۔ دل پر بوجھ سا آ پڑا۔ کچھ اس قسم کے خیال آئے کہ یہ زندہ تھے تو سمجھتے تھے کہ ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ ہم سب اس خوش فہمی میں مبتلا رہتے ہیں کہ جو کچھ ہے یہی زندگی ہے اور موت دوسروں کے لئے ہے، ہمارے لئے نہیں۔ ہم اکثر اکڑ کر چلتے ہیں، اپنے دل کو خوش کرنے کے جتن کرتے ہیں، اپنے اوپر برتری کا احساس طاری کر لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم جیسا کوئی دوسرا ہے ہی نہیں۔ ہمیں یہ سوچ آتی ہی نہیں کہ مرنا بادشاہ کو بھی ہے اور غلام کو بھی اور جب بارش اور طوفان ان کی قبروں کو بہا لے جائیں گے اور ان کے ڈھانچے ننگے ہو جائیں گے تو دیکھنے والوں کو پتہ ہی نہیں چلے گا کہ ان میں ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ بادشاہ کا ہے اور دوسرا غلام کا۔ دونوں کی کھوپڑیوں میں ایک جیسی مٹی بھری ہوئی ہو گی۔ ہڈیاں ایک جیسی ہوں گی۔ قبر میں جا کر شاہ و گدا کی پہچان ختم ہو جاتی ہے۔

''السلام علیکم'' ___ میری پیٹھ پیچھے سے آواز آئی ___ ''تم ہو صابو؟''

میں اس بڑھاپے میں جتنی تیزی سے پیچھے کو گھوم سکتا تھا، گھوما اور اس سے پہلے کہ میں دیکھتا یہ کون ہے، یہ شخص میرے ساتھ بغلگیر ہو گیا اور اس نے مجھے اپنے بازوؤں میں بہت ہی زور سے دبایا۔ میں نے صرف یہ محسوس کیا کہ اس شخص کی داڑھی ہے اور داڑھی خاصی لمبی ہے۔

وہ تو میرے ساتھ چپک گیا تھا۔ الگ ہوا تو میں نے دیکھا۔ وہ میرے بچپن کا دوست رحیما تھا...... عبدالرحیم...... اس کی داڑھی کا ایک بھی بال کالا نہیں رہ گیا تھا۔ بڑھاپے نے اس کی آنکھیں بھی سفید کر دی تھیں۔

''مجھے ابھی ابھی پتہ چلا ہے کہ تم آئے ہو'' ___ اس نے کہا ___ ''کسی نے بتایا کہ تم اِدھر آئے ہو۔ سارا قبرستان پھر آیا ہوں۔ مایوس ہو کر واپس جا رہا تھا تو تم پر نظر پڑ گئی...... اپنے پرانے یاروں کو دیکھ رہے ہو''۔

''ہاں رحیمے!'' ___ میں نے کہا ___ ''دیکھ رہا ہوں۔ یہ ساری قبریں بہہ گئی ہیں۔ یہ ہڈیاں بھی بہہ جائیں گی...... رحیمے یار! میں یاد کرنے کی کوشش کر رہا ہوں کہ یہ کون تھے۔ اس کنارے کے اوپر ذرا فاصلے پر دو تین قبریں ہماری ہوش میں بنی تھیں''۔

''نہ یاد کرو صابو!'' ___ رحیمے نے کہا ___ ''ان میں سے ایک تو مجھے اچھی طرح یاد ہے'' ___ اس نے ہڈیوں کے ایک ڈھانچے کی طرف اشارہ کر کے کہا ___ ''یہ...... یاد کرو...... اس کے جنازے میں تم بھی شامل تھے۔ میں بھی تھا۔ سب تھے...... اکو کو بھول گئے ہو؟...... اکرم!''

''ہاں، ہاں!'' ___ مجھے یاد آ گیا۔

اس کا نام اکرم تھا اور اسے اَکو کہتے تھے۔ ہمارا ہم عمر تھا۔ ایک بار ہمارے ساتھ شکار پر گیا تھا اور بلندی سے پھسل کر سر کے بل گرا اور مر گیا تھا۔ اس وقت اس کی عمر اٹھارہ انیس سال تھی۔ وہ ہماری شکاری پارٹی کا لڑکا نہیں تھا نہ اسے شکار کے ساتھ دلچسپی تھی۔ وہ ہمارا دوست بھی نہیں تھا۔ وہ تو موت تھی جس نے اسے ایک روز ہمارے ساتھ بھیج دیا تھا۔ وہ ہمارے ساتھ ہنستا کھیلتا گیا اور ہم اس کی لاش اٹھا کر لائے تھے۔

''آؤ چلیں صابو!'' ___ رحیمے نے مجھے کہا ___ ''یہ پنجر دیکھ کر دل گھبراتا ہے''۔

''ڈر گئے رحیمے؟''

وہ کچھ بھی نہ بولا۔ میں نے دیکھا کہ اس کی نظریں اُکو کے ڈھانچے پر جمی ہوئی تھیں اور اس کے آنسو بہہ رہے تھے۔ ایسا لگتا تھا جیسے اسے یاد نہیں رہا کہ میں بھی وہاں موجود ہوں۔ میں اسے کہنے لگا تھا کہ آؤ چلیں لیکن اس نے دونوں ہاتھ اپنے چہرے پر رکھ دیے اور وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ میں نے اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔ اس نے سر میرے سینے سے لگا دیا۔ دھاڑیں تھم گئیں اور وہ ہچکیاں لینے لگا۔ ظاہر ہے کہ اسے وہ دوست یاد آ گئے تھے جو فوت ہو گئے تھے۔ میرے بھی آنسو بہہ نکلے۔

''صابو!''___ اس نے کچھ دیر بعد اپنے آپ پر قابو پا کر کہا___ ''آؤ تھوڑی دیر بڑ کے نیچے بیٹھیں گے۔ مدت بعد ملے ہو''۔

ہم بڑ کے درخت کے نیچے جا بیٹھے۔ رحیما بار بار آہ بھرتا تھا۔ میں نے اپنے مرحوم دوستوں کے متعلق ایک جذباتی سی بات شروع کی تو میں نے دیکھا کہ رحیمے کا دھیان کہیں اور تھا۔ اس نے میری پوری بات نہ سنی۔

اُکو کی موت تمہیں یاد ہے صابو؟''___ اس نے پوچھا۔

''یاد کیوں نہیں!''___ میں نے جواب دیا___ ''وہ اونچی دندی سے گرا تھا۔ نیچے زمین سلوں والی تھی۔ وہاں اگر گھوڑا یا سانڈ گرتا تو وہ بھی زندہ نہ رہتا۔ اُکو تو انسان تھا''۔

''تم اسے بھول گئے تھے نا!''___ رحیمے نے کہا___ ''میں نہیں بھولا۔ پچاس سال سے شاید کچھ زیادہ عرصہ گزر گیا ہے۔ اُکو مجھے دن رات کئی کئی بار یاد آتا تھا۔ تم کہتے ہو...... سب کہتے تھے...... کہ وہ دندی سے گر کر مرا تھا...... نہیں صابو! وہ خود نہیں گرا تھا۔ اسے گرایا گیا تھا۔ یہ قتل کا ایک طریقہ تھا''۔

''تمہارا دماغ حاضر ہے رحیمے؟''___ میں نے کہا___ ''وہ اس روز ہمارے ساتھ شکار کھیلنے گیا تھا۔ ہم آگے نکل گئے تھے۔ تم اور اُکو پیچھے رہ گئے تھے اور تمہارے شور مچانے پر ہم تم تک پہنچے تھے۔ نیچے دیکھا۔ اُکو لہولہان پڑا ہوا تھا۔ تم دونوں کے ساتھ تیسرا آدمی کوئی تھا نہیں جو اُکو کو دھکا دے کر بھاگ گیا ہو''۔

''صابو''___ رحیمے نے لمبی آہ بھری اور بولا___ ''میں کچھ ایسا محسوس کر رہا ہوں کہ مجھے خدا کی طرف سے حکم ملا ہے کہ یہ راز دنیا میں چھوڑ کر میرے پاس آنا...... تم

میری جسمانی حالت دیکھ رہے ہو صابو! میں کچھ دنوں کا مہمان ہوں۔ تمہیں شاید خدا ہی نے بھیجا ہے۔ میری بات سن لو اور جب میں مر جاؤں تو ساری دنیا کو سنا دینا''۔

اس نے جب بات کی تو میں سن ہو کے رہ گیا۔ ایسا خیال بھی آیا کہ یہ شخص جھوٹ بول رہا ہے لیکن وہ جھوٹ نہیں بول رہا تھا۔ اس نے مجھے یاد دلایا کہ ہم کس طرح اس روز گاؤں سے نکلے تھے اور راستے میں کیا کیا واقعات پیش آئے تھے۔ میں آپ کو اس دن کی صبح سے بات سناتا ہوں تاکہ آپ کو اصل کہانی سمجھنے میں آسانی ہو۔

جیسا کہ آپ میری کہانیوں میں پڑھتے رہتے ہیں کہ ہم کس طرح گاؤں سے شکار کے لیے نکلا کرتے تھے۔ اسی طرح ہم اس صبح بھی نکلے۔ سورج نکلنے میں ابھی تقریباً آدھا گھنٹہ باقی تھا۔ ایک دو روز پہلے ہم نے شکار کا پروگرام بنایا تھا۔ رحیما ہماری پارٹی کا بڑا پھرتیلا اور دلیر لڑکا تھا۔ وہ بے بیوقوفی کی حد تک دلیر تھا۔ اس کی دلیری اور بے خوفی کے واقعات اگر دو چار ہی ہوتے تو میں سنا دیتا لیکن یہ سب سنانے کے لئے مجھے الگ مضمون لکھنا پڑے گا۔ وہ پھر کبھی سہی۔

ہم جب ایک روز پہلے شکار کا پروگرام بنا رہے تھے تو پہلا سوال یہ سامنے آیا کہ کس طرف جانا چاہئے۔ ہر ایک نے اپنی اپنی تجویز پیش کی۔ رحیمے نے ایک ایسا علاقہ بتایا جہاں ہم کبھی نہیں گئے تھے۔ اس علاقے کو جانتے ضرور تھے۔ ڈراؤنا سا علاقہ تھا، بالکل اجاڑ بیابان۔ زمین تو ہمارے خطے میں کہیں بھی ہموار نہیں لیکن اس علاقے کے خدوخال کچھ اور ہی قسم کے تھے۔ گہرے نشیب تھے جن کے کنارے دیواروں جیسے تھے۔ اوپر کہیں کہیں زمین ہموار تھی۔ ان ہموار ٹکڑوں میں سے بعض تنگ ہوتے ہوتے ایک چوڑی دیوار کی صورت اختیار کر لیتے تھے۔ ان کی بلندی سے ڈر لگتا تھا یوں محسوس ہوتا تھا جیسے آپ دومنزلہ بلکہ سہ منزلہ مکان کی منڈیر پر چلے جا رہے ہوں۔ دونوں طرف گہرے اور وسیع نشیب اور کھڈ تھے۔ درختوں کی بہتات تھی۔

اس علاقے میں ایک کَس (برساتی نالہ) بھی گزرتا تھا جو علاقے کی شکل وصورت کی وجہ سے تھوڑے تھوڑے فاصلے پر مڑتا تھا۔ اس کے کنارے دیواروں کی طرح اونچے تھے جنہیں ہماری زبان میں دندیاں کہتے ہیں۔ یہ سارا علاقہ دندیوں کا ہی تھا۔ ان میں شگاف تھے جو غاروں جیسے تھے۔ ان میں گیدڑ، سیہہ، گوہ اور خرگوش وغیرہ رہتے تھے۔ وہاں

بھیڑیئے بھی تھے لیکن زیادہ نہیں۔

آج کل اس علاقے کے خدوخال ویسے نہیں رہے جیسے میری نوجوانی کے وقتوں پر تھے۔ اتنی مدت کی آندھیوں اور بارشوں نے ٹیلوں اور دندیوں (مٹی کی پہاڑیوں) کو بہا کر اور ان کی مٹی اڑا اڑا کر برابر کر دیا ہے۔ ان کے تودے گرتے اور بارشوں میں بہہ رہے ہیں۔ لوگوں نے درخت کاٹ کاٹ کر ختم کر دیے ہیں۔ بعض پرانے گاؤں اجڑ گئے ہیں اور جو باقی رہ گئے تھے وہ پھیل کر بڑے گاؤں بن گئے ہیں جب سے خاندانی منصوبہ بندی کے چرچے شروع ہوئے ہیں۔ آبادی اتنی بڑھ گئی ہے کہ ہر طرف آدم زاد ہی نظر آتے ہیں اور جن جانوروں اور بھیڑیوں کا ہم شکار کھیلا کرتے تھے۔ وہ غائب ہو گئے ہیں۔

یہ میرا مشاہدہ ہے کہ جب سے نیا تمدن یا نیا کلچر اور دوبئی اور انگلینڈ کا پیسہ دیہات میں آنا شروع ہوا ہے، گھریلو جھگڑے بڑھ گئے ہیں۔ میاں بیوی کے آپس کے جھگڑے جو ہمارے وقتوں میں خال خال ہوتے تھے، اب گھر گھر کا معمول بن گئے ہیں۔ بیویاں روٹھ روٹھ کر میکے جاتی اور آتی رہتی ہیں۔ میاں بیوی کے درمیان عداوت رہتی ہے لیکن بیویاں بچے پیدا کرنے سے باز نہیں آتیں۔

میں بات کسی اور طرف لے گیا ہوں۔ میں اس علاقے کا ناک نقشہ بیان کر رہا تھا اور بات آج کی آبادی پر آ گئی۔ میں ایک بات ضرور کہوں گا۔ آج ہمارا علاقہ ترقی کر گیا ہے۔ پکے مکانوں کی بہتات ہو گئی ہے۔ کوٹھیوں اور بنگلوں جیسے مکان بھی عام ہو گئے ہیں۔ یہ باہر کے پیسے کی برکت ہے۔ دیہات میں کاریں، سکوٹر اور موٹر سائیکل بھی پہنچ گئے ہیں۔ بجلی بھی آ گئی ہے۔ اگر دو دو تین تین دن بجلی بند رہتی ہے تو یہ لوگوں کی قسمت اور اللہ کی مرضی ہے، یہ شکایت تو کوئی نہیں کر سکتا کہ دیہاتی بجلی سے محروم ہیں...... اس قسم کی ترقی تو بہت ہوئی ہے لیکن ہمارے وقتوں والا خلوص اور پیار نہیں رہا۔ بناوٹ اور ڈپلومیسی آ گئی ہے۔ کبھی خیال آتا ہے کہ ان لوگوں سے تو گیدڑ، خرگوش اور بھیڑیئے ہی اچھے تھے۔

میں کہہ رہا تھا کہ رحیمے نے پُرزور طریقے سے کہا کہ اس علاقے میں چلنا چاہیے۔ یہ علاقہ ہمارے گاؤں سے تقریباً نو میل دور تھا۔ رحیما کہتا تھا کہ وہاں بھیڑیئے ہوئے تو مزا ہی آ جائے گا۔ کچھ دن پہلے اس علاقے کی طرف سے آنے والے ایک آدمی نے بتایا تھا

کہ وہاں چار پانچ بھیڑیئے دیکھے گئے ہیں۔ ہمیں چونکہ خطروں سے اور ایڈونچر سے پیار تھا۔ اس لیے ہم نے کہا کہ اُدھر ہی چلیں گے۔

مجھے یہ بھی یاد ہے کہ مہینہ ستمبر کا تھا۔ ہم حسب معمول گاؤں سے اس وقت نکلے جب صبح ابھی دھندلی تھی۔ مجھے یاد ہے کہ اس صبح میرے دل پر بوجھ سا تھا۔ بیس سال کی عمر میں دل پر کسی قسم کا بوجھ نہیں ہوا کرتا لیکن میں صاف طور پر محسوس کر رہا تھا کہ شکار پر جاتے طبیعت میں جو بشاشت اور بے فکری ہوا کرتی تھی، وہ نہیں تھی۔

''اس صبح ایک بات معمول کے خلاف تھی۔ میں جب بھی شکار پر جایا کرتا تھا تو ماں مجھے کوسنوں اور بڑی دلچسپ گالیوں سے رخصت کیا کرتی تھی اور جب وہ میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ دیکھتی تو گالیوں کی رفتار تیز اور اپنی والیوم اونچی کر دیا کرتی تھی۔ والد صاحب بڑی مشکل سے ہنسی پر ضبط رکھتے تھے۔ کبھی ان کی ہنسی نکل جاتی تو توپ کا منہ ان کی طرف ہو جاتا تھا مگر اس صبح میری والدہ بالکل ہی خاموش رہی۔ میری طرف دیکھا ہی نہیں۔ اس کے چہرے پر عجیب سی سنجیدگی تھی۔ اس نے ساتھ لے جانے کے لیے دو پراٹھے اور انڈے پکا کر دسترخوان میں باندھ دیے تھے۔ اس نے صرف اتنی بات کی ___ ''پراٹھے رسوئی میں بندھے پڑے ہیں'' ___ میں نے پہلی بار محسوس کیا کہ آج ماں ناراض ہے۔ اس کی گالیوں میں تو دعائیں ہوا کرتی تھیں۔ گاؤں سے نکلتے ہوئے میرے قدم رکنے لگے اور دل سے جیسے آواز آئی ہو کہ واپس جا صابو، ماں کو راضی کر کے آ۔

میں نے اپنے سب سے زیادہ عزیز دوست شہباز خان کو بتایا کہ میں کیا محسوس کر رہا ہوں۔

''سچ مانا صابو!'' ___ شہباز خان نے کہا ___ ''میری اپنی حالت کچھ ایسی ہی ہو رہی ہے۔ معلوم نہیں وجہ کیا ہے''۔

اس روز ہمارے ساتھ دس یا گیارہ کُتے اور ہم تیرہ چودہ لڑکے تھے۔ سب بکھرے ہوئے جا رہے تھے۔ میں اور شہباز خان اکٹھے چل رہے تھے۔ میرا ایک اور جگری یار افضل ہمارے پاس آ گیا۔ اس کا خونخوار بوہلی اس کے ساتھ تھا۔

''رات بڑا ڈراؤنا خواب دیکھا ہے'' ___ افضل خان نے کہا ___ ''ابھی تک اس کا دل پر اثر ہے...... ایک ویرانہ ہے جس میں بہت سے درخت ہیں۔ ایک درخت یوکلپٹس

جیسا سیدھا اوپر کو اتنا اونچا چلا گیا ہے جیسے آسمان کو چھو رہا ہو۔ اس کی چوٹی سے ہمارے گاؤں کا ایک لڑکا گر رہا ہے۔ وہ ہمارے دوستوں میں سے کوئی ہے، معلوم نہیں کون ہے۔ وہ الٹا سیدھا ہوتا نیچے کو آرہا ہے۔ میں دوڑ کر نیچے جا کھڑا ہوتا ہوں اور بازو آگے کو کر کے کہتا ہوں کہ اسے میں زمین پر نہیں گرنے دوں گا، اپنے بازوؤں پر روک لوں گا، لیکن وہ قریب آتا ہے تو چیل بن جاتا ہے پھر وہ چیل کی طرح چیختا اڑ جاتا اور نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے''۔

''یہ کوئی اتنا ڈراؤنا خواب تو نہیں''۔۔۔ شہباز خان نے کہا۔۔۔ ''تم اتنا ڈر رہے ہو''۔

''آنکھ کھلی تو دل پر خوف تھا''۔۔۔ افضل نے ہنستے ہوئے کہا۔۔۔ ''خوف دراصل یہ تھا کہ وہ لڑکا ہمارے دوستوں میں سے تھا''۔

ہم نے افضل کا یہ خواب اور خوف ہنسی مذاق میں اڑا دیا لیکن صاف پتہ چلتا تھا کہ ہمارے ہنسی مذاق میں کچھ ملاوٹ ہے۔ اتنے میں میری نظر رحیمے پر پڑی تو مجھے یہ دیکھ کر بہت کوفت ہوئی کہ اس کے ساتھ اُکو تھا جس کا پورا نام اکرم تھا۔ آدھی صدی بعد بڑ کے نیچے بیٹھے ہوئے مجھے اس کا ہڈیوں کا پنجر دکھائی دے رہا تھا۔

''یہ کنجر اُکو کس طرح ساتھ آگیا ہے؟''۔۔۔ میں نے شہباز اور افضل سے پوچھا۔

''میرا خیال ہے رحیما اسے ساتھ لایا ہے''۔۔۔ شہباز یا افضل نے کہا۔۔۔ ''اچھا نہیں لگتا ورنہ میں اسے کہہ دوں کہ اُکو یار، تم گھر چلے جاؤ۔ ہمارا تمہارا کوئی جوڑ نہیں، کوئی ساتھ نہیں''۔

''اگر رحیما اسے ساتھ لایا ہے تو میں رحیمے کو جوتے ناروں گا''۔۔۔ میں نے کہا۔

اُکو ہماری محفل کا لڑکا نہیں تھا۔ اس کی ذہنیت اور فطرت ہم سب سے مختلف تھی بلکہ ہم سے بالکل الٹ تھی۔ وہ اوچھا اور چھچھورا تھا۔ اس وقت اس کی عمر اٹھارہ سال کے لگ بھگ تھی۔ میری اور رحیمے کی عمر بیس سال ہوگئی تھی۔ اُکو صوبیدار میجر کا بیٹا تھا۔ ایک تو ان کی اپنی زمین بہت تھی اور نہری علاقے میں کچھ مربعے انگریزوں نے دے دیے تھے۔ آج کل کے صوبیدار اور صوبیدار میجر تعلیم یافتہ اور تہذیب یافتہ لوگ ہوتے ہیں۔ انگریزوں کے وقتوں میں صوبیدار وغیرہ ان پڑھ ہوتے یا دو تین جماعتیں پڑھے ہوئے ہوتے تھے

تھے۔ افسری ان کے دماغ خراب کر دیتی تھی اور وہ اپنے آپ کو تعلیم یافتہ لوگوں سے بھی برتر سمجھتے تھے۔ گاؤں میں آکر وہ حاکموں جیسی اوچھی اور مضحکہ خیز حرکتیں کیا کرتے تھے۔ ان کی دیکھا دیکھی ان کے بیٹے بھی اپنے آپ کو ہر کسی کا حاکم بنا لیتے اور انتہائی بدتمیز ہو جاتے تھے۔

اُکو ایسے ہی ایک صوبیدار میجر کا بیٹا تھا۔ اس میں شائستگی نام کو نہیں تھی۔ بڑوں کا ادب لحاظ اس کی نظروں میں تھا ہی نہیں۔ اس کی سب سے زیادہ بری عادت یہ تھی کہ گاؤں کی جوان لڑکیوں کو گھورتا رہتا تھا۔ اس کے متعلق سنا کرتے تھے کہ نہری علاقے میں اپنے مربعوں پر کبھی کبھار جاتا تھا تو مہینہ ڈیڑھ مہینہ وہیں گزارتا تھا اور مزارعوں کی لڑکیوں کے ساتھ جھک مارتا تھا۔

ہمارے گاؤں میں اس قسم کی حرکات پر بڑی سخت پابندی تھی اور ڈسپلن تھا۔ بڑے چھوٹوں پر نظر رکھتے تھے۔ کسی کا باپ کسی اور کے بیٹے کو کسی غلط حرکت پر دو تین تھپڑ مار سکتا تھا۔ اصل بات یہ تھی کہ گاؤں کی عورت کو ہر شخص اپنے گاؤں کی عزت سمجھتا تھا۔ کچھ ایسی ہی وجوہات تھیں کہ مرد ذہنی اور جسمانی طور پر صحت مند رہتے تھے۔

کہانی تو میں کوئی اور سنا رہا ہوں لیکن ایک بات ذرا واضح کر دوں۔ میں اکثر کہا کرتا ہوں کہ ہمارے وقتوں کے نوجوانوں کے اخلاق اور کردار صاف ستھرے تھے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم نے داڑھیاں رکھی ہوئی تھیں اور ہم ہاتھوں میں تسبیح لیے پھرتے تھے اور جب اذان ہوتی تھی تو ہم کام کاج چھوڑ کر مسجد کو دوڑ پڑتے تھے۔ ہماری نوجوانی کا زمانہ خلافت راشدہ کا زمانہ نہیں تھا کہ ذرا سی بھی کوئی غلط حرکت نہیں ہوتی تھی۔ ایسا ہرگز نہیں تھا لیکن یہ ذلالت اور گھٹیا پن نہیں تھا جو آج دیکھنے میں آرہا ہے۔ ہماری نوجوانی میں بھی عشق و محبت ہوتی تھی لیکن فلمی نہیں یا آج کی طرح فیشن کے طور پر نہیں۔ آج کل تو لڑکا الگ اور لڑکی الگ عشق و محبت کے تین تین چار چار ڈرامے کھیلتے ہیں اور شادیاں کہیں اور ہوتی ہیں۔ بعض لڑکے اور لڑکیاں شادی کے بعد عشق بازی کی ہابی جاری رکھتے ہیں۔

ہمارے وقتوں میں جو محبت ہوتی تھی وہ پاک ہوتی تھی کیونکہ وہ روح کی گہرائیوں میں اتری ہوئی ہوتی تھی۔ ایک بار ہوگئی تو اس میں کوئی تبدیلی نہیں آتی تھی لیکن یہ ہابی نہیں تھی۔ اس پر جانیں قربان کر دی جاتی تھیں۔ منہ بولے بہن بھائی اکثر ملتے تھے۔ مختصر یہ کہ

اس وقت ذہنوں پر جنسیت کا غلبہ نہیں ہوتا تھا۔ ذاتی اور خاندانی وقار اور خودداری کا خیال رکھا جاتا تھا۔ سوچوں اور خیالوں کے زاویے کچھ اور تھے۔

یہ واردات جو میں سنا رہا ہوں، اس سے آج کل کے نوجوانوں پر واضح ہو جائے گا کہ اس وقت کے نوجوانوں کا کردار کیا تھا، میں اَکو کی بات کر رہا تھا کہ وہ آج کل کے نوجوانوں جیسا تھا۔ اسے شکار کے ساتھ یا کسی اور کھیل کے ساتھ کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس کی دلچسپی اپنی ذات کے ساتھ اور گاؤں کی لڑکیوں کے ساتھ تھی۔ اپنے آپ کو وہ حسین جمیل شہزادہ سمجھتا تھا جس پر پریاں بھی عاشق ہوتی تھیں لیکن گاؤں کی لڑکیاں اس کی ہنسی اڑایا کرتی تھیں۔

اس واردات سے ایک سال پہلے میں نے اپنے تین چار دوستوں کے ساتھ اَکو کو راہِ راست پر لانے کی کوشش کی تھی۔ اس نے پہلے تو ہنسی ہنسی میں ہمیں ٹالا۔ ہم اس کے ساتھ بڑے پیار سے بات کر رہے تھے۔ آخر اس نے کھوکھلی اور گھٹیا باتیں شروع کر دیں اور ہمیں اپنی برتری جتانے لگا۔ اس کے بعد ہماری پارٹی کے کسی لڑکے نے اس سے منہ نہیں لگایا۔

ہم میں کوئی ایک بھی لڑکا وہمی نہیں تھا لیکن اس صبح اس لڑکے اَکو کو اپنی پارٹی کے ساتھ دیکھا تو افضل نے کہا۔۔۔ ’’یہ تو نِری نحوست ہے جو ہمارے ساتھ آ گئی ہے‘‘۔

ہم کوئی کاروبار یا تجارت کرنے نہیں جا رہے تھے کہ نحوست سے ہمارا نقصان ہو جاتا یا ہم کسی مقدمے کی پیشی بھگتنے نہیں جا رہے تھے کہ کسی منحوس انسان کی نحوست سے ہم مقدمہ ہار جاتے۔ بات یہ تھی کہ شکار میں خواہ مخواہ ہم خطرے مول لے لیا کرتے تھے۔ اس وقت تک ہمارا ایک دوست مارا جا چکا تھا اور تین بہت بری طرح زخمی ہو چکے تھے، ویسے بھی ہمارا علاقہ خطرناک تھا۔ ٹیلے، ٹیکریاں، گہرے کھڈ اور کھائیاں، زہریلے سانپ اور بچھو ہوتے تھے۔ ہم ڈرتے تھے کہ کوئی حادثہ نہ ہو جائے۔

کچھ اور آگے جا کر میں نے رحیمے کو اشارے سے بلایا اور اس سے پوچھا کہ اَکو کس طرح ساتھ آ گیا۔

’’یار صابو!‘‘۔۔۔ رحیمے نے کہا۔۔۔ ’’میں اسے ساتھ نہیں لانا چاہتا تھا۔ اسے شام کسی سے پتہ چل گیا کہ ہم کل شکار پر جا رہے ہیں۔ رات کو میرے گھر آیا اور کہنے لگا

مجھے بھی شکار پر اپنے ساتھ لے جایا کرو...... میں نے یہ سوچ کر اسے کہہ دیا کہ صبح آ جانا کہ یہ ہماری پارٹی میں شامل ہو گیا تو شاید بندہ بن جائے‘‘۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں نے رحیمے کی بات سن کر کہا تھا کہ اسے تم ہی بندہ بنانے کی کوشش کرو۔ رحیمے نے کہا تھا کہ میں اسے بندے کا پتر بنا دوں گا۔

ہم ایک وسیع و عریض نشیب تک پہنچ گئے۔ اس میں گھاٹی اترتی تھی۔ اس نشیب کے کنارے تین اطراف ڈھلانی اور ایک طرف بالکل سیدھی کھڑی دیوار کی طرح تھے۔ اس دیوار یا ندی میں کئی جگہوں پر شگاف تھے اور یہ کٹی پھٹی تھی۔ ان شگافوں کے اندر ہمارا شکار رہتا تھا۔ نشیب کے وسط میں بارشوں کا پانی جمع تھا۔ اس وجہ سے بھی گیدڑ، خرگوش وغیرہ کے یہاں رہنے کا امکان تھا کہ پانی قریب تھا۔ اب ہم نے اپنے شکار کو باہر نکالنا تھا۔

ہم نشیب میں اترنے ہی لگے تھے کہ کسی جھاڑی سے دو خرگوش نکلے اور آہستہ آہستہ چلتے پھدکتے پانی کی طرف چل پڑے۔ ہمارے کُتے کی نظر ان پر پڑ گئی۔ ایک نے ’’بف‘‘ کی آواز نکال کر اپنے ساتھیوں کو اطلاع دی۔ ہم نے کُتوں کے پٹوں سے زنجیریں کھول دیں۔

’’جلدی اوئے!‘‘۔۔۔ ہمارے ایک ساتھی کی آواز سنائی دی۔۔۔ ’’وہ دیکھو، دو بھیڑیئے!‘‘

ہمارے کُتے کھل چکے تھے اور خرگوشوں کی طرف دوڑ پڑے تھے۔ اس طرف سے جس طرف نشیب کا کنارا دیوار جیسا تھا، دو بھیڑیئے بہت ہی تیز دوڑے آ رہے تھے۔ اِدھر سے کُتے دوڑے جا رہے تھے۔ دونوں خرگوش پانی کے ساتھ ساتھ دوسری طرف بھاگ اٹھے۔ ہم ابھی نشیب میں نہیں اترے تھے۔ بلندی پر کھڑے تماشہ دیکھ رہے تھے۔ آج کل لوگ عشق و محبت کی بے ہودہ فلموں سے دل بہلاتے ہیں اور جھوٹ موٹ کی مار دھاڑ سے لطف اٹھاتے ہیں۔ اگر آپ وہ منظر دیکھتے جو ہم دیکھ رہے تھے تو آپ فلموں پر لعنت بھیجتے۔

ہم دیکھ رہے تھے کہ خرگوشوں تک بھیڑیئے پہلے پہنچتے ہیں یا ہمارے کُتے۔ بھیڑیئے خرگوشوں کے تعاقب میں ایسے مگن تھے کہ انہوں نے کُتوں کی طرف دھیان ہی نہ دیا۔ ہمیں امید تھی کہ ہمارے کُتے پہلے پہنچ جائیں گے اور وہ خرگوشوں کو نظر انداز کر کے بھیڑیوں پر ٹوٹ پڑیں گے اور پھر جو معرکہ ہو گا وہ ہمارے شکار کا نشہ پورا کر دے گا لیکن بھیڑیئے

خرگوشوں کے زیادہ قریب تھے۔ خرگوش بالکل ہی بیوقوف تھے۔ وہ اکٹھے دوڑے جا رہے تھے۔ انہیں الگ الگ ہو جانا چاہیئے تھا۔ دونوں اگر مختلف سمتوں کو بھاگتے تو بھیڑیئے بھی الگ ہو جاتے اور ان کے بچنے کی صورت ہو سکتی تھی۔

ہوا یہ کہ بھیڑیوں نے خرگوشوں تک پہنچ کر ایک ایک پنجہ مارا۔ دونوں خرگوشوں نے لڑھکنیاں کھائیں اور چند سیکنڈ بھی نہیں گزرے تھے ایک خرگوش ایک بھیڑیئے کے منہ میں اور دوسرا دوسرے بھیڑیئے کے منہ میں تھا۔ بھیڑیئے رکے، تب انہیں پتہ چلا کہ کُتوں کی فوج آ رہی ہے۔ انہوں نے خرگوشوں کو منہ میں لیا اور ایسے دوڑے کہ ہم ان کی رفتار پر حیران رہ گئے۔ کُتے بھی تیز تھے لیکن بھیڑیئے نشیب کے دیوار جیسے کنارے کے نیچے مٹی کی ٹیکریوں پر چڑھے، اترے اور غائب ہو گئے۔

ہم سب دوڑے گئے۔ وہاں صورت حال یہ تھی کہ مٹی کی دیوار کے آگے اس کے تودے گر کر ٹیکری بن گئے تھے جس کے پیچھے دیوار میں زمین کے قریب اتنا بڑا سوراخ یا بل تھا جس میں ایک کتا بیٹھ کر اندر جا سکتا تھا۔ دونوں بھیڑیئے اس کے اندر چلے گئے تھے اور کُتے اس کے اندر جانے کی کوشش کر رہے تھے۔ ٹیکری اور دیوار (دندی) کے درمیان اتنے زیادہ کُتوں کے لئے جگہ نہیں تھی۔ کُتے غصے میں تھے کیونکہ بھیڑیئے ان کا شکار اٹھا کر لے گئے تھے۔

کوئی ایک کتا بل کے اندر منہ لے جاتا تو فوراً پیچھے ہٹ آتا۔ ایک کتا اپنا سر اور اگلی ٹانگیں بھی اندر لے گیا۔ یعنی آگے سے اس کا آدھا جسم بل کے اندر چلا گیا تھا۔ اس نے اگلی ٹانگیں دوہری کر رکھی تھیں کیونکہ اسی پوزیشن میں وہ اندر جا سکتا تھا لیکن وہ تڑپنے لگا۔ وہ باہر نکلنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا اور وہ بری طرح چیخ چلا رہا تھا۔ اس کے ساتھی کُتے آگے بڑھ کر اس کی مدد کو پہنچنے کے لیے باری باری اپنے منہ بل میں ڈالتے لیکن بل میں وہ کتا تڑپ رہا تھا۔

آخر کتا بل سے باہر آ گیا۔ یہ دودھ کی طرح سفید بل ٹیریئر کتا تھا لیکن اس کا منہ اور سر لال ہو گئے تھے۔ بھیڑیوں نے اپنے پنجوں اور دانتوں سے اپنے گھر میں اس کا استقبال کیا تھا اور اسے بری طرح لہولہان کر دیا تھا۔ ہمیں ڈر تھا کہ بھیڑیوں نے اس کی آنکھیں نکال دی ہوں گی لیکن آنکھیں بچ گئی تھیں۔ بھیڑیئے اپنے گھر کا دفاع جانفشانی سے کر

رہے تھے۔

ہمیں یہ خطرہ نظر آنے لگا کہ کوئی کتا اندر چلا بھی گیا تو بھیڑیئے اسے چیر پھاڑ کر کھا جائیں گے۔ بھیڑیئے دو سے زیادہ بھی ہو سکتے تھے۔ ہم گرے ہوئے تودوں پر کھڑے تماشہ دیکھ رہے تھے۔ اچانک دور سے بڑی بلند پکار سنائی دی ــــ ''اُکو گر پڑا ہے اوئے...... جلدی آ ؤ اوئے...... اوئے جلدی، اوئے جلدی''۔

آج جب یہ روداد لکھ رہا ہوں تو مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے میری عمر بیس سال ہو گئی ہے اور میں یہ پکار سن رہا ہوں۔ یہ رحیمے کی پکار تھی۔ وہ اس نشیب کے دوسرے کنارے پر کھڑا ہمیں پکار رہا تھا۔ اس کی آواز میں گھبراہٹ تھی۔ میں کچھ حیران سا ہوا تھا کہ ہم کُتوں کے پیچھے نشیب میں اتر آئے تھے مگر رحیما ہمارے ساتھ نہیں آیا۔ بہر حال وہ وقت سوچنے کا نہیں تھا۔ ہم کُتوں کو وہیں چھوڑ کر اس طرف دوڑ پڑے۔

ہم جانتے تھے کہ ''گر پڑا ہے'' کا مطلب یہ نہیں کہ چلتے چلتے ٹھوکر لگی اور وہ گر پڑا ہے۔ اس پر شور مچانے کی ضرورت نہیں تھی۔ اُکو یقیناً بلندی سے گرا ہو گا۔

رحیما دوسری طرف کی گھاٹی پر کھڑا تھا۔ ہم سب بہت تیز دوڑتے وہاں پہنچے اور گھاٹی چڑھ گئے۔ اس طرف تو ہم ابھی گئے ہی نہیں تھے جو دیکھتے کہ اُدھر کیا ہے۔ اب جا کے دیکھا کہ تو اُدھر کچھ اور ہی منظر تھا۔ میں بیان کرنے کی کوشش کرتا ہوں، آپ تصور میں لانے کی کوشش کریں کیونکہ میرا بیان بہت کمزور ہو گا۔ اس طرف نشیب کے باہر چند گز جگہ ذرا ہموار تھی۔ اس سے آگے زمین ختم ہو جاتی تھی۔ وہاں کھڑے ہو کر یوں لگتا تھا جیسے تین منزلہ مکان کی آخری چھت پر کھڑے نیچے دیکھ رہے ہوں۔ بلندی بلا مبالغہ تین منزل مکان جتنی تھی۔

نیچے برساتی نالہ تھا جسے ہماری زبان میں گس کہتے ہیں۔ اس کے ایک کنارے پر تھوڑا تھوڑا پانی بہہ رہا تھا۔ اس طرف جس طرف ہم اوپر کھڑے نیچے دیکھ رہے تھے۔ گس میں چھوٹی چھوٹی چٹانیں تھیں۔ یہ سلوں جیسی تھیں۔ اسے آپ گس کا فرش یا تہہ کہہ لیں۔ اگر آپ اس قسم کی چٹانیں دیکھنا چاہیں تو راولپنڈی سے لاہور کی طرف سے جاتے ہوئے آپ گوجر خان سے گزریں گے۔ چار کلو میٹر آگے ایسا ہی ایک گس آتا ہے۔ اس کے قریب بھائی خان نام کا ایک گاؤں ہے۔ اس پر دو پل ہیں۔ ایک پرانا اور ایک نیا۔ اس کو

دیکھیں۔ آپ کو اس کا فرش چٹانی دکھائی دے گا۔

وہ گس ایسا ہی تھا۔ ہم نے نیچے دیکھا تو دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ نیچے اُکو چٹانی فرش پر پڑا تھا۔ اس پتھر جیسی جگہ کا رنگ ہلکا سلیٹی تھا۔ اُکو کے سر اور نہ جانے کہاں کہاں سے خون بہتا اور چٹان پر بکھرتا جا رہا تھا۔ اتنی بلندی سے اتنی سخت جگہ پر گر کر اس کے زندہ رہنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ ہمیں کُتوں کی تو ہوش ہی نہ رہی۔ دائیں بائیں دیکھا تو کچھ دور ایک گھاٹی نظر آئی جو گس میں اترتی تھی۔ ہم اس طرف دوڑ پڑے اور گس میں چلے گئے۔ اُکو کا سر کھل گیا تھا اور اس کے چہرے کی حالت بڑی ڈراؤنی ہو گئی تھی۔ نبض دیکھی بند ہو چکی تھی۔

اس کی لاش ہمارے ایک دوست نے اٹھا کر کندھے پر ڈال لی۔ ہمارے کچھ دوست کُتوں کو واپس لانے کے لئے چلے گئے۔ میں سوچ رہا تھا کہ ہم سب کو کیا سزا ملے گی۔ سب سے پہلے تو ہمارے لئے شکار ممنوع قرار دیا جائے گا...... یہ بعد کی بات تھی۔ میں پہلے ہی محسوس کر رہا تھا کہ آج کوئی حادثہ ہو گا۔ افضل کا خواب سچا ہو گیا تھا۔ اس نے ایک بہت اونچے درخت سے ایک آدمی کو گرتے اور چیل بن کر اڑتے اور غائب ہوتے دیکھا تھا۔ اُکو اس دنیا سے اڑ کر غائب ہو گیا تھا۔

"یہ گرا کیسے تھا رحیمے؟"___ ہم نے پوچھا۔

"یہ میرے ساتھ آیا تھا اس لئے میں اس کے ساتھ رہا"___ رحیمے نے کانپتی اور روتی ہوئی سی آواز میں کہا___ "اسے شکار کے ساتھ ذرا سی بھی دلچسپی نہیں تھی۔ اسے تو موت ہمارے ساتھ لے آئی تھی۔ تم سب جب کُتوں کے پیچھے پیچھے نیچے کو دوڑے تھے، اس وقت میں بھی دوڑنے لگا اُکو سے کہا کہ میرے ساتھ آؤ۔ میرا کتا پہلے ہی کُتوں کے ساتھ نیچے چلا گیا تھا۔ اُکو نے مجھے روک لیا۔ کہنے لگا، آؤ اُدھر آگے چلیں، کُتوں کے ساتھ دوڑنا مجھے اچھا نہیں لگتا۔ میں نے اس کی بات مان لی اور ہم اُدھر چلے گئے۔ آگے گس کی ڈنڈی تھی۔ میں نے اسے کہا کہ آگے نہ جانا، ڈنڈی کچی ہے، گر پڑو گے، لیکن اس کے دن پورے ہو چکے تھے۔ اسے تو خدا نے اشارہ دے دیا تھا کہ آگے ہو جاؤ اور گرو۔ میں اسے آگے ہونے سے منع کر ہی رہا تھا کہ وہ آگے جا کر جھک کر نیچے دیکھنے لگا۔ اس کے پاؤں کے نیچے سے چھوٹا سا تودہ سرک گیا اور اُکو اپنے آپ کو سنبھال نہ سکا۔ آگے کو گرا اور......"

لمبی باتیں کیا سناؤں کہ ہم نے کُتوں کو کس طرح قابو کیا اور اُکو کی لاش کس طرح اٹھا کر لائے، لاش ہر لڑکے نے باری باری کندھے پر ڈال کر اٹھائی۔ سب کے کپڑے خون آلود ہو گئے اور جب ہم گاؤں میں پہنچے تو کہرام مچ گیا۔ اُکو جیسا کیسا بھی تھا وہ ماں باپ کا اکلوتا اور نوجوان بیٹا تھا۔ ہم سب کی مائیں ہمارے کپڑوں پر خون دیکھ کر ہم پر ٹوٹ پڑیں۔ ہر ماں کا خیال تھا کہ اس کا بیٹا زخمی ہے۔ ماؤں نے جب دیکھا کہ ہم میں سے کسی کو کچھ نہیں ہوا تو انہوں نے ہمیں گالیاں دینی شروع کر دیں۔ اُکو کی ماں بے ہوش ہو گئی۔ اس کی بہنوں نے سینہ کوبی کے ساتھ بال بھی نوچ لیے۔

گاؤں میں کربلا کا منظر تھا۔ بڑوں میں سے بعض ہمیں گالیاں دے رہے تھے اور کچھ ہماری وکالت کر رہے تھے۔ حالت تو بے چارے اس باپ کی دیکھنے والی تھی جس کا اکلوتا بیٹا مر گیا تھا۔ مرنے والے کا باپ ہونے کے علاوہ وہ ریٹائرڈ صوبیدار میجر بھی تھا۔ اس زمانے میں صوبیدار میجر گاؤں میں آ کر میجر جنرل بن جاتے تھے۔ اس شخص نے تو ہم سب پر قتل کا الزام لگا دیا اور گالی گلوچ پر بھی اتر آیا۔

سب سے پہلے راجہ شہباز خان کے والد صاحب نے اس کا منہ بند کرنے کے لئے کہا کہ ہم اپنے بیٹوں کو اچھل کود اور دوڑنے بھاگنے سے کبھی نہیں روکیں گے۔ یہ مرد ہیں عورتیں نہیں۔ جس باپ کو پسند نہیں وہ اپنے بیٹے کو گھر بٹھا لے اور ان لڑکوں کے ساتھ نہ جانے دے۔

پھر میرے والد صاحب بولے۔ انہوں نے بھی صوبیدار میجر کو بہت کچھ کہا اور یہ بھی کہہ دیا کہ آپ نے ہمارے بیٹوں کو ماں بہن کی گالیاں دے ڈالی ہیں جو ہم نے اس لئے برداشت کر لی ہیں کہ آپ کا جوان بیٹا مارا گیا ہے۔ اگر آپ یہ کہتے ہیں کہ آپ کے بیٹے کو میرے بیٹے نے یا کسی کے بھی بیٹے نے مارا ہے تو میں اسے آپ کے سامنے کھڑا کر دیتا ہوں۔ آپ کے پاس پستول بھی ہے دونالی بندوق بھی ہے۔ اسے گولی مار دیں۔

ہم لڑکوں کو شہ مل گئی۔ ہم نے بتایا کہ اُکو کو ہم ساتھ نہیں لے گئے تھے نہ وہ ہمارا دوست تھا۔ وہ اپنے آپ رحیمے کے ساتھ چل پڑا تھا۔ ہم نے تو گاؤں سے دور جا کر دیکھا تھا کہ اُکو بھی ساتھ آ رہا ہے...... رحیما بول پڑا۔

"اُکو نے مجھے کہا تھا کہ وہ ساتھ چلنا چاہتا ہے"___ رحیمے نے کہا___ "میں نے

کہا کہ تم ہمارے ساتھ نہ چلو، بہت بھاگ دوڑ کرنی پڑتی ہے اور یہ خطرہ بھی ہے کہ تم زمین سے واقف نہیں۔ ہم تو جانتے ہیں کہ کہاں پاؤں دبا کر رکھنا ہے اور کہاں بچا کر رکھنا ہے لیکن وہ میری بات نہ سمجھا۔ میں نے اسے اپنے ساتھ رکھا'' ___ رحیمے نے سب کو سنایا کہ اُکو گرا کس طرح ہے۔ پھر اس نے کہا ___ ''میں اس کی خاطر اپنے دوستوں کے ساتھ کتوں کے پیچھے نہ گیا، پھر اسے منع کیا کہ ڈنڈی کے کنارے پر نہ جانا لیکن وہ نہ مانا اور گر پڑا''۔

''اس میں کسی کا قصور نہیں'' ___ امام مسجد نے کہا ___ ''اس کی ایسے ہی لکھی تھی۔ پہلے یہ کبھی ان لڑکوں کے ساتھ نہیں گیا تھا۔ آج موت اسے لے گئی۔ آپس میں نہ لڑو۔ یہ اللہ کے کام ہیں جن میں کوئی بندہ دخل نہیں دے سکتا''۔

آہستہ آہستہ کھچاؤ ختم ہو گیا۔ اُکو کو دوسرے دن دفن کیا گیا۔ اس کی قبر اس جگہ بنی جو نشیب کے قریب تھی، اور اب آدھی صدی بعد رحیما اور میں بڑ کے درخت کے نیچے بیٹھے ایک بار پھر اُکو کو دیکھ رہے تھے لیکن اب وہ ہڈیوں کا ڈھانچہ تھا اور اگلی بارشوں نے ان ہڈیوں کو بھی بہا لے جانا تھا۔

یہ تو تھی اس شکاری مہم کی کہانی جس میں اُکو گر کر مر گیا تھا لیکن آج رحیما کہہ رہا تھا کہ وہ گرا نہیں اسے گرایا گیا تھا...... میں ایک اور بات سنا دوں جو پہلے نہیں سنا سکا۔ اُکو کی وفات کے بعد رحیمے میں کچھ تبدیلیاں آنے لگی تھیں۔ ہم اُکو کے چالیسویں کے بعد شکار پر گئے تھے اور رحیمے نے جانے سے انکار کر دیا تھا۔ پھر اس نے اپنا کتا ایک دوست کو دے دیا تھا اور اس نے پانچوں وقت باقاعدہ نماز پڑھنی شروع کر دی اور جوں جوں وقت گزرتا گیا وہ مذہب میں گم ہوتا گیا۔ اس نے داڑھی رکھ لی تھی۔ اس کی شادی ہوئی۔ ہوتا تو یوں ہے کہ بیویاں خاوندوں کی خدمت کیا کرتی ہیں لیکن رحیمے نے اپنی بیوی کی بہت خدمت کی۔ وہ اولاد سے محروم رہا۔ رشتہ داروں نے اسے بہت کہا کہ وہ اولاد کے لئے دوسری شادی کر لے، لیکن وہ نہ مانا۔ کہا کرتا تھا کہ اولاد اللہ کے اختیار میں ہے، اولاد نہ ہو تو اس میں خاوند یا بیوی کا قصور نہیں ہوتا۔ سنا تھا کہ بیوی نے بھی رحیمے کو کہا تھا کہ وہ دوسری شادی کر لے لیکن رحیمے نے اسے ڈانٹ دیا تھا۔

پچاس سال کی عمر میں رحیمے کی بیوی مر گئی۔ وہ سات آٹھ مہینے بیمار رہی تھی۔ رحیما

کوئی غریب آدمی نہیں تھا۔ اس کی خاصی زمین تھی۔ بیماری کے دوران اس نے بیوی کی بہت خدمت کی اور اس کے علاج پر اتنا روپیہ خرچ کیا کہ کچھ زمین بھی بیچ ڈالی تھی لیکن بیوی جانبر نہ ہو سکی۔ اس کے بعد رحیمے کی عمر (بائیس تیئس سال) تنہائی میں گزری۔ اس کی بیوی دوسرے گاؤں کی رہنے والی تھی۔ اپنے گاؤں میں رحیمے کا اب کوئی رشتہ دار نہیں تھا۔ گاؤں کی ایک عورت نے جو ایک کامے کی بیوی تھی، رحیمے کی بہت خدمت کی تھی۔ اس کا کھانا وہی پکاتی اور کپڑے بھی وہی دھوتی تھی۔

رحیمے کے ساتھ میری آخری ملاقات اپنے گاؤں کے قبرستان میں ہوئی جس میں ہڈیوں کے ننگے ڈھانچے دیکھ رہا تھا۔

''میں اُکو کی موت کا راز تمہارے حوالے کرنا چاہتا ہوں صابو!'' ___ اس نے کہا ___ ''اب یہ راز کھول دو گے تو بھی کیا ہو جائے گا۔ بات سن لو۔ یہ تو تمہیں یاد ہو گا کہ اُکو کس قماش کا لڑکا تھا۔ کنوئیں کی طرف جا کر پانی بھرتی ہوئی عورتوں کو دیکھتا رہتا تھا۔ اس نے جب دیکھا کہ گاؤں کی کوئی لڑکی اس کے ساتھ منہ لگانے کو تیار نہیں تو اس نے غریب گھروں کی لڑکیوں پر ڈورے ڈالنے شروع کر دیے۔ انہیں پیسے وغیرہ دے کر خراب کرتا تھا......

''تنور والی فاطی تمہیں یاد ہے صابو؟...... اس کا خاوند مر گیا تھا۔ اس کی ایک ہی بیٹی تھی۔ ان دنوں یہ لڑکی سولہ سترہ سال کی تھی۔ اچھی شکل صورت والی لڑکی تھی۔ ایک روز فاطی مجھے ملی اور رو پڑی۔ اس نے بتایا کہ اُکو اسے اور اس کی بیٹی کو تنگ کرتا ہے۔ اُکو ان کے گھر چلا جاتا اور ماں بیٹی کو پیسے دکھاتا اور طرح طرح کے لالچ دیتا تھا اور فاطی کی بیٹی کو اپنے پاس بٹھانے کی کوشش کرتا تھا۔ فاطی ڈرتی اُکو کے ماں باپ سے شکایت نہیں کرتی تھی کہ وہ سچ نہیں مانیں گے......

''جب اُکو نے دیکھا کہ ماں بیٹی اس کی بات نہیں مان رہیں تو اس نے انہیں دھمکیاں دینی شروع کر دیں۔ ایک دھمکی یہ تھی کہ میں اس لڑکی کا رشتہ نہیں ہونے دوں گا۔ رشتے کے لئے کوئی آیا تو انہیں کہوں گا کہ لڑکی بدچلن ہے اور اس کی ماں اسے اونچی ذاتوں کے آدمیوں سے پیسے لے کر چلاتی ہے......

''مجھے بہت طیش آئی۔ میں سوچنے لگا کہ اُکو کو کس طرح لگام ڈالوں۔ دو دن بعد

فاطی پھر ملی۔ کہنے لگی کہ آج دوپہر کے وقت میں تنور ٹھنڈا کر کے گھر گئی تو گھر میں عجیب حال دیکھا۔ اندر کمرے سے آوازیں آرہی تھیں۔ میں اندر گئی تو دیکھا کہ اُکو نے میری بیٹی کو گرایا ہوا ہے، بیٹی رو رہی اور ہاتھ پاؤں مار رہی ہے اور اُکو اسے زبردستی ننگا کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ میں پہنچ گئی۔ اللہ نے میری بیٹی کی عزت بچالی مگر اُکو یہ دھمکی دے کر چلا گیا کہ میں تمہاری بیٹی کو اغوا کرا کے راولپنڈی چکلے میں بیچ آؤں گا......

''فاطی کہتی تھی، مجھے بتاؤ کیا کروں، گاؤں سے چلی جاؤں؟ اُکو کے باپ کو بتاؤں؟ معلوم نہیں صابو! مجھے خدا کا اشارہ ملا یا یہ میری روح کا اشارہ تھا کہ میں نے فاطی سے کہا کہ نہ گاؤں سے جاؤ نہ اُکو کے باپ کو بتاؤ۔ میرے اللہ کو منظور ہوا تو اُکو سے تمہاری جان چھوٹ جائے گی لیکن کسی کو یہ پتہ نہ چلنے دینا کہ تم نے یہ بات مجھے بتائی تھی۔ تمہاری زبان پر ایک لفظ نہ آئے......

''تم پوچھو گے صابو، کہ میں نے تمہیں اور دوسرے دوستوں کو کیوں نہیں بتایا؟...... اس لیے نہیں بتایا کہ اُکو کے ساتھ تمہاری بات ہوئی تو معاملہ بگڑ جائے گا اور فاطی اور اس کی بیٹی کی شامت آجائے گی۔ میں نے اس لئے بھی تم سے بات نہ کی کہ میرے دل میں ایک خطرناک ارادہ آگیا تھا۔ میں نے یہ فرض اپنے اوپر لے لیا کہ اس یتیم اور بے سہارا لڑکی کی بےعزتی کا انتقام میں ہی لوں گا......

''میں نے انتقام لینے کے طریقے سوچنے شروع کر دیے۔ سوچ سوچ کر ایک ہی طریقہ صحیح لگتا تھا کہ اُکو کو شکار پر لے چلتے ہیں۔ بات تو بہت پرانی ہوگئی ہے پھر بھی یاد کرنے کی کوشش کرو صابو! وہ میں تھا جس نے تم سب کو کہا تھا کہ شکار پر گئے عرصہ ہی ہوگیا ہے۔ تم سب فوراً تیار ہو گئے تھے۔ پھر یہ بات ہوئی تھی کہ کس طرف چلیں۔ وہ میں ہی تھا جس نے یہ علاقہ بتایا اور کہا تھا کہ ادھر چلیں گے۔ میں اپنے چچا کے ساتھ دو مرتبہ اس علاقے سے گزرا تھا۔ میں نے جو طریقہ سوچا تھا، اس کے لیے یہی علاقہ صحیح تھا......

''ہم شکار کے لیے نکلے تو اُکو کو میرے ساتھ دیکھ کر تم نے مجھ سے پوچھا تھا کہ یہ کس طرح آگیا ہے۔ میں نے جھوٹ بولا تھا کہ اس نے ضد کی تھی کہ میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گا۔ ہوا دراصل یہ تھا کہ میں نے تین چار دنوں میں اس کی تعریفیں کر کر کے اسے دوست بنالیا تھا اور اسے شکار پر چلنے کے لئے میں نے تیار کیا تھا۔ میں نے اسے کہا تھا کہ

ایک بار چل کر دیکھے کتنا مزہ آتا ہے۔ وہ چل پڑا......

''خرگوشوں کے پیچھے کتوں اور بھیڑیوں کو دوڑتے دیکھ کر اُکو بہت خوش ہوا۔ پھر جب تم سب کتوں کے پیچھے دوڑتے ہوئے گھاٹی اتر گئے تو اُکو نے مجھے کہا کہ چلو ہم بھی چلتے ہیں۔ میں نے اسے کہا کہ آؤ میں تمہیں ایک اور چیز دکھاتا ہوں۔ وہ کتوں اور بھیڑیوں کا تماشہ دیکھنا چاہتا تھا لیکن میں اسے بہلا پھسلا کر اس جگہ لے گیا جہاں سے وہ گرا تھا۔ وہ خود وہاں تک نہیں گیا تھا نہ میں نے اسے روکا تھا۔ میں نے تو اسے کہا تھا کہ اور آگے ہو کر نیچے دیکھے۔ وہ اور آگے ہو گیا۔ میں اس کے قریب چلا گیا۔ وہ ذرا جھک کر نیچے دیکھ رہا تھا۔ میں نے پیچھے اسے دھکا دیا اور وہ پتھریلی جگہ پر گرا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ زندہ نہیں رہ سکتا۔ تم نے وہ بلندی دیکھی ہے اور نیچے زمین بھی دیکھی ہے......

''میرا فرض ادا ہو گیا۔ میں نے یتیم اور کنواری لڑکی کی بےعزتی کا انتقام لے لیا تھا۔ کسی کو شک تک نہ ہوا کہ اُکو کو میں نے قتل کیا ہے۔ اس کا مجھے ذرا جتنا افسوس نہیں تھا لیکن اس کی ماں اور بہنوں کو میں روتا دیکھتا اور ان کے بین سنتا تھا تو میرے دل کو بہت تکلیف ہوتی تھی۔ میں کہتا تھا کہ اللہ کسی کو ایسی بےحیا اور گھٹیا اخلاق کی اولاد نہ دے۔ میں جب فاطی اور اس کی بیٹی کو دیکھتا تو مجھے اطمینان ہو جاتا تھا کہ میں نے کوئی گناہ نہیں کیا۔ ایک اثر میرے دل پر ایسا ہوا کہ میں نے اللہ کی عبادت شروع کر دی۔ میں صرف یہ دعا مانگتا تھا کہ میں نے گناہ کیا ہے تو اللہ مجھے معاف کر دے۔ دل میں جو بےچینی ہوتی تھی وہ نماز اور دعا سے ختم ہو جاتی اور میری روح کو بھی سکون مل جاتا تھا۔ اس طرح میں پکا مولوی بن گیا......

''تمہیں یاد ہے کہ فاطی کی بیٹی کی شادی ہو گئی تھی۔ پھر میری بھی شادی ہو گئی۔ اولاد کی مجھے بہت خواہش تھی جو اللہ نے میری قسمت میں لکھی ہی نہیں تھی۔ رشتہ داروں نے کہا کہ دوسری شادی کر لو۔ میں نے اپنے دل سے کہا کہ میں اپنی بیوی کا دل نہیں دکھاؤں گا۔ اس کا مجھے انعام یہ ملا کہ زندگی سکون سے گزری...... میں ہڈیوں کے اس پنجر کو پہلے بھی دیکھ چکا ہوں۔ میں کہا کرتا ہوں کہ انسان اپنا یہ انجام سوچ لے تو وہ معمولی سا بھی گناہ نہ کرے......

''میری بیوی مرگئی تو میں اکیلا رہ گیا تھا۔ فاطی کبھی کی مر چکی تھی۔ اس کی بیٹی

بڑھاپے میں داخل ہو گئی تھی۔ اس نے مجھے کہا کہ ہانڈی روٹی اور گھر کے کام کاج کا فکر نہ کرنا، میں کر دیا کروں گی۔ اس نے میری بہت خدمت کی ہے اور ابھی تک کر رہی ہے۔ اس کے دو بیٹے جوان ہو گئے ہیں۔ وہ بھی میری بہت خدمت کرتے ہیں۔ کبھی مجھے شک ہوتا کہ فاطی اور اس کی بیٹی کو معلوم ہو گیا تھا کہ اَکو کو میں نے قتل کیا ہے......

''میں اب کچھ دنوں کا مہمان ہوں صابو! یہ راز تمہیں دے دیا ہے''۔

میں اپنی طرف سے ایک بات کہوں گا۔ اب تو معاشرے کے انداز بدل گئے ہیں۔ ریڈیو، ریکارڈ پلیئر، ٹی وی اور وی سی آر نے ہمارے علاقے کا کردار ہی بدل ڈالا ہے۔ یہ وہ علاقہ ہے جہاں کے لوگ صرف شک کی بناء پر قتل کر دیا کرتے اور غیرت کے نام پر نعرے لگا کر پھانسی چڑھا کرتے تھے۔ اَکو کا قتل ہمارے لئے کوئی حیران کن واقعہ نہیں تھا۔ دوسری بات یہ ہے کہ رحیما ضرورت سے زیادہ دلیر تھا۔ ڈر اور خوف کا تو وہ مطلب ہی نہیں سمجھتا تھا۔

میں دوسرے دن گاؤں سے راولپنڈی آ گیا۔ چھ سات مہینے بعد ایک روز اطلاع ملی کہ رحیما فوت ہو گیا ہے۔ میں اس کے جنازے پر نہ پہنچ سکا۔ قل میں شریک ہو گیا۔ پتہ چلا کہ وفات سے ایک مہینہ پہلے رحیمے نے اپنی زمینیں گاؤں کے تین غریب سے کسانوں میں تقسیم کر دی تھیں۔

+ + +

گالہڑ شاہ کا بالکا

''میں بدکار سہی، گناہگار سہی''۔۔۔ باباٹل نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا تھا۔۔۔ ''لیکن میں مسلمان تو ہوں، اور کوئی مسلمان اس خانہ کعبہ کی بے حرمتی برداشت نہیں کر سکتا جس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھی جاتی ہے اور اس طرف پاؤں کرنے کو بھی گناہ سمجھا جاتا ہے''۔

گالہڑ شاہ کا بالکا

آج سے غالباً اکتیس بتیس برس پہلے کی بات ہے، دوپہر کا وقت تھا اور میں ذرا کمر سیدھی کرنے کے لئے لیٹ گیا تھا۔ باہر سے محلے کے ایک لڑکے کی بڑی ہی بلند آواز آئی___ "تایا صابو......تایا صابو! آپ کا مہمان آیا ہے......شہر سے آیا ہے"۔

میں ہڑبڑا کر اٹھا بیٹھا اور سوچنے لگا کہ مجھ سے ملنے شہر سے کون آسکتا ہے۔ یہی سوچتا ہوا میں باہر والے دروازے تک پہنچا تو لڑکے کے ساتھ ایک شخص کھڑا نظر آیا۔ صحت مند چھ فٹ کے لگ بھگ قد، رنگ گندمی، اس نے خاکی رنگ کی استری شدہ پتلون اور آدھی بازوؤں والی بشرٹ پہن رکھی تھی۔ اس کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔ اس کی آنکھیں ذہانت کی چمک لئے ہوئے تھیں اور مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے اس کی نظریں ایکس ریز کی طرح میرے اندر تک کو ٹٹول رہی ہیں۔

"السلام علیکم جی!"___ آنے والے نے بڑی نرم اور میٹھی آواز میں سلام کیا اور مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھا دیا۔ میں نے بڑی گرمجوشی سے اس سے ہاتھ ملایا تو مجھے یوں لگا جیسے میرا ہاتھ کسی لوہے کے شکنجے میں آ گیا ہو۔ میں کسی شہری سے ایسے دست پنجے کی توقع نہیں رکھتا تھا۔

میں نے فوراً مہمان کو بیٹھک میں بٹھایا اور دیہات کی روایات کے مطابق مہمان کی خدمت خاطر کی۔ پھر میں نے اس سے پوچھا کہ میں اس کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔

"مجھے عنایت اللہ کہتے ہیں"___ اس نے اپنا تعارف کرایا___ "میں لاہور کے ایک پرچے "حکایت" کا مدیر ہوں آپ کے پاس......"

یہ عنایت اللہ سے میری پہلی ملاقات تھی۔ اس نے بتایا کہ وہ میرے پاس شکار کی کہانیاں سننے کے لئے آیا ہے جن کو وہ اپنے پرچے میں چھاپے گا۔

"مگر آپ کو تو آدم خور شیروں کی کہانیوں کی ضرورت ہو گی"___ میں نے کہا۔

"میں تو کتوں سے گیدڑوں اور خرگوشوں وغیرہ کا شکار کھیلتا رہا ہوں وہ بہت پرانی بات

ہے۔ اب تو زمانہ بدل گیا ہے، لوگوں کی سوچ بدل گئی ہے۔ لوگ انگریز شکاریوں کی کہانیاں پڑھتے ہیں۔ ہمارے پسماندہ علاقے کی اتنی قدیم کہانیاں کون پسند کرے گا؟"

"مجھے اور لوگوں نے بھی سمجھایا ہے"___ عنایت اللہ نے مسکرا کر کہا___ "کہ پڑھنے والے انگریزی کی ترجمہ کہانیاں پسند کرتے ہیں۔ مقامی کہانیاں شائع کرو گے تو پرچے کو لے ڈوبو گے"___ اس نے میری طرف دیکھا اور پھر بڑے عزم سے کہا___ "میں یہ کام ضرور کروں گا چاہے پرچے کے ساتھ میں خود بھی ڈوب جاؤں"۔

اور پھر میری پہلی کہانی چھپ گئی جو لوگوں نے اتنی پسند کی کہ مجھے اور خود عنایت اللہ کو اس کی توقع نہیں تھی۔ پھر یہ سلسلہ چل نکلا اور عنایت اللہ ہر ماہ مجھ سے کہانی کا مطالبہ کرنے لگا جو میں کسی حد تک پورا کرتا رہا۔ بقول عنایت اللہ، لوگ آدم خوروں کی کہانیاں بھول گئے ہیں اور صابو کی کہانیوں کا مطالبہ کرنے لگے ہیں۔

یوں عنایت اللہ نے مجھے ادیب بنا دیا۔ کتوں کے پیچھے کتوں کی طرح بھاگنے والے دیہاتی کے ہاتھ سے کتے کی زنجیر لے کر قلم تھما دیا۔ بھلا کتے اور قلم کا کوئی جوڑ بنتا ہے؟ عنایت اللہ نے یہ بھی کر کے دکھا دیا۔

پھر میری اور عنایت اللہ کی دوستی پکی ہو گئی اور ہم بے تکلف دوست بن گئے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ میرے دوست میرا ساتھ چھوڑ کر اللہ کو پیارے ہوتے گئے۔ میں قبرستان میں جاتا اور کچھ وقت گزار کر، قبروں کی جھاڑ پونچھ کر کے چلا آتا۔

پھر نومبر 99ء کے منحوس مہینے میں میرا آخری ساتھ بھی چھوٹ گیا۔ کانوں سے سن کر بھی یقین نہ آیا کہ عنایت اللہ چلا گیا ہے۔ یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ جو اس دنیا میں آتا ہے۔ اسے ایک روز واپس بھی جانا ہوتا ہے۔ فرق یہ ہے کہ مجھ جیسے لوگوں کے جانے سے دنیا میں کسی کو فرق نہیں پڑتا جبکہ عنایت اللہ جیسا آدمی اس دنیا سے جاتا ہے تو اس کی بہت کمی محسوس ہوتی ہے۔

عنایت اللہ مجھ سے چھوٹا تھا لیکن ہماری بے تکلفی لنگوٹیے یاروں والی تھی۔ ایک بار ہم بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ بات ایک دوسرے کی موت کے بعد کے حالات کے متعلق چل نکلی۔

"تم خوش نصیب ہو عنایت بھائی!"___ میں نے کہا___ "دنیا سے جاؤ گے تو اپنے پیچھے اچھی یادیں چھوڑ جاؤ گے۔ تم ایسی تحریریں اور کتابیں اپنے پیچھے چھوڑ جاؤ گے جو

شہیدوں اور غازیوں کو، اپنی روایات کو اور ان کے ساتھ تمہیں بھی زندہ رکھیں گی...... میں اپنے پیچھے کیا چھوڑ کر جاؤں گا...... کتوں کی کہانیاں...... تم نے میرے ساتھ بڑی زیادتی کی ہے کہ مجھ اُجڈ کو قلمکار بنا دیا جو کتوں کا ترجمان ہے۔ لوگ کہیں گے، وہ باوا صابو مر گیا ہے، کتوں والا صابو!"

"صابو بھائی!"___ عنایت اللہ کی رگ ظرافت پھڑک اٹھی اور کہنے لگا___ "اگر تم مجھ سے پہلے مر گئے تو میں تمہارا مزار بناؤں گا اور اس پر تختی لگواؤں گا سائیں کتیاں والا۔ لوگ کانواں والے کو بھول جائیں گے"۔

"یار عنایت!"___ میں نے کہا تھا___ "اس کے ساتھ یہ بھی مشہور کر دینا کہ خارش کے مارے ہوئے کتے کو سائیں کتیاں والے کے مزار کی خاک چٹاؤ تو وہ بالکل ٹھیک ہو جاتا ہے اور اگر کتا باؤلا ہو جائے تو اسے اس مزار کا سلام کراؤ، اس کا دماغ درست ہو جائے گا"۔

عنایت اللہ میرے زندہ دل دوستوں کی محفل کا آخری ساتھی تھا جو مجھے تنہا چھوڑ گیا ہے۔ میں محفل میں تنہا شمع کی مانند پھڑ پھڑا رہا ہوں۔ یہ شمع اس وقت بجھے گی جب اللہ کا بلاوا آئے گا۔

عنایت اللہ کو شادمان لاہور کے قبرستان میں دفن کر کے بڑی زیادتی کی گئی ہے۔ میرے سب سنگی ساتھیوں کی قبریں میرے علاقے میں ہیں اور میں روزانہ ان کی جھاڑ پونچھ کرتا ہوں۔ ان سے باتیں کرتا ہوں۔ پرانی یادیں تازہ کرتا ہوں۔ لاہور جیسے مصروف شہر میں کون عنایت اللہ کی قبر پر جاتا ہوگا۔ اب تو لوگوں کے پاس اتنا وقت بھی نہیں ہوتا کہ بغیر مطلب کے کسی زندہ شخص سے ملیں تو پھر قبرستان کون جائے گا!

عنایت اللہ کا خمیر پوٹھوہار کی مٹی سے اٹھا تھا۔ اس کو اس مٹی میں ہی دفن کرتے تو اچھا تھا۔ ہم بڑے فخر سے کہتے ہیں کہ پوٹھوہار کی زمین نے تین نشان حیدر اور ایک عنایت اللہ پیدا کیا ہے۔

جب سے میرا یار عنایت اللہ فوت ہوا ہے کوئی کہانی سنانے کو دل نہیں مانتا۔ دل ہے کہ بجھ کے رہ گیا ادھر "حکایت" کے دفتر سے خطوط کا تانتا بندھا ہوا ہے۔ ان سب میں ہی مطالبہ ہے کہ کوئی کہانی سناؤں۔ اتنے خطوط جمع ہو گئے ہیں کہ اچھی خاصی ردی جمع ہو گئی ہے۔

پہلے میں کہا کرتا تھا کہ بڑھاپے میں آ کر جسم کی ساری طاقت زبان میں آ جاتی ہے۔ مگر اب تو لگتا ہے زبان بھی ساتھ چھوڑ رہی ہے۔ کہانی میں کیا سناؤں۔ میری ہر کہانی میں ایک ہی قسم کی تکرار ہوتی ہے اور یہ میری مجبوری ہے کیونکہ میرا علاقہ محدود ہے۔ اسی علاقے میں، میں نے کتوں کے پیچھے بھاگتے، گیدڑوں، خرگوشوں اور بھیڑیوں وغیرہ کا شکار کھیلتے جوانی گزاری ہے۔ اس علاقے کے ایک ایک پتھر اور ایک ایک درخت سے میں واقف ہوں اگر میری کہانیوں میں کوئی دلچسپی کی بات ہوتی ہے تو صرف شکار ہی نہیں بلکہ حقیقی زندگی کے چونکا دینے والے ڈرامے ہوتے ہیں۔

جوانی میں، میں لہو گرم رکھنے کے بہانے ڈھونڈتا تھا حالانکہ اس عمر میں ویسے ہی لہو میں خاصی گرمی ہوتی ہے لیکن ہم اس کو مزید گرماتے تھے۔ اونچے نیچے راستوں پر سرپٹ دوڑتے تھے۔ اب بڑھاپے میں آ کے نامراد بلڈ پریشر نے ناک میں دم کر رکھا ہے۔ حالانکہ اب میں لہو گرم رکھنے کے بہانے نہیں ڈھونڈتا بلکہ اب تو بلڈ پریشر کو بہلانے کے جتن کرتا رہتا ہوں۔

جو کہانی میں سناؤں گا وہ ایک پیر کی ہے۔ ویسے ہی پیر کی جن کی کہانیاں آپ "حکایت" میں پڑھتے رہتے ہیں۔ وقت وقت کی بات ہے۔ وہ وقت کچھ اور تھا، یہ وقت کچھ اور ہے۔ زمانہ تو بدلا ہی ہے، انسان بھی بدل گئے ہیں۔ موسم بھی بدل گئے ہیں۔ اگر کچھ نہیں بدلا تو وہ ہے پیر پرستی...... قبر پرستی۔

ہم پیروں کی پوجا کرتے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ہمارے بڑے ان کے پجاری تھے۔ مجھے بھی ایک پیر کا مرید بنا دیا گیا تھا۔ ہم سب لڑکے اس پیر کے مرید تھے بلکہ ہمارے کتے بھی اس کے مرید تھے۔ وہ اس طرح کہ کبھی کبھار ہم کچھ روٹیوں پر پیر صاحب سے دم کروا کے یہ روٹیاں تمام کتوں کو کھلایا کرتے تھے۔ پیر صاحب کے خاص چیلے ہمیں کہا کرتے تھے کہ پیر صاحب کی دم کی ہوئی روٹیاں کھا کر تمہارے کتے شیر کو بھی مار لیں گے۔ ہمارے علاقے میں شیر نہیں تھے ورنہ ہم پیر صاحب کی اس کرامت کو ضرور آزماتے۔

میرے علاقے کے خدوخال تو "حکایت" پڑھنے والوں کو زبانی یاد ہو گئے ہوں گے لیکن میں مختصراً نئے پڑھنے والوں کے لئے ذکر کر دوں تو بے جا نہ ہوگا۔ میرے علاقے کی زمین اونچی نیچی اور کٹی پھٹی، چھوٹے بڑے برساتی نالے اور ان کے کنارے دیواروں جیسے سیدھے اور بلند ٹیلے اور گھاٹیاں، لمبے اور اونچے اونچے ٹیلے۔ ان میں کہیں غاروں جیسے

شگاف اور کہیں قدرت کی بنائی ہوئی گپھیں اور غاریں۔ زمین کے اندر ہی اندر بھول بھلیاں جیسے راستے۔ کہیں گہرے اور وسیع وعریض نشیب اور کہیں ایسی بلندی جیسے چھ سات منزلہ بلند عمارت کی چھت پر کھڑے ہوں۔

ان شگافوں اور قدرتی غاروں میں گیدڑ، سیہ، خرگوش، نیولے، بلی جتنے بڑے جنگلی چوہے اور اود بلاؤ وغیرہ رہتے تھے۔ کہیں کہیں بھیڑیے اور جنگلی بلے بھی تھے جو صرف ہم جیسے سر پھروں کو نظر آتے تھے کیونکہ ہم ایسی جگہوں میں نڈر ہو کر گھس جاتے تھے۔ بعض اوقات گوہ اور سانڈے بھی مل جاتے تھے۔

یہی ہمارا ایڈونچر ہوتا تھا۔ مئی، جون اور جولائی سخت گرمی والے مہینے ہوتے تھے۔ ان مہینوں میں ہم شکار کے لئے نہیں نکلتے تھے۔ مارچ اپریل بہار کا موسم ہوتا تھا اور ہمارے شکار کھیلنے کے لئے موزوں ترین۔ مارچ کا اخیر تھا جب ہم دوستوں نے شکار کا پروگرام بنایا۔ اس روز ہمارا خیال تھا کہ کافی دور تک جائیں گے اس لئے صبح سویرے ہی تمام لڑکے تیار ہو کر اکٹھے ہو گئے۔

جب ہم گاؤں سے نکلے تو ہماری ماؤں نے حسب روایت ہمیں گالیوں، کوسنوں اور بددعاؤں کے ساتھ رخصت کیا۔ ہم گاؤں سے نکل گئے۔ آسمان پر موسم بہار کے بادلوں کے سفید اور سلیٹی ٹکڑے آوارہ گردی کر رہے تھے۔ اگر یہ ٹکڑے اکٹھے ہو جاتے تو بڑی زور دار مینہ برساتے اور ژالہ باری بھی ہو جاتی۔ ہم اس قسم کی صورتِ حال میں پریشان ہونے کی بجائے لطف اندوز ہوتے تھے۔ بارش اور اولے ہمارا راستہ نہیں روک سکتے تھے۔

آج کل بھی بہار کا موسم ہے۔ حکومتی سطح پر جشن بہاراں منایا جا رہا ہے۔ مجھے سمجھ نہیں آتی کہ یہ لوگ کس بات کے جشن مناتے ہیں۔ کبھی کوئی جشن اور کبھی کوئی۔ اب تو لگتا ہے انسانوں کے ساتھ ساتھ بادلوں میں بھی دم خم نہیں رہا۔ سیاسی لیڈروں کی طرح گرج چمک کر بن برسے ہی بھاگ جاتے ہیں یا آتے ہیں مگر کسی نخریلی محبوبہ کی طرح برسے بغیر گزر جاتے ہیں۔

لوگ بارش نہ برسنے کی شکایت تو کرتے ہیں مگر اپنے اعمال پر نظر نہیں ڈالتے۔ ہماری قوم میں اتنی برائیاں جمع ہو گئی ہیں کہ شمار ممکن نہیں رہا اور یہ تمام ایسی برائیاں ہیں کہ ایسی صرف ایک ایک برائی پر اللہ تعالیٰ نے پچھلی قوموں پر اپنا عذاب بھیج کر تباہ و برباد کر دی تھیں۔ اب بھی وقت ہے کہ ہمارا حکمران طبقہ اور عوام سنبھل جائیں۔ دوسری صورت میں

عذاب کا انتظار کریں۔

میں اپنی عادت کے مطابق پھر اصل کہانی سے بھٹک گیا ہوں۔ میں کیا کروں۔ میں اپنی عادت کے ہاتھوں مجبور ہوں۔ یہ آپ لوگوں کی محبت ہے کہ مجھ جیسے باتونی بڈھے کو برداشت کرتے ہیں۔

ہاں تو میں سنا رہا تھا کہ ہم گاؤں سے نکل گئے۔ صبح سویرے خنک ہوا چل رہی تھی۔ ہم اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے چلے جا رہے تھے۔ پھر جب آبادی دور رہ گئی اور ہم ویرانے میں نکل آئے تو ہم نے کتوں کے پٹوں سے زنجیریں نکال لیں۔ بوگیر کتے زمینی جانوروں کی مشک لیتے آگے بڑھنے لگے۔ باقی سارے کتے بھی اِدھر اُدھر سونگھتے پھر رہے تھے۔ ہر جھاڑی اور ہر پتھر کی کسی ماہر سراغرساں کی طرح تلاشی لے رہے تھے۔

اچانک ہم سے ساٹھ ستر گز آگے ایک جھاڑی سے دو خرگوش نکل کر بھاگے۔ ایک تازی کتے نے دیکھ لیا اور ہلکی سی ''بف'' کی آواز نکال کر خرگوشوں کی طرف بھاگ اٹھا۔ اس کی آواز کا اشارہ پا کر سارے کتے اس کے پیچھے گولی کی رفتار سے بھاگ اٹھے۔ آگے کافی دور تک میدان ہموار تھا پھر اس سے آگے جا کر ٹیلے نظر آ رہے تھے۔ خرگوش ایسے بھاگ رہے تھے جیسے ہوا میں تیر رہے ہوں۔ ہمارے دونوں تازی کتے سارے کتوں سے آگے آگے تھے۔ تازی کتا اپنی مخصوص جسمانی ساخت کی وجہ سے انتہائی تیز رفتاری سے بھاگ سکتا ہے۔ اسی تیز رفتاری کی وجہ سے ہم اسے جہازی کتا کہتے تھے۔

یہ منظر دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ خرگوش اپنی جان بچانے کے لئے جی جان سے بھاگ رہے تھے۔ تازی کتے بھی اپنی رفتار کے جوہر دکھا رہے تھے۔ خرگوشوں اور کتوں کے درمیان فاصلہ کم ہوتا جا رہا تھا۔ صاف نظر آ رہا تھا کہ کتے خرگوشوں کو پکڑ لیں گے۔ اچانک فضا سے ایک بڑا عقاب کسی جیٹ طیارے کی طرح غوطے میں آیا اور بھاگتے ہوئے خرگوشوں پر جھپٹا مارا۔ اس نے ایک خرگوش کو اپنے پنجوں میں دبوچ لیا اور یوں اُوپر اٹھا جیسے کوئی بمبار طیارہ بم گرا کر اُوپر کو اٹھتا ہے۔

ابھی عقاب خرگوش کو دبوچ کر تھوڑا ہی اُوپر اٹھا ہو گا کہ خرگوش اس کے پنجوں سے چھوٹ کر نیچے گرا اور تڑپنے لگا۔ اس سے پہلے کہ عقاب دوبارہ خرگوش پر آتا، ہمارے کتے پہنچ گئے اور تڑپتے ہوئے خرگوش پر ٹوٹ پڑے۔ دوسرے خرگوش نے بائیں طرف رخ بدل کر نکلنا چاہا لیکن آدھے کتے اس پر لپکے اور اس کا بھی وہی حال کیا جو پہلے کا کیا تھا۔ ہمارے

قریب پہنچنے تک دونوں خرگوش کُتوں کے معدوں میں پہنچ چکے تھے۔ ان دو خرگوشوں کے
گوشت سے کُتوں کا پیٹ بھرنا ناممکن سی بات تھی۔

اس بھاگ دوڑ کے نتیجے میں ہمارا اور کُتوں کا خون گرم ہو چکا تھا۔ اب سورج آہستہ
آہستہ اُوپر اُٹھتا جا رہا تھا۔ فضا میں تپش بڑھ گئی تھی لیکن یہ تپش ناگوار محسوس نہیں ہوتی تھی۔ ہم
ہنستے کھیلتے آگے ہی آگے بڑھتے جا رہے تھے۔ تھوڑا آگے گئے تو اچانک سارا منظر ہی بدل
گیا۔ ہمارے آگے گہرا وسیع نشیب تھا جس میں چھوٹے چھوٹے ٹیلے اور غاریں بنی ہوئی
تھیں۔ عجیب کٹا پھٹا علاقہ تھا۔ وہاں کی ویرانی اور خاموشی دل پر ہول سا طاری کر رہی تھی۔

ہم اس نشیب میں اتر گئے۔ ہمارے کُتے بڑے جوش و خروش سے کسی شکار کی تلاش
میں اِدھر اُدھر بھاگ دوڑ رہے تھے۔ اچانک ایک کھوہ سے گیدڑوں کا ایک جوڑا نکل کر
بھاگا۔ اگرچہ ان کی رفتار خاصی تیز تھی مگر ہمارے کُتے انہیں کہاں جانے دیتے۔ تازی کُتے
لمحوں میں ان کے سر پر جا پہنچے۔ ایک تازی کُتے نے ایک گیدڑ کے قریب پہنچ کر بڑی مہارت
سے اسے اپنے جسم کا دھکا دیا تو گیدڑ لڑکھڑا کر قلابازی کھا گیا۔ دوسرے تازی کُتے نے
دوسرے گیدڑ کے ساتھ یہی سلوک کیا۔ جتنی دیر تک گیدڑ سنبھلتے، دونوں تازی کُتے ان کا
راستہ روک کر کھڑے ہو گئے۔ گیدڑ پیچھے کو مڑے تو اُدھر سے دوسرے کُتے ان پر جھپٹتے
آ رہے تھے۔

تازی کُتے لڑنے بھڑنے اور شکار کی چیر پھاڑ کرنے والے نہیں ہوتے۔ ان کا کام
یہی ہوتا ہے کہ وہ شکار کو روک لیں اور دوسرے کُتوں کے آنے تک الجھائے رکھیں۔ دیکھنے
میں یہ بالکل ہڈیوں کا ڈھانچہ نظر آتے ہیں۔

کہتے ہیں کہ گیدڑ بڑا بزدل ہوتا ہے۔ کمزور اور بزدل انسان کے لئے بھی گیدڑ کا لفظ
استعمال کیا جاتا ہے۔ اس روز گیدڑوں نے یہ خیال غلط ثابت کر دکھایا۔ جب انہوں نے
دیکھا کہ کُتوں سے کسی طور جان بچا کر بھاگ نہیں سکتے تو وہ مقابلے پر ڈٹ گئے۔ دونوں
دانت نکوس کر کھڑے ہو گئے اور غرانے لگے۔

کُتے گیدڑوں کے تیور دیکھ کر ٹھٹک گئے اور حیران نظروں سے انہیں دیکھنے لگے۔ پھر
ایک کُتے نے ایک گیدڑ پر حملہ کیا تو گیدڑ نے نہ صرف یہ کہ اپنا دفاع کیا بلکہ جوابی حملہ بھی
کیا۔ یہ دیکھ کر افضل کے بوہلی نے بڑے غیض کے عالم میں اس گیدڑ پر حملہ کر دیا اور اپنا
مخصوص داؤ استعمال کرتے ہوئے اس کی گردن اپنے مضبوط جبڑوں میں جکڑ لی۔ پھر بوہلی

نے ایک زوردار جھٹکا دے کر اس کی گردن کی ہڈی توڑ دی۔ بس پھر کیا تھا سارے کُتے
گیدڑوں پر پل پڑے۔

چند لمحوں بعد گیدڑوں کے ٹکڑے اِدھر اُدھر بکھرے نظر آنے لگے۔ کسی کُتے کے منہ
میں ٹانگ تھی تو کسی کے منہ میں کوئی اور حصہ۔ کُتوں نے گیدڑوں کا گوشت نہیں کھایا اور
لاتعلقی سے ایک طرف پھینک دیا۔ ہم نے سنا تھا کہ گیدڑ کا گوشت کھٹا ہوتا ہے، اس لئے کُتے
اسے نہیں کھاتے۔ میں یہ نہیں بتا سکتا کہ سب سے پہلے کس نے گیدڑ کا گوشت کھا کر یہ معلوم
کیا تھا کہ اس کا ذائقہ ترش ہوتا ہے۔

ہم اپنے گاؤں سے خاصی دور نکل آئے تھے۔ اب سورج سر پر آ گیا تھا۔ کُتوں کو
بھوک محسوس ہونے لگی تھی۔ سوائے دو خرگوشوں کے ان کے ہاتھ کچھ نہیں لگا تھا۔ ہم نے
ایک مناسب جگہ دیکھ کر چادریں بچھالیں اور اپنی اپنی روٹیاں نکال لیں۔ کُتوں کے حصے کی
روٹیاں ہم نے ان کے آگے ڈال دیں۔ روٹی کھا کر اور ذرا ستا کر ہم پھر آگے بڑھ گئے۔

کچھ اور آگے گئے تو ہمیں کچھ فاصلے پر ایک گاؤں نظر آنے لگا۔ اس طرف ہم اتنی
دور تک پہلی بار آئے تھے۔ ہمارا خیال تھا کہ اس گاؤں کے باہر باہر سے نکلتے ہوئے آگے
چلے جائیں گے۔ قریب پہنچنے تو یہ چھوٹا سا گاؤں تھا۔ گاؤں سے ذرا ہٹ کر ایک بڑا
قبرستان بنا ہوا تھا۔ ہمیں قبرستان میں بہت سے لوگ نظر آئے۔

''شاید کوئی جنازہ آیا ہوا ہے''___ افضل نے کہا۔

''آؤ، آگے چل کر دیکھتے ہیں''___ میں نے کہا۔

ہم نے کُتوں کے پٹوں میں زنجیریں ڈال لیں اور قبرستان کی طرف چلے گئے۔
قریب پہنچے تو معاملہ کچھ اور ہی نظر آیا۔ قبرستان کے ایک طرف ایک چھوٹا سا کچا مگر
خوبصورت گھر بنا ہوا تھا۔ اس گھر کی چھت پر ہرے رنگ کے دو تین جھنڈے لہرا رہے تھے۔
لوگ وہاں جمع تھے۔ میں نے لڑکوں سے کہا کہ وہ کُتوں کے ساتھ ذرا پیچھے ہی کھڑے
رہیں۔ میں نے افضل کو ساتھ لیا اور صورتِ حال معلوم کرنے کے لئے قریب چلا گیا۔

وہاں جو لوگ کھڑے تھے، وہ بڑے سہمے ہوئے نظر آ رہے تھے اور ایک دوسرے سے
ڈرے ڈرے لہجے میں باتیں کر رہے تھے۔ باتیں کرتے ہوئے وہ بار بار کانوں کو ہاتھ
لگاتے تھے اور آسمان کی طرف دیکھتے تھے۔ میں نے ایک ادھیڑ عمر آدمی سے پوچھا کہ کیا
معاملہ ہے۔

''تم اس گاؤں کے نہیں لگتے''۔۔۔ اس آدمی نے کہا۔۔۔ ''اسی لئے تمہیں کچھ معلوم نہیں ہے۔ ہمارے تو پورے گاؤں اور اردگرد کے علاقے میں بھی بھونچال آ گیا ہے۔۔۔ لگ ہے قیامت آنے والی ہے''۔

''بتائیں تو سہی آخر ہوا کیا ہے؟''۔۔۔ افضل نے اس کی تمہید سے جھنجلا کر کہا۔

''پیر صاحب کو رات کسی نے قتل کر دیا ہے''۔۔۔ اس آدمی نے بتایا۔۔۔ ''مجھے تو جنات کا کام لگتا ہے۔ کوئی انسان پیر صاحب کو ہاتھ بھی لگائے تو بھسم ہو جائے''۔

''بڑا عذاب آنے والا ہے اس علاقے پر''۔۔۔ قریب کھڑے ایک اور آدمی نے کہا۔

''اس سال بارشیں نہیں ہوں گی''۔۔۔ ایک اور آدمی نے بڑے وثوق سے کہا۔

''ہری فصلیں سوکھ جائیں گی''۔

''لال آندھی آئے گی اور بگولے اٹھیں گے''۔۔۔ ایک اور لرزتی ہوئی آواز م بولا۔

معلومات کرنے پر پتہ چلا کہ قبرستان سے ملحق مکان سے ایک پیر صاحب کا ڈیرا تھ یہ پیر اردگرد کے دیہات میں خاصا مشہور و معروف تھا۔

یوں تو اس کی بہت سی کرامات مشہور تھیں لیکن وہ خاص طور پر بے اولاد عورتوں کو اولا دینے میں مشہور تھا۔

جس طرح آج کل شہروں میں ہر مرض کے سپیشلسٹ ہوتے ہیں، اسی طرح آپ سمجھ لیں کہ یہ پیر بے اولاد عورتوں کا علاج کرنے کا سپیشلسٹ تھا۔

یہ پیر رات کو قتل ہو گیا تھا۔ پتہ چلا کہ پولیس آئی ہوئی ہے اور مکان کی اندر کا جا لے رہی ہے۔ ابھی ہم باہر کھڑے لوگوں سے باتیں کر رہے تھے کہ مکان کے اندر سے ایک چھوٹا تھانیدار باہر نکلا پھر اس کے پیچھے ایک حوالدار نکلا۔ اس حوالدار کو دیکھ کر چونک اٹھا۔ چونکنے کی وجہ یہ تھی کہ اس شخص کو میں اچھی طرح جانتا تھا۔ اس کا نام احمد علی اس کا باپ ایک پرائمری سکول میں پڑھاتا تھا۔ یہ لوگ پہلے ہمارے گاؤں میں رہتے پھر سوہاوہ چلے گئے تھے۔ احمد علی کے ساتھ میری اچھی سلام دعا تھی۔ وہ اکثر ہمارے کے بارے میں بڑے شوق سے پوچھتا رہتا تھا۔ اس کی بڑی خواہش تھی کہ وہ ایک اچھ کا کتا پالے۔ میں نے اپنے ایک دوست سے اسے ایک بل ٹیریئر کا پلا لے کر دے دیا

وہی احمد علی حوالدار کی وردی پہنے میرے سامنے تھا۔ احمد علی کے پیچھے پیچھے تین کانسٹیبل نکلے جنہوں نے ایک چارپائی اٹھا رکھی تھی۔ چارپائی کے تین پائے تین کانسٹیبلوں نے اور چوتھا ایک مرید نے پکڑ رکھا تھا۔ چارپائی پر پیر صاحب کی لاش تھی جو ایک چادر سے ڈھانپی ہوئی تھی۔ غالباً لاش کو پوسٹمارٹم کے لئے لے جایا جا رہا تھا۔

میں احمد علی کی طرف بڑھ گیا۔ مجھے اپنے سامنے دیکھ کر وہ بڑا حیران ہوا اور پھر بڑی گرمجوشی سے گلے ملا۔ پھر وہ افضل سے بھی گلے ملا۔ میں نے اسے بتایا کہ ہم شکار کھیلتے اور بھاگتے دوڑتے اِدھر آ نکلے۔

''باقی لڑکے کہاں ہیں؟''۔۔۔ احمد علی نے پوچھا۔

میں نے اسے بتایا کہ کُتوں کی وجہ سے انہیں ذرا پیچھے چھوڑ کر آئے ہیں۔

ہم نے احمد علی سے پیر کے قتل کے متعلق بہت سوالات پوچھے کہ اس کو کس نے قتل کیا ہے؟ قتل کس طرح کیا گیا ہے اور کیا یہ جنات کا کام ہے یا کسی انسان کا؟

احمد علی ہماری باتیں سن کر مسکرایا اور پھر اس نے بتایا کہ پیر صاحب کو گلا گھونٹ کر قتل کیا گیا ہے اور یہ کسی انسان ہی کا کام ہے۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ تفتیش کے بعد ہی کچھ سامنے آئے گا۔

ہم بھی پہلے پہل پکے پیر پرست ہوتے تھے اور پیروں کی کرامات پر ایمان رکھنے والے تھے۔ ہمارے لئے یہ انہونی بات تھی کہ کوئی انسان کسی پیر صاحب کو مار سکتا ہے۔ ہم بھی اور لوگوں کی طرح خوفزدہ اور پریشان ہو گئے تھے۔

احمد علی نے بتایا کہ اس نے لاش کو پوسٹمارٹم کے لئے لے کر جانا ہے اس لئے وہ جلدی میں ہے۔ اس نے کہا کہ ہم اس کے گھر سوہاوہ ضرور آئیں پھر کھل کر باتیں ہوں گی۔ اس نے یہ بھی کہا کہ اپنی شکاری ٹیم کے سب لڑکوں کو میرا اسلام کہہ دینا۔ پھر وہ ہم دونوں سے ہاتھ ملا کر چلا گیا۔

ہم واپس اپنے ساتھیوں کے پاس آئے اور ان کو بتایا کہ وہاں کیا واقعہ ہوا ہے۔ سب لڑکے خوفزدہ ہو گئے اور کانوں کو ہاتھ لگانے لگے۔ سب نے کہا کہ یہیں سے واپس چلتے ہیں، کہیں ہمارے ساتھ کوئی حادثہ نہ پیش آ جائے۔

ہم اپنے گاؤں واپس پہنچ گئے۔ ہمارے پاس گاؤں والوں کو سنانے کے لئے بڑی ہی سنسنی خیز اور دہشت پھیلانے والی خبر تھی۔ جب ہم نے گاؤں والوں کو پیر کے قتل والی

بات سنائی تو تھوڑی ہی دیر میں یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پورے گاؤں میں پھیل گئی۔

ہماری ماؤں کو پتہ چلا تو انہوں نے ہمارا کورٹ مارشل کرتے ہوئے حکم جاری کر دیا کہ آئندہ ایک ہفتے تک ہم شکار کھیلنے کے لئے باہر نہیں نکل سکتے۔ ان سب ماؤں کو اللہ تعالیٰ جنت نصیب کرے، ان کا خیال تھا کہ ہم چونکہ پیر صاحب کے قتل والے علاقے سے ہو کر آئے ہیں، اس وجہ سے ہم پر کوئی نحوست یا مصیبت نازل نہ ہو جائے۔

میرے دل میں اس بات کی بے چینی لگی ہوئی تھی کہ معلوم کروں کہ پیر صاحب کو کس نے قتل کیا ہے۔ اس کے لئے احمد علی سے ملنا ضروری تھا۔ دن پر دن گزرنے لگے۔ شادی کے بعد بیوی نے اور گھریلو فرائض نے کچھ اس طرح جکڑ لیا تھا کہ چاہنے کے باوجود احمد علی کے پاس نہ جا سکا۔ اس طرح تقریباً چھ مہینے گزر گئے۔ ہمارے ایک دوست کی شادی آ گئی۔ اس کی بارات سوہاوہ جانی تھی۔ سوہاوہ کے ذکر پر مجھے احمد علی یاد آ گیا اور اس کے ساتھ ہی پیر بھی یاد آ گیا جو قتل ہو گیا تھا۔ میں نے اور افضل نے مل کر یہ پروگرام بنایا کہ ہم بارات کے ساتھ جائیں گے اور وہاں سے نکاح اور کھانے کے بعد احمد علی کے گھر نکل جائیں گے۔

جس دن بارات جانی تھی، ہم دونوں نے اپنے اپنے گھر والوں سے کہہ دیا تھا ہم وہاں ایک دوست کے گھر جائیں گے اور رات وہیں گزار کر اگلے دن واپس آئیں گے۔ ہمیں معلوم تھا کہ احمد علی کسی صورت میں بھی ہمیں رات کے وقت واپس نہیں آنے دے گا۔ وہ وقت ہی خلوص اور محبت کا تھا۔ ریاکاری اور منافقت نہیں تھی۔ بناوٹ اور تصنع کا نام نہیں تھا۔

مختصر یہ کہ مقررہ دن ہم اپنے دوست کی بارات کے ساتھ سوہاوہ چلے گئے اور پھر وہاں سے اپنے پروگرام کے مطابق فارغ ہونے کے بعد احمد علی کے گھر چلے گئے۔ احمد علی گھر میں نہیں تھا۔ اس کے والدین نے دیکھا تو بڑے خوش ہوئے۔ احمد علی کے والد نے بتایا کہ احمد علی ایک گھنٹے تک آ جائے گا۔ انہوں نے ہمیں بیٹھک میں بٹھایا اور خدمت خاطر کرنے لگے۔ پھر گاؤں کی باتیں ہونے لگیں اور پتہ ہی نہ چلا کہ کتنا وقت گزر گیا ہے۔

مغرب کا وقت ہو گیا تھا جب احمد علی آ گیا۔ ہمیں دیکھ کر وہ بہت خوش ہوا۔ رات کھانے کے بعد ہم نے محفل جمالی اور گپ شپ کا دور چلنے لگا۔ کتوں کی اور شکار کی باتیں ہونے لگیں۔ باتوں باتوں میں، میں نے گفتگو کا رخ پیر کے قتل کی طرف موڑ دیا۔ احمد علی قتل کی وہ واردات یاد آ گئی۔

''اس پیر کے قتل کا کچھ پتہ چلا تھا؟'' ـــ میں نے احمد علی سے پوچھا ـــ ''اسے کس نے قتل کیا تھا؟''

''پیر کا قاتل پکڑا گیا تھا'' ـــ احمد علی نے بتایا ـــ ''اسے اس کے خاص مرید نے قتل کیا تھا''۔

میں نے کچھ سوال پوچھے تو احمد علی نے تمام واقعہ تفصیل سے سنا دیا۔ میں یہ سارا واقعہ آپ کو سنا دیتا ہوں۔

اس پیر کا نام پیر گالہڑ شاہ تھا۔ آپ کو معلوم ہو گا کہ گلہری کو پنجابی میں گالہڑ کہتے ہیں۔ اس پیر کا اصل نام تو کچھ اور ہو گا لیکن وہ گالہڑ شاہ کے نام سے مشہور ہو گیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ جس قبرستان کے کنارے پر پیر صاحب کا ڈیرہ تھا، وہاں اردگرد درخت بہت تھے۔ ان درختوں پر سینکڑوں گلہریوں کا ڈیرہ تھا۔ پہلے پہل وہاں اتنی زیادہ گلہریاں نہیں تھیں۔ پیر صاحب نے یہاں ڈیرہ لگایا تو انہوں نے ان گلہریوں کے لئے درختوں کے نیچے خوراک ڈالنی شروع کر دی۔ گلہریوں کو اتنی آسانی سے خوراک ملنے لگی تو انہوں نے وہاں پکے ڈیرے لگا لئے۔

چونکہ جانوروں میں خاندانی منصوبہ بندی کا رواج نہیں ہوتا، اس لئے دن بہ دن گلہریوں کی تعداد میں اضافہ ہونے لگا۔ یہاں کی سہولتیں دیکھ کر شاید اِدھر اُدھر سے بھی گلہریوں نے آ کر وہاں ڈیرے لگا لئے ہوں گے۔ پیر صاحب کے مریدوں اور اپنی حاجات لے کر آنے والے سائلوں نے دیکھا دیکھی ان گلہریوں کو خوراک ڈالنی شروع کر دی۔ جو بھی سائل وہاں آتا وہ حسب توفیق ان گلہریوں کے لئے کچھ نہ کچھ ضرور لاتا۔ اس طرح آہستہ آہستہ اس پیر کا نام لوگوں نے گالہڑ شاہ رکھ دیا۔ یوں تو گالہڑ شاہ کی بہت سی کرامات مشہور تھیں لیکن وہ بے اولاد عورتوں میں بہت مقبول تھا۔ اس کے متعلق مشہور تھا کہ وہ جس بے اولاد عورت پر دم کر کے اس کے پیٹ پر ہاتھ پھیر دے، اسے ضرور اولاد مل جاتی ہے۔

احمد علی نے ہمیں بتایا کہ یہ پیر بہت بڑا فراڈ تھا اور عورتوں سے بدکاری کرتا تھا۔ اس کام میں اس کا خاص مرید نذیر اس کی مدد کرتا تھا اور عورتوں کو گھیر کر لاتا تھا اور پیر صاحب کی کرامات کی تشہیر کرتا تھا۔ لوگ اس کو گالہڑ شاہ کا بالکا کہتے تھے۔ یہ دن بھر اردگرد کے دیہات میں پھرتا رہتا تھا اور لوگ اسے اناج، دیسی گھی اور مرغیوں کے علاوہ نقد پیسے بھی دیتے تھے۔

گالہڑ شاہ کا بالکا کسی سے کچھ مانگتا نہیں تھا نہ کبھی اس نے صدا لگائی تھی۔ اس کا انداز دینا سے نرالا تھا۔ اس نے لوہے کے بنے ہوئے چھوٹے بڑے کئی گھنٹے اپنے بدن کے ساتھ لٹکا رکھے ہوتے تھے۔ یہ گھنٹے لوہے کے ایک موٹے سنگل سے منسلک ہوتے تھے۔ جب وہ چلتا تھا تو اس کے جسم کی حرکت کے ساتھ ساتھ وہ گھنٹے بجنے لگتے تھے اور ٹن ٹن کی آواز دور دور تک سنائی دیتی تھی۔ پنجابی میں ان گھنٹوں کو ٹل کہا جاتا ہے، اس لئے لوگ اسے بابا ٹل بھی کہتے تھے۔ وہ کوئی بوڑھا آدمی نہیں تھا بلکہ پینتیس اور چالیس کے درمیان عمر کا ہوگا۔

تفتیش کے دوران معلوم ہوا کہ رات کے وقت سارے مرید اور خدمتگار چلے جاتے تھے۔ صرف بابا ٹل ہی پیر صاحب کے پاس رہتا تھا۔ تھانیدار نے بابا ٹل سے تفتیش کی تو وہ مشکوک نکلا اور کسی طرح بھی تھانیدار کو مطمئن نہ کر سکا۔ جب تھانیدار کو پکا شک ہو گیا کہ بابا ٹل ہی یہ قتل کر سکتا ہے تو اس نے اس پر تشدد کی انتہا کر دی۔ بابا ٹل زیادہ دیر تشدد برداشت نہ کر سکا اور اس نے اقرار کر لیا کہ پیر کو اسی نے قتل کیا ہے۔

تھانیدار نے اس کا بیان لے کر اس پر بابا ٹل کا انگوٹھا لگوا لیا۔ بابا ٹل نے اپنے بیان میں ایسے انکشاف کئے جن سے پتہ چلتا تھا کہ یہ پیر بہت بڑا فراڈ تھا اور عورتوں کے ساتھ بدکاری کرتا تھا۔ بابا ٹل بھی اس میں اس کا برابر کا شریک تھا۔

تھانیدار بڑا حیران تھا کہ پیر گالہڑ شاہ اور بابا ٹل دونوں ہم نوالہ وہم پیالہ تھے، پھر بابا ٹل نے پیر کو قتل کیوں کر دیا۔ اس کے جواب میں بابا ٹل نے قتل کی جو وجہ بیان کی وہ بھی بڑی حیران کن تھی۔ ایک بدکار اور جرائم پیشہ انسان سے اس قسم کے ردِ عمل کی توقع کی ہی نہیں جا سکتی تھی۔

بابا ٹل نے بتایا کہ پیر گالہڑ شاہ بے اولاد عورتوں کو ایک خاص عمل کے لئے رات کے وقت بلاتا تھا اور کہتا تھا کہ یہ عمل ایسے ہی وقت میں ہو سکتا ہے۔ اس کے علاوہ بھی اسے کوئی خاص عورت یا جوان لڑکی پسند آ جاتی تو وہ اس پر اپنی خاص نظر کرم کرتا اور الگ کمرے میں اس پر اپنا "خاص عمل" کرتا تھا۔ بابا ٹل اس کام میں اس کا رازدار تھا۔ جب کسی عورت یا لڑکی کی طرف سے پیر گالہڑ شاہ کا دل بھر جاتا تو وہ اسے بابا ٹل کے حوالے کر دیتا۔ یوں دونوں پیر اور اس کا بالکا مل کر بدکاری کرتے تھے۔

ہو سکتا ہے لوگوں کے لئے یہ سب کچھ ناقابلِ یقین ہو لیکن یہ سب کچھ آج کل کے جدید دور میں بھی ہو رہا ہے اور بے اولاد عورتیں "شاہ صاحبوں"، عاملوں اور پیروں سے

اولاد حاصل کر رہی ہیں۔ میں جن وقتوں کی کہانی سنا رہا ہوں ان وقتوں میں تو دیہات کے سیدھے سادے لوگ اپنے اپنے پیر کو اللہ کے بعد کا درجہ دیتے تھے اور ان کا یہ ایمان تھا کہ اگلے جہان میں ان کا پیر ان کو سزا سے بچا لے گا۔ یہ عقیدہ اب بھی پڑھے لکھے اور ان پڑھ دونوں قسم کے لوگوں میں موجود ہے۔

بابا ٹل نے اپنے بیان میں سنایا کہ قتل والی رات ایک بڑی ہی خوبصورت عورت کو پیر نے بلا رکھا تھا۔ وہ عورت آ گئی اور پیر اسے اپنے خاص کمرے میں لے گیا۔ کچھ ہی دیر گزری ہو گی کہ باہر دستک سنائی دی۔ پیر اپنے کمرے میں بدکاری میں مصروف تھا، اس لئے بابا ٹل نے بڑے محتاط انداز میں دروازے کی جھری سے آنکھ لگا کر باہر دیکھا تو اسے ایک جواں سال عورت کھڑی نظر آئی۔ وہ سمجھ گیا کہ اسے بھی پیر نے بلا رکھا ہوگا۔

بابا ٹل نے اسے اندر بلا لیا اور اس کمرے میں بٹھا دیا جہاں پیر اپنے سائلوں کے مسائل سنتا تھا۔ وہاں ایک چبوترہ سا بنا ہوا تھا۔ اس چبوترے کے اوپر سبز رنگ کا کپڑا فرش تک بچھا ہوا تھا۔ کپڑے کے اوپر ایک بڑی ہی خوبصورت ریشمی جائے نماز بچھی ہوئی تھی جس پر خانہ کعبہ کی تصویر بنی ہوئی تھی۔ جائے نماز کے ایک کنارے پر بڑی خوبصورت صندل کی لکڑی کی تسبیح پڑی ہوئی تھی جسے پیر ہاتھ میں پکڑے رکھتا تھا۔

بابا ٹل نے آنے والی عورت کے جسم پر قیمتی زیورات دیکھ کر اندازہ کر لیا تھا کہ موٹی مرغی ہے۔ عیاشی کے ساتھ بڑی رقم بھی ہاتھ آنے والی تھی۔ اس نے پیر کے کمرۂ خاص کے دروازے پر دستک دی۔ اندر سے پیر کی غصیلی آواز سنائی دی۔ پھر پیر نے تھوڑا سا دروازہ کھولا اور غصے سے پوچھا کہ کیا تکلیف ہے۔

پیر نیم برہنہ تھا اور آنکھیں بھنگ کے نشے سے سرخ ہو رہی تھیں۔ بابا ٹل نے آہستہ سے اسے آنے والی جواں سال عورت کے متعلق بتایا اور یہ بھی بتایا کہ مالدار آسامی ہے۔ یہ سن کر پیر کی آنکھوں میں لالچ اور ہوس جو پہلے ہی موجود تھی، اور بڑھ گئی۔ اس نے بابا ٹل سے کہا کہ وہ پہلے والی عورت کو دوسری طرف سے نکال دے۔

بابا ٹل نے پہلے والی عورت کو بڑی رازداری سے دوسری طرف سے نکال دیا۔ ادھر پیر جلدی جلدی کپڑے پہن کر اور چہرے پر جلال طاری کر کے مالدار عورت کے پاس جا بیٹھا۔ اس نے اپنی عادت کے مطابق جائے نماز پر بیٹھ کر آنکھیں بند کر لیں تسبیح پھیرنی شروع کر دی۔ وہ اداکاری کر رہا تھا۔

اس عورت کا مسئلہ جائیداد کا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ اس کے خاوند کے چھوٹے بھائی کے گھر کوئی اولاد نہ ہوتا کہ باپ دادا کی اتنی بڑی جائیداد پر صرف اس کے بچوں کا حق ہو۔ پیر نے اسے یقین دلا رکھا تھا کہ وہ ایسا عمل کرے گا کہ اس کی دیورانی ہمیشہ بے اولاد رہے گی۔ اس عمل کے لئے پیر نے اچھی خاصی رقم طلب کی تھی جو وہ عورت لے کر آئی تھی۔

اس نے مطلوبہ رقم پیر کے قدموں کے پاس رکھ دی اور الٹے قدموں پیچھے ہٹ کر کھڑی ہوگئی۔ پیر نے اس سے کہا کہ اس کے لئے خاص عمل بھی کرنا ہوگا جس میں اس کی موجودگی ضروری ہے۔ عورت نے بتایا کہ وہ بڑی مشکل سے تھوڑا سا وقت نکال کر آئی ہے اور مزید یہاں نہیں رُک سکتی۔ اس نے کہا کہ دو دن بعد اس کا خاوند کسی کام سے کسی دوسرے شہر جا رہا ہے۔ وہ اپنے خاوند کے جانے کے بعد آجائے گی۔ یہ کہہ کر وہ عورت رکوع کی حالت میں جھک کر سلام کر کے نکل گئی۔

یہاں آپ غور کریں کہ انسان کی فطرت اپنے اندر کیسے کیسے رنگ لئے ہوئے ہے۔ انسان ایک لمحے میں شیطان سے فرشتہ بن سکتا ہے اور اپنی ساری عبادت پر لات مار کر فرشتے سے شیطان بھی بن سکتا ہے۔

بابا ٹل نے سنایا کہ پیر کے چہرے پر حریصانہ مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ جائے نماز پر پڑے ہوئے نوٹوں کو دیکھ رہا تھا۔ بابا ٹل کی نظریں بھی نوٹوں پر جا اٹکیں۔ وہ بڑے بڑے نوٹوں کو دیکھ رہا تھا کہ اچانک اس کے جسم کو بڑی زور کا جھٹکا لگا۔ وجہ یہ ہوئی تھی کہ جہاں نوٹ پڑے ہوئے تھے اس کے ساتھ ہی خانہ کعبہ کی تصویر تھی اور خانہ کعبہ کو دیکھ کر ہی بابا ٹل کو جھٹکا لگا تھا۔

اسے خیال آیا کہ پیر گالہڑ بدکاری کر کے پلید حالت میں ہی آکر جائے نماز پر بیٹھ گیا ہے۔ جائے نماز پر خانہ کعبہ کی تصویر بنی ہوئی تھی۔ اچانک ہی اس کے دماغ نے پلٹا کھایا اور اس کے اندر شدید بھونچال سا آگیا۔ پیر کی اس کی طرف پیٹھ تھی۔ بابا ٹل جیسے کسی غیبی قوت کے زیر اثر آگے بڑھ رہا تھا۔ پیر گالہڑ نے بہروپ مکمل کرنے کے لئے بڑے موٹے موٹے منکوں کی مالا پہن رکھی تھی جو سوت کی موٹی ڈوری میں پروئے ہوئے تھے۔

بابا ٹل نے پیچھے سے منکوں کی مالا پر ہاتھ ڈالا اور پیچھے کو کھینچ لی۔ اس طرح پیر کے گلے میں پھندہ لگ گیا اور اس نے گھبرا کر اٹھنا چاہا مگر بابا ٹل نے بجلی کی سی تیزی سے اس کی پشت پر دایاں پاؤں رکھ کر دبایا اور پھندے کو پوری طاقت سے پیچھے کو کھینچ لیا۔ پیر کا سانس

رُک گیا اور وہ تڑپنے لگا۔ پیر کسی سانڈ کی طرح طاقتور تھا مگر بابا ٹل پر اس وقت کچھ اور ہی کیفیت طاری تھی۔ اس نے پیر کو نکلنے کی مہلت نہ دی اور اپنے پاؤں کے نیچے دبائے رکھا۔ پیر کی آنکھوں کے ڈھیلے باہر کو نکل آئے اور زبان باہر لٹک گئی۔ تھوڑی دیر جدوجہد کے بعد اس نے تڑپنا چھوڑ دیا اور اس کے ہاتھ پیر ڈھیلے پڑ گئے۔

بابا ٹل نے پھر بھی اس کا پھندہ ڈھیلا نہ کیا۔ جب اسے پوری طرح یقین ہوگیا کہ پیر مر گیا ہے تو اس نے بڑی نفرت سے ایک جھٹکا دے کر اس کو چھوڑ دیا۔ اس کے بعد بابا ٹل باہر نکل گیا اور عجیب سی کیفیت میں قبرستان کے اندر پھرتا رہا۔ وہ دراصل اپنے آپ میں نہیں تھا۔

اس نے بتایا کہ وہ خانہ کعبہ کی بے حرمتی دیکھ کر پاگل ہوگیا اور اپنے آپ میں نہ رہا۔

''میں بدکار سہی، گناہگار سہی'' ـــــ بابا ٹل نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا تھا ـــــ ''لیکن میں مسلمان تو ہوں، اور کوئی مسلمان اس خانہ کعبہ کی بے حرمتی برداشت نہیں کر سکتا جس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھی جاتی ہے اور اس طرف پاؤں کرنے کو بھی گناہ سمجھا جاتا ہے''۔

تھانیدار بابا ٹل کا بیان سن کر بہت متاثر ہوا تھا۔ اس نے جان بوجھ کر مقدمہ کمزور بنایا اور اس میں ایسی خامیاں رکھی تھیں کہ بابا ٹل صاف بچ جائے۔ پھر موقع کا کوئی گواہ بھی نہیں تھا۔ تھانیدار کی سوچ یہ تھی کہ بابا ٹل نے نیکی کا کام کیا ہے اور وہ اس کی مدد کر کے اس نیکی میں شامل ہونا چاہتا ہے۔

پھر وہی ہوا جس کی تھانیدار کو توقع تھی۔ بابا ٹل عدم ثبوت اور موقعہ کا کوئی گواہ نہ ہونے کی وجہ سے صاف بری ہوگیا۔ اس کے بعد بابا ٹل وہ علاقہ ہی چھوڑ گیا پیر کی گدی کس اور نے سنبھال لی تھی اور پھر وہی فراڈ شروع ہوگیا تھا۔ لوگ اپنے پیر کے خلاف کوئی بات سننے یا ماننے کو تیار نہیں ہوئے۔ اب اس پیر کا سالانہ عرس ہوتا ہے اور اس کے مزار پر چادریں چڑھائی جاتی ہیں، دیگیں پکتی ہیں اور ہر وہ کام ہوتا ہے جو پہلے ہوتا تھا۔

اگر کوئی کمی ہے تو وہ بابا ٹل ہی ہے۔ اس کے بڑے بڑے ٹلوں والا سنگل ویسے ہی پڑا ہے۔ کاش معاشرے میں موجود ہر گالہڑ شاہ کے لئے ایک بابا ٹل پیدا ہو جائے تو ہمارا معاشرہ اس لعنت سے پاک ہو جائے۔

+++

بیٹا پاکستان کا بیٹی ساہوکار کی

محترم صابر حسین راجپوت نے بھی تحریکِ پاکستان میں کام کیا اور اُن کے کُتوں نے بھی۔ اُن کے راستے میں ایک ہندو ساہوکار کی بیٹی آگئی جو تحریکِ پاکستان کے ایک قیمتی رکن کے پاؤں کی زنجیر اور حسین آسیب بن گئی۔ پاکستان کے نام پر مسلم لیگ کے بکس میں جانے والے آٹھ سو ووٹ خطرے میں پڑ گئے۔

اگست کا مہینہ آتا ہے تو ایک واقعہ یاد آجاتا ہے لیکن میں یہ واقعہ صرف اس لئے اپنے ذہن میں ہی دفن کر دیتا ہوں کہ میری کہانیاں پڑھنے والے خواتین وحضرات یہ نہ کہیں کہ لو جی، کُتوں کے ساتھ کُتوں کی طرح بھاگنے دوڑنے والا دیہاتی تحریکِ پاکستان کا ہیرو بن رہا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ہمارے کُتوں اور ہم میں یہی ایک فرق تھا کہ وہ بھونکتے تھے اور ہم باتیں کرتے تھے یا یہ ایک فرق تھا کہ وہ ننگے رہتے تھے اور ہم شلواریں پہنتے تھے۔

میں اسی ڈر سے یہ واقعہ ہر سال یاد کر کے ذہن کے اسی خانے میں پھینک دیا کرتا تھا جہاں سے اس کی یاد اٹھتی تھی کہ مجھ پر ہیرو بننے کا الزام نہ عائد ہو جائے۔ میں اخباروں میں لوگوں کے انتقال کی خبریں پڑھا کرتا ہوں۔ ان میں میری عمر کے جو بوڑھے انتقال فرماتے ہیں، ان کے پسماندگان خبر میں یہ الفاظ ضرور لکھواتے ہیں کہ مرحوم تحریکِ پاکستان کے سرگرم رکن تھے یا مجاہد تھے یا یہ کہ مرحوم نے تحریکِ پاکستان میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ میں راولپنڈی کے ایک مرحوم کو جانتا ہوں۔ جس کی وفات کی خبر میں یہی الفاظ لکھے ہوئے تھے ــــ ''بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا'' ــــ جہاں تک میں انہیں جانتا تھا، اس کی حقیقت یہ تھی کہ مرحوم نے اگر تحریکِ پاکستان میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا تو انہوں نے پاکستان کے جنم دن سے لے کر اپنے مرن دن تک پاکستان سے اپنا حصہ بڑھ بڑھ کر اور چڑھ چڑھ کر وصول کیا تھا۔ ہندوؤں کے دو متروکہ مکانوں پر انہوں نے قبضہ کیا تھا، پھر درباری سیاست میں چلے گئے۔ ہر دیگ کا چمچہ بنے اور آزادی کے چونتیس سال پوری آزادی سے پاکستان کی جڑوں میں پانی دیتے اور اپنے بوٹے ہرے کرتے رہے۔ مرتے وقت ان کے ہاتھ تو سکندرِ اعظم کی طرح خالی تھے لیکن پسماندگان کی جھولیاں بھر گئے تھے۔

تحریکِ پاکستان میں تو ہمارے کُتوں نے بھی حصہ لیا تھا۔ 1946ء کے آخر میں جب الیکشن کی پروپیگنڈہ مہم شروع ہوئی تو ایک روز پانچ چھ ہندو جو کانگرس کے ورکر تھے، ہمارے گاؤں میں یہ پروپیگنڈہ کرنے آئے کہ کانگرس پارٹی ہندوؤں کی پارٹی نہیں بلکہ یہ

ہندوستانیوں کی پارٹی ہے جس میں مسلمان خاص طور پر شامل ہیں۔ ثبوت یہ پیش کیا کہ مولانا ابوالکلام آزاد جیسے عالمِ دین اور مفسرِ قرآن اور غفار خان اور ان کے بھائی خان صاحب کانگرس کے لیڈر ہیں۔

ہم بڑے آرام سے اپنے کُتے لے آئے اور ان کانگرسی ورکروں کے پاس آ کر ان کے پٹوں سے زنجیریں اتار دیں۔ کُتے ہماری آنکھوں کے بھی اشارے سمجھتے تھے۔ انہوں نے کانگرسیوں کو پہلے سونگھا پھر ان پر غرانے لگے۔ کانگرسی ورکروں نے ہمارے کُتوں کی تعریفیں کیں لیکن کُتے اتنی سیاست ضرور سمجھتے تھے کہ سونگھ کر اپنے اور پرائے کا فرق جان لیتے تھے۔ انہوں نے ان ہندوؤں کو سونگھ کر معلوم کر لیا تھا کہ یہ مسلمانوں کے نمائندے نہیں ہو سکتے۔ چنانچہ انہوں نے غرا کر ان ہندوؤں کو اپنے گاؤں سے ذرا جلدی نکل جانے پر مجبور کر دیا۔

تحریکِ پاکستان میں ہمیں ہمارے کُتوں نے ہی داخل کیا تھا۔ یہ 1946ء کا واقعہ ہے۔ اس وقت تک ہم شکار کھیل رہے تھے۔ ہماری عمریں تیس سال کے لگ بھگ تھیں۔ کسی کی ڈیڑھ ایک سال کم اور کسی کی تیس سال سے ڈیڑھ دو سال زیادہ ہو گئی تھی۔ ہم دو دو تین تین بچوں کے باپ بھی بن چکے تھے۔ ہماری ٹیم کے تین آدمی فوج میں چلے گئے تھے۔ اب ہم لڑکے نہیں آدمی بن گئے تھے لیکن ہماری مائیں ہمیں جن معنوں میں آدمی بنانا چاہتی تھیں۔ ہم وہ آدمی نہیں بنے تھے۔ شکار ہمارے لیے ہیروئن جیسا نشہ بن چکا تھا۔

1946ء کا ساون گزرا، بھادوں بھی گزر گیا اور موسم میں تپش ختم ہو گئی بلکہ سائے میں کچھ خنکی بھی آ گئی تھی۔ ایک صبح ہم نے حسبِ معمول کُتے کھولے اور شکار کو چل پڑے۔ میری سب سے پہلی کہانی کا عنوان تھا ___ ''لہو گرم رکھنے کا ہے اک بہانہ'' ___ اچھا عنوان تھا لیکن لہو تو ہماری ماؤں کا گرم ہوتا تھا جب ہم شکار کو روانہ ہوتے تھے۔ اب جبکہ میں بچوں کا باپ بن چکا تھا، ماں نے مجھے یہ کہہ کر شرمسار کرنا شروع کر دیا تھا ___ ''چٹی داڑھی آٹا خراب'' ___ تیس اکتیس سال کی عمر میں ہی میری ماں نے مجھے چٹی داڑھی کہنا شروع کر دیا تھا حالانکہ میری داڑھی تھی ہی نہیں۔ کبھی ذرا سی بڑھ آئی تو اس میں مجھے ایک بھی چٹا نظر نہیں آتا تھا۔

اللہ مغفرت کرے، میری ماں کا یہ فلسفہ مجھے کبھی بھی سمجھ نہ آیا۔ ایک طرف تو مجھے داڑھی کہہ کر بوڑھا قرار دے دیتی اور دوسری طرف یہ حال کہ گھر کے کسی مسئلے میں ماں فیصلہ ہم پر ٹھونستی اور میں اس کی مخالفت کرتا تو وہ کہتی ___ ''تو چپ رہ۔ ابھی تو تیرے

کے دانت بھی نہیں گرے اور چلا ہے میری بات کو رد کرنے'' ___ ایسی صورتِ حال میں ماں مجھے بچہ قرار دے دیتی تھی۔

معافی چاہتا ہوں۔ بڑھاپے میں یہی خرابی ہوتی ہے کہ جسم کی بچی کھچی طاقت زبان میں آ جاتی ہے۔ بوڑھا بات کہیں کی شروع کرتا ہے اور بے لگام گھوڑے کی طرح کہیں اور ہی نکل جاتا ہے۔ بات تحریکِ پاکستان کی شروع کی تھی اور ماں یاد آ گئی۔ یہ حقیقت ہے کہ جب اپنی اولاد کی اولاد پیدا ہونے لگتی ہے تو نانوں اور دادوں کو اپنی مائیں یاد آنے لگتی ہیں۔

اس روز غالباً ستمبر کے آخری دن تھے، ہم شکار کو نکلے تو ہماری ماؤں کی پھٹکار پہلے روز جیسی تھی اور ہمارا ڈھیٹ پن بھی پہلے روز جیسا تھا۔ کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ البتہ ایک تبدیلی نظر آ رہی تھی۔ وہ یہ کہ ہمارے تین چار کُتے بوڑھے ہو گئے تھے جن میں افضل کا بوبلی بھی شامل تھا۔ وہ تو بڑھاپے کی آخری سٹیج پر پہنچ گیا تھا لیکن شکار پر محسوس نہیں ہونے دیتا تھا کہ وہ بوڑھا ہو گیا ہے۔ چار کُتے مر چکے تھے اور ان کی جگہ پانچ نئے کُتے آ گئے تھے۔ بوبلی نے ان نئے کُتوں کو اپنے زیر کر لیا اور انہیں ذہن نشین کرا دیا تھا کہ بے شک وہ نوجوان ہیں، خوبصورت ہیں لیکن لیڈر اور حاکم وہ خود ہے۔ بوبلی آج کی سیاست والی ہارس ٹریڈنگ نہیں کیا کرتا تھا بلکہ وہ اپنی دھونس سے ٹیم میں آنے والے ہر نئے کُتے کو اپنے تابع کر لیا کرتا تھا۔

ہم حسبِ معمول گپ شپ لگاتے جا رہے تھے پہلے ہماری گپ شپ گاؤں کے کسی واقعہ کے متعلق یا کسی دوسرے گاؤں سے آئی ہوئی خبر کے متعلق ہوتی تھی۔ کئی اور موضوع ہوتے تھے۔ کچھ اِدھر اُدھر سے آئی ہوئی سنسنی خیز افواہیں ہوتی تھیں یا آپس میں ہنسی مذاق ہوتا تھا۔ اب ہم میں شادی شدہ ساتھیوں کی اکثریت ہو گئی تھی اس لئے گپ شپ کا ایک موضوع اور مل گیا تھا۔ وہ یہ کہ ہم ایک دوسرے سے ازدواجی زندگی کی پوشیدہ اور پیچیدہ باتیں پوچھتے اور لطف اٹھاتے تھے، لیکن اب 1946ء میں ہمیں ایک موضوع اور مل گیا تھا۔ یہ تھا پاکستان۔

پاکستان ابھی بنا نہیں تھا نہ ہی کبھی سوچا تھا کہ پاکستان بن جائے گا۔ ہم اتنا ہی جانتے تھے کہ ہندوستان کے جن صوبوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے، انہیں اکٹھا کر کے مسلمانوں کا ملک بنا دیا جائے اور اس کا نام پاکستان ہوگا۔ یہ خبریں ہمیں اخباروں سے ملنے لگی تھیں یا گوجر خان، جہلم اور راولپنڈی جانے آنے والے آدمی ہمیں یہ خبریں سناتے تھے۔ میری کہانیوں میں آپ نے اخباروں کا نام کبھی نہیں دیکھا ہوگا۔ گاؤں میں اخبار کہاں آتے

تھے۔ یہ تو جنگِ عظیم کی کرم نوازی تھی کہ گاؤں کے اردگرد کے چھوٹے چھوٹے گاؤں کے نوجوان فوج میں بھرتی ہو گئے اور مختلف محاذوں پر چلے گئے تھے۔ ان محاذوں کی خبر پڑھنے کے لیے گاؤں کا کوئی نہ کوئی آدمی قریب کے بڑے گاؤں یا قصبے سے اخبار لے اور سب کو پڑھ کر سناتا تھا۔

میں کہہ رہا تھا کہ اب ہماری گپ شپ میں سیاسی باتیں بھی شامل ہو گئی تھیں، چونکہ ہمیں واقفیت نہیں تھی اس لیے ہم اُوٹ پٹانگ اظہار خیال کرتے تھے۔ ایک بات صاف بتادوں کہ ہمارے دیہاتی اور کم فہم ذہن پاکستان کو قبول نہیں کرتے تھے۔ یہ خیال عقیدے کی طرح ہمارے دلوں پر بیٹھا ہُوا تھا کہ بادشاہی صرف انگریز کر سکتا ہے۔ ابھی ہم آزادی کا مطلب نہیں سمجھتے تھے۔ اس ''عقیدے'' کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ہمارا علاقہ فوجی تھا نوکری کا مطلب ہوتا تھا فوجی نوکری۔ جنگِ عظیم کی وجہ سے بھرتی اتنی زیادہ ہو گئی تھی کہ ایک گھر میں اگر تین بھائی جوان ہوتے تو تینوں نہیں تو دو فوج میں ہوتے۔ پرانے فوجی جب ترقیاں پا کر پنشن پر آتے تھے تو انہیں حکومت کی طرف سے نہری علاقے میں زمینیں ملتی تھیں۔ وہ انگریزوں کی تعریفیں اس طرح کرتے تھے جیسے انہیں خدا نے زمین پر بادشاہی کرنے کے لئے اتارا ہو۔ مجھے اپنے گاؤں کے ساتھ والے ایک گاؤں کے ایک فوجی افسر یاد آتے ہیں جو جنگِ عظیم میں لیفٹیننٹ کرنل کے عہدے تک جا پہنچے تھے۔ وہ اپنے انگریز بریگیڈیئر کی بات یوں کیا کرتے تھے —— ''بریگیڈیئر صاحب نے فرمایا.....''

ہم اُس روز شکار پر گئے تو گپ شپ اور ہنسی مذاق کے علاوہ پاکستان کے متعلق بھی باتیں کیں جو بے معنی اور فضول تھیں۔ اگر فضول نہیں تھیں تو بھی ہم ان باتوں میں سنجیدہ نہیں تھے۔ ہم چلتے جا رہے تھے۔ راستے میں ہم نے کُتوں کو کھلا چھوڑ دیا۔ میں آپ کو کُتوں کی اس شکار کی بات نہیں سناؤں گا۔ میں ایک اور واقعہ سنانا چاہتا ہوں۔

ہم بہت دور نکل گئے تھے۔ کُتے ہم سے آگے آگے جا رہے تھے۔ انہوں نے رُک کر پیچھے دیکھا۔ اچانک انہوں نے پھر آگے دیکھا اور ایک دوسرے کے پیچھے غراتے ہوئے بھونکتے ہوئے ایسے غائب ہو گئے جیسے انہیں زمین نے نگل لیا ہو۔ ہم دوڑ پڑے۔ دوڑنے کی وجہ یہ تھی کہ ذرا ہی پہلے ہم نے دور سے کُتوں کے بھونکنے اور غرانے کی آوازیں سنی تھیں۔ ہمیں ڈر یہ تھا کہ وہ کسی دوسری شکاری پارٹی کے کُتے ہوں گے اور ہمارے کُتے غائب ہوئے ہیں، یہ اُس پارٹی کے کُتوں سے الجھ پڑیں گے۔ ہم وہاں پہنچے جہاں کُتے غائب

ہوئے تھے تو ایسے لگا جیسے ہم دو منزلہ فلیٹ کی منڈیر پر کھڑے ہیں۔ وہاں زمین کی سطح ختم ہو گئی تھی۔ نیچے خاصی وسیع و عریض زمین تھی جس میں کھیت تھے اور درخت بھی تھے۔ ایک گھاٹی نیچے اترتی تھی۔

نیچے ہمیں وہی منظر نظر آیا جس کا ہمیں خطرہ تھا۔ سات آٹھ ہم جیسے مغز پھرے دیہاتی تھے اور اُن کے پانچ کُتے تھے۔ یہ ہمیں بعد میں اس پارٹی سے پتہ چلا کہ انہوں نے دو خرگوش دیکھے اور اُن پر کُتے چھوڑ دیئے۔ اوپر سے ہمارے کُتوں نے دیکھ لیا اور بڑی تیزی سے نیچے اتر گئے۔ خرگوش ان کے قریب آ گئے تھے۔ ہمارے گیارہ کُتے خرگوشوں پر جھپٹ پڑے۔ دوسری پارٹی کے کُتے بھی ہمارے کُتوں کی طرح بڑی اچھی نسلوں کے تھے۔ وہ غیرت اور جرأت والے تھے۔ ان دو خرگوشوں کو وہ اپنا شکار سمجھتے تھے۔ انہوں نے پرواہ نہ کی کہ دشمن کی تعداد زیادہ ہے۔ وہ شکار کے تعاقب سے نہ ہٹے۔ ہمارے کُتے تو اور زیادہ غیرت مند تھے۔ وہ خرگوشوں کے تعاقب سے ہٹ کر ان کُتوں پر ٹوٹ پڑے۔

ہم نے اوپر سے کُتوں کو اس معرکے میں دیکھا۔ ہمارے گیارہ کُتوں نے دوسری پارٹی کے پانچ کُتوں کو آپس میں تقسیم کر لیا تھا۔ ایک ایک کُتے کو دو دو کُتے بھنبھوڑ رہے تھے۔ اب ہمیں یہ خطرہ نظر آنے لگا تھا کہ ان کُتوں کے مالک ہمارے کُتوں کو زنجیریں، ڈنڈے اور پتھر مارنا شروع کر دیں گے پھر ہماری اور اُن کی لڑائی ہو گی۔ ہمارے علاقے کے لوگ لڑنے سے گھبرانے والے نہ اُس وقت تھے نہ آج ہیں۔ اس خطّے نے تین نشانِ حیدر پیدا کئے ہیں لیکن ہم لڑائی سے گریز کرنا چاہتے تھے۔

ہم دوڑتے ہوئے گھاٹی سے اترے۔ اتنی تیز کہ ہمارے دو ساتھی گرے اور لڑھکتے ہوئے ہم سے پہلے نیچے پہنچ گئے۔ یہ دیکھ کر ہمیں اطمینان ہُوا کہ دوسری پارٹی کے کُتوں کے مالک انہیں ہمارے کُتوں سے چھڑانے کی بجائے اُن کی ''ہلاشیری'' کر رہے تھے۔ ہم نے یہ بھی دیکھ لیا تھا کہ کُتوں کے مالک بھی اچھی نسل کے ہیں۔ وہ ہنس رہے تھے لیکن اُن کے کُتوں کے لئے یہ معاملہ ہنسی مذاق والا نہیں تھا۔ یہ ہمارا فرض تھا کہ اُن کے کُتوں کو بچائیں۔

اُن کے کُتوں نے اب بھاگنا شروع کر دیا تھا لیکن ہمارے کُتے انہیں بھاگنے نہیں دے رہے تھے۔ ہم نے اپنے کُتوں پر قابو پا لیا۔ دوسری پارٹی کے کُتے اپنے مالکوں کی ٹانگوں میں پناہیں ڈھونڈنے لگے۔ جن خرگوشوں پر یہ معرکہ لڑا گیا تھا وہ خیر و عافیت سے غائب ہو گئے تھے۔

کتوں کی فائر بندی کرا کے ہم نے دوسری پارٹی سے معذرت کی کہ ہمارے کتوں نے اُن کے کتوں کے رنگ میں بھنگ ڈال دی۔ اُن کا دل خوش کرنے کے لئے ہم نے اُن کے کتوں کی خوب تعریفیں کیں۔ ہمارے عزیز دوست راجہ شاہباز خان نے اپنی عادت کے خلاف عجز وانکسار کی باتیں کیں۔

"کچھ نہیں ہُوا بھائیو!"— اُس پارٹی کے ایک جوان آدمی نے کہا— "کتوں کا کام ہے لڑنا اور ہمارا شغل ہے تماشہ دیکھنا...... کون سے گاؤں سے آئے ہو؟"

راجہ شاہباز خان نے ہمارے گاؤں کا نام بتایا اور اُس سے اُس کا گاؤں پوچھا۔ اُس نے ایک گاؤں کا نام لیا۔ وہ بھی ہماری طرح اپنے گاؤں سے بہت دور آ گئے تھے۔

میں اس آدمی کا نام نہیں بتاؤں گا۔ الطاف لکھ دیتا ہوں۔ میں ہتکِ عزت کے مقدمے سے ڈرتا ہوں یہ شخص اب شخص یا آدمی نہیں رہا بلکہ سیاسی شخصیت بنا ہوا ہے حکومتوں کے ساتھ ساتھ اُس کی وفاداریاں بھی بدلتی رہتی ہیں۔ وہ ہر قسم کی سیاسی دیگ کا چمچہ ہے۔

کتوں کی لڑائی کے بعد ہم دوستوں کی طرح باتیں کرنے لگے۔ وہ اناڑی شکار تھے۔ اپنے ساتھ کھانے کے لئے کچھ بھی نہیں لائے تھے۔ ہمارے پاس کھانا تھا۔ ہم نے انہیں کھانے پر مدعو کیا۔ درختوں کے جھنڈ کے نیچے بیٹھ گئے اور ایک چادر بچھا کر میرے ساتھیوں نے اپنا اپنا کھانا چادر پر رکھ دیا اور ہم سب کھانے لگے۔

الطاف اس شکاری پارٹی کا سردار تھا۔ اُس کی دوگھوڑا بوسکی کی قمیض اور لٹھے کی شلوار بتا رہی تھی کہ وہ امیر خاندان کا فرد تھا۔ اُس کی عمر ستائیس اٹھائیس سال تھی۔ خوبرو اور قد آور جوان تھا۔ اُس کا باپ ریٹائرڈ صوبیدار میجر تھا۔ گاؤں میں اُس کی بہت ساری زمین تھی سبزیوں کا باغ بھی تھا اور نہری علاقے میں پانچ چھ مربعے زمین تھی۔ اس لحاظ سے وہ زمیندار تھا۔ صوبیدار میجری کی پنشن بھی تھی۔

الطاف کتوں اور شکار کا شوقین تھا۔ اُس کے پاس بارہ بور کی ایک نالی بندوق تھی۔ وہ بہت جلدی ہمارے ساتھ بے تکلف ہو گیا۔ اُس نے ہم سب کو کسی روز اپنے گاؤں آنے کی دعوت دی۔ اُسے ہمارے کتے اور ہمارا شغل بہت پسند آیا تھا۔ وہ ہماری طرح زندہ دل اور خوشگوار مزاج کا آدمی تھا۔

کھانا کھا کر ہم اُس کی پارٹی سے رخصت ہوئے۔ ہم اکٹھے شکار نہیں کھیل سکتے

کیونکہ اُن کے اور ہمارے کتے ایک دوسرے کے دَیری ہو گئے تھے۔ ہم نے راستے بدل لئے۔

تیسرے چوتھے روز ہمارے گاؤں میں پانچ چھ شہری آئے۔ میں چونکہ کسی کا بھی نام ظاہر نہیں کر رہا اس لئے ان پانچ چھ حضرات میں سے جن دو کے نام مجھے ابھی تک یاد ہیں وہ بھی نہیں لکھوں گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قائداعظمؒ کی وفات کے بعد پاکستان کی سیاست میں خوشامد اور انعام واکرام کا سلسلہ چل پڑا تھا۔ پھر وہ لوگ سیاست میں آ گئے جن کے پاس نہ تعلیم تھی نہ اُن کی کوئی سیاسی بیک گراؤنڈ تھی۔ ان میں صرف ایک خوبی تھی کہ وہ بے وقار اور خوشامدی تھے اور ایمان فروشی ان کا مذہب تھا۔ میں اپنے علاقے کی مثال پیش کرتا ہوں۔ 1946ء کے الیکشن میں مسلم لیگ نے ایک ایڈووکیٹ کو ٹکٹ دیا تھا جسے ہم نے کامیاب کیا۔ لیاقت علی خان مرحوم کی بادشاہی آئی تو انہوں نے الیکشن کا ڈھونگ رچایا۔ ہمارے علاقے کے منتخب نمائندے کو جو ایڈووکیٹ تھے اور جن کی نمائندگی نے ہمیں پاکستان دیا تھا، لیاقت علی خان کی مسلم لیگ نے نظر انداز کر دیا اور ایک اَن پڑھ ریٹائرڈ صوبیدار کو یہ یقین دلا کر ٹکٹ دیا کہ اُس کا کوئی خرچ نہیں ہوگا اور وہ پنجاب اسمبلی کے لئے کامیاب ہو جائے گا۔ ہم نے دیکھا کہ وہ کامیاب ہُوا۔

میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ آج بھی تحریکِ پاکستان کے کسی مخلص ورکر کا نام لو تو ایک دو آوازیں اُس کے خلاف اُٹھیں گی اور ثابت یہ کیا جائے گا کہ وہ سخت بے ایمان تھا اور وہ ہندوؤں یا انگریزوں یا دونوں کا جاسوس تھا— "پاکستان تو ہم نے بنایا ہے"— میں نے یہ الفاظ ایسے آدمیوں کی زبان سے سنے ہیں جو 1946ء کے تاریخی بلکہ تاریخ کا رُخ پھیر دینے والے الیکشن میں ہندوؤں کے اُجرتی ورکر بنے ہوئے تھے۔ میں تحریک پاکستان کے مخلص اور مجاہد ورکروں کا احترام اسی طرح کر سکتا ہوں کہ اُن کے نام نہ لوں ورنہ انہیں اندھیرے میں دھکیل کر خود آگے آنے والے لوگ اُن کی وجہ سے میری اس حقیقی کہانی پر جھوٹ کا لیبل لگا دیں گے۔

وہ پانچ حضرات ہمارے گاؤں آئے اور ہمارے بزرگوں سے ملے۔ انہوں نے انگریزوں سے آزادی حاصل کرنے اور اپنا الگ ملک بنانے کی باتیں کیں۔ انہوں نے اس ملک کا نام پاکستان بتایا۔ میں یہ تمام باتیں تفصیل سے سنانا ضروری نہیں سمجھتا۔ آپ کو معلوم ہی ہے کہ انہوں نے کیا باتیں کی ہوں گی۔ میں آپ سے زیادہ تعلیم یافتہ آدمی تو نہیں

ہوں۔

"کم عقلو!" — ہمارے ایک فوجی بزرگ نے کہا — "تعلیم اور کتابوں نے تم شہریوں کے دماغ خراب کر دیئے ہیں۔ اسی لئے ہم اپنے لڑکوں کو سکول کے قریب بھی نہیں جانے دیتے۔ کیا تم انگریزوں سے زیادہ عقلمند ہو؟ کیا تم گورے ہو جو حکومت کر لو گے؟"

اسی عمر کے اور اسی نسل کے ایک اور بزرگ وہاں موجود تھے۔ انہوں نے تو ان شہری حضرات کو طنزیہ باتوں سے بے حال کر دیا۔ یہ دونوں بزرگ پہلی جنگ عظیم میں فوج میں رہ چکے تھے۔ ایک جمعداری (نائب صوبیداری) عہدے پر اور دوسرا صوبیداری عہدے پر پنشن آیا تھا۔ انگریزوں کے دور میں جمعداروں، صوبیداروں اور صوبیدار میجروں کو وی سی او (وائسرائے کمیشنڈ آفیسر) کہا جاتا تھا اور انہیں ایک ایک کرِچ (سیدھی تلوار) ملا کرتی تھی جسے یہ لوگ اپنے مذہب کی مذہبی کتاب سے زیادہ مقدّس سمجھتے اور اس کی نمائش بڑے فخر سے کیا کرتے تھے۔

"اس گاؤں میں انگریز بادشاہ کی دی ہوئی گیارہ کرِچیں ہیں" — بوڑھے صوبیدار نے کہا — "ہم نمک حرام نہیں کہ اپنے بادشاہ سلامت کے خلاف بات کریں"۔

اپنے علاقے کے ان دو بزرگوں کی یہ دلیلیں بطورِ نمونہ پیش کر رہا ہوں۔ شہر سے جو مسلم لیگی ورکر دیہات میں پاکستان کے نام پر الیکشن کا پروپیگنڈہ کرنے آتے تھے انہیں ہر گاؤں سے ایسی ہی باتیں سننی پڑتی تھیں۔ جن اَن پڑھ اور پسماندہ دیہاتیوں کو انگریز نے کرِچیں اور نہری زمین مربعوں کے حساب سے عطا کی تھی اور جن سپاہیوں اور چھوٹے چھوٹے فوجی عہدوں والے لوگوں کو انگریز تنخواہ اور راشن وردی مفت دیتا اور بارکوں میں مفت رکھتا تھا، ان کا قبلہ وکعبہ تو ولایت (انگلینڈ) میں تھا۔

وہ بھی ہماری جان پہچان والا ایک ریٹائرڈ صوبیدار تھا جس نے شہر سے آئے ہوئے مسلم لیگی ورکروں سے کہا تھا — "کچھ عقل کرو بے وقوفو! حکومت گورنمنٹ کی ہے۔ رگڑے جاؤ گے"۔

گورنمنٹ سے اُس کا مطلب گوروں کی حکومت تھا۔

مسلمانوں کو مولوی دوزخ کی آگ سے ڈراتے ہیں لیکن انگریزوں کے یہ اَن پڑھ غلام آزادی کی بات کرنے والے کو کالا پانی سے ڈراتے تھے۔ آزادی کی اور پاکستان کی بات کرنے کو بغاوت کہتے تھے اور بغاوت کا جرم عمر قید تھا۔ باغیوں کو عمر قید کے لئے جزائر

ڈیمان بھیج دیا جاتا تھا۔ یہ جزائر کالا پانی کے نام سے مشہور تھے۔

اُس دور کی اور ہمارے دیہاتی علاقے کی اور بھی بہت سی دلچسپ باتیں ہیں جو میں اری کی ساری سنا نہیں سکتا۔ مسلم لیگیوں کو ایک مشکل تو یہ پیش آئی کہ انگریزوں سے زادی اور ایک الگ مسلمان مملکت کے تصور کو اپنے ذہن میں لانے کو ہی انگریزوں کے لاف بغاوت سمجھا جاتا تھا، دوسری مشکل یہ پیدا ہوگئی کہ ایک اور سیاسی پارٹی میدان میں آ ئی جس کا نام یونینسٹ پارٹی تھا۔ اس کے لیڈر انگریزوں کے زر خرید غلام تھے۔ شہنشاہ طانیہ نے انہیں جاگیریں عطا کی تھیں۔ یہ انگریز نواز پارٹی تھی جس میں ہندو بھی تھے، سلمان بھی، سکھ اور عیسائی بھی تھے۔ اس پارٹی کی باتیں ہمارے علاقے کے انگریز نواز گوں کے لئے قابلِ فہم اور برحق تھیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے یہ پارٹی ہمارے تمام تر دیہاتی لاقے پر قابض ہوگئی۔

مسلم لیگی ورکروں کو دھمکیاں ملنے لگیں کہ وہ دیہاتی علاقے میں آئے تو انہیں قتل کر دیا جائے گا۔ ان دھمکیوں کے باوجود مسلم لیگی دیہات میں آتے تھے اور وہ اپنی حفاظت کا اور اپنی باتوں میں تقدس پیدا کرنے کا یہ طریقہ اختیار کرنے لگے کہ جس گاؤں میں جاتے وہاں اُس مسجد میں جا بیٹھتے جس میں نمازِ جمعہ پڑھی جاتی تھی۔ وہاں وہ اللہ، رسولؐ اور قرآن کے حوالے سے بات کرتے تھے۔ آزادی اور پاکستان کی بات تو تھی ہی قرآن کی بات۔ لوگوں کے دِلوں میں یہ بات اُترنے لگی۔ البتہ مسجدوں کے مولویوں کو تکلیف پہنچی، وہ کہتے تھے کہ یہ لوگ مسجد میں آ کر دنیاوی باتیں کرتے ہیں لیکن لوگوں نے اِن "دنیاوی" باتوں کی طرف دھیان دینا شروع کر دیا تھا۔

میں بات کو پیچھے اُس جگہ لے جا رہا ہوں جہاں ہمارے کُتوں کی لڑائی ایک اور پارٹی کے ساتھ ہوگئی اور کُتوں کے مالکوں کے ساتھ ہماری دوستی ہوگئی تھی۔ اس پارٹی کا سردار ایک بڑے زمیندار اور ریٹائرڈ صوبیدار میجر کا بیٹا الطاف تھا۔ اُس دن سے تین یا چار دن بعد الطاف ہم سے ملنے ہمارے گاؤں آ گیا۔ اُس کے ساتھ اُس کا ایک دوست رحیم تھا۔ وہ بڑی تندرست اور اعلیٰ نسل کی گھوڑیوں پر سوار تھے۔ میں نے انہیں اپنے گھر مہمان رکھا۔ شکاری پارٹی کے سارے دوست میرے گھر جمع ہوگئے۔

سارا دن خوب گپ شپ رہی۔ تاش کی بازی بھی لگی اور ہنسی مذاق بھی ہُوا ہم انہیں رات کے لئے روکنا چاہتے تھے لیکن وہ شام کو یہ وعدہ لے کر چلے گئے کہ ہم اُن کے گاؤں

آئیں گے ۔ ہماری دوستی پکی ہو چکی تھی ۔ الطاف اور رحیم زندہ دل اور خوش مزاج تھے ۔

چار پانچ دنوں بعد میں، راجہ شاہباز خان اور افضل اُن کے گاؤں گئے جو ہمارے گاؤں سے سولہ سترہ میل دور تھا ۔ ہم گھوڑیوں پر گئے ۔ اُن کے شکاری دوست الطاف کے گھر اکٹھے ہو گئے ۔ کچھ دیر بعد الطاف کا والد ہمارے پاس آ بیٹھا ۔ اُس نے ہمارے ساتھ پیار اور شفقت سے بات کی لیکن اُس کے انداز اور لہجے میں صوبیدار میجروں اور بڑے زمینداروں والی اکڑفوں موجود تھی ۔

''دیکھو لڑکو!'' ___ صوبیدار میجر نے کہا ___ ''آج کل شہر سے کچھ لوگوں کی ٹولیاں آ رہی ہیں ۔ ایک ٹولی مسلمانوں کی آتی ہے دوسری ہندوؤں کی ۔ دونوں انگریزوں سے آزاد ہونے کی باتیں کرتی ہیں...... کیا یہ لوگ تمہارے گاؤں میں بھی آئے تھے؟''

''ہاں تایا جی!'' ___ راجہ شاہباز خان نے جواب دیا ___ ''مسلمانوں کی ایک ٹولی آئی تھی ۔ ہندوؤں کی ابھی نہیں آئی'' ۔

''آئے گی'' ___ صوبیدار میجر نے کہا ___ ''ہندو کانگرس پارٹی کے اور مسلمان مسلم لیگ پارٹی کے آدمی ہیں ۔ یہ دونوں پارٹیاں ایک دوسرے کے خلاف ہیں لیکن دونوں انگریزوں کے خلاف باتیں کرتی ہیں ۔ ان کی باتوں میں نہ آ جانا ۔ اگر یہ لوگ زیادہ بک بک کریں تو انہیں کہنا کہ انگریزوں نے تمہیں ہتھکڑیاں تو نہیں لگائی ہوئیں ۔ تمہارے پاؤں میں بیڑیاں تو نہیں ڈالی ہوئیں ۔ تم آزاد ہو اور کون سی آزادی مانگتے ہو؟ اپنے بزرگوں کو خبردار کر دینا کہ تم نے سرکار کے خلاف ایسی باتیں شروع کر دیں تو تمہاری پنشنیں بند ہو جائیں گی اور نہری زمینیں ضبط ہو جائیں گی ۔ سب کو سمجھا دینا'' ۔

ہم شام کو واپس آ گئے ۔

ہمارے گاؤں میں پہلے تو مسلم لیگی آتے تھے پھر کانگرسی آنے لگے ۔ وہ پاکستان کے خلاف باتیں کرتے اور کہتے تھے کہ کانگرسی تمام ہندوستانیوں کی نمائندہ پارٹی ہے ۔ مہاتما گاندھی کو وہ ایک درویش کی صورت میں پیش کرتے تھے لیکن دیہات پر ابھی غلبہ یونینسٹ پارٹی کا تھا ۔

وقت گزرتا چلا گیا ۔ ہم مسلم لیگیوں کی باتوں کے قائل ہوتے چلے گئے ۔ باتیں تو کانگرس پارٹی والے بھی ٹھیک ٹھاک کرتے تھے لیکن معلوم نہیں کیا وجہ تھی کہ ہمیں اُن کی باتیں اچھی نہیں لگتی تھیں ۔ پھر ہماری حالت یہاں تک پہنچی کہ ہمیں کچھ سوال پوچھنے کی ضرورت

محسوس ہونے لگی ۔ اپنے دوستوں میں ہم تین آدمی تھے جو ساری بات سمجھ گئے اور دوسروں کو بھی سمجھانے لگے ۔ اُس وقت کرنے والا کام یہ تھا کہ دسمبر میں ہونے والے الیکشن میں اپنے اُس مسلمان امیدوار کو کامیاب بنانا تھا جسے مسلم لیگ نے کھڑا کیا تھا ۔

اس دوران الطاف اور رحیم دو تین بار آئے اور میں اپنے دو دوستوں کے ساتھ اُن کے گاؤں گیا ۔ الطاف پر گومگو کی کیفیت طاری تھی ۔ ایک روز وہ حسبِ معمول رحیم کے ساتھ ہمارے گاؤں آیا تو اُس نے بات کی ۔

''ایک بات تو سمجھاؤ بھائیو!'' ___ اُس نے کہا ___ ''یہ آج کل جو نیا سلسلہ شروع ہوا ہے، اس میں مَیں کیا کروں؟ ہمارے گاؤں میں جو دس بارہ آدمی پڑھے لکھے ہیں وہ کہتے ہیں کہ مسلم لیگ کے ساتھ ہو جاؤ ۔ گاؤں میں دو سکول ٹیچر ہیں، وہ بھی یہی کہتے ہیں اور تو اور ہمارے گاؤں کی بڑی مسجد کے امام صاحب نے بھی یہ کہنا شروع کر دیا ہے کہ ایک طرف قرآنِ پاک اور دوسری طرف کافر ہیں ۔ اگر کافر ہونا چاہتے ہو تو اُن کے ساتھ ہو جاؤ'' ۔

''الطاف بھائی!'' ___ میں نے اُسے کہا ___ ''اس میں سمجھنے والی بات ہی کیا ہے ۔ مولوی صاحب نے ٹھیک کہا ہے ۔ ایک طرف قرآنِ پاک اور دوسری طرف کافر ہیں ۔ ہم قرآن پاک سے تو رشتہ نہیں توڑ سکتے'' ۔

''لیکن ہم سے مسلم لیگ والے کروانا کیا چاہتے ہیں؟'' ___ الطاف نے پوچھا ۔

''دسمبر کے مہینے میں ووٹیں پڑیں گی'' ___ میں نے جواب دیا ___ ''تم نے اپنا ووٹ، اپنے سارے خاندان کے ووٹ اور گاؤں کے جتنے ووٹ اکٹھے کر سکتے ہو یہ سب مسلم لیگ کے امیدوار کے بکس میں ڈلوانے ہیں'' ۔

''تین گاؤں ہیں جن کے ووٹ میرے ہاتھ میں ہیں'' ___ اُس نے کہا ___ ''اپنے گاؤں کی تمام چھوٹی ذاتوں کے لوگوں کو میں جو اشارہ دوں گا وہ اس پر عمل کریں گے لیکن میں اپنے والد صاحب کو کس طرح سمجھاؤں؟ وہ مسلم لیگ کا نام ہی نہیں سننا چاہتے ۔ انگریزوں کے خلاف کوئی بات برداشت نہیں کرتے'' ۔

''ایک طریقہ آزماؤ'' ___ راجہ شاہباز خان نے کہا ___ ''تم ماں باپ کے اکلوتے بیٹے ہو ۔ تم نے خود ہی بتایا تھا کہ تمہارے ماں باپ تمہاری ہر خواہش پوری کرتے ہیں اور تمہاری ناراضگی برداشت نہیں کرتے'' ۔

"یہ بات تو ہے" ——الطاف نے کہا—— "میں جھوٹ موٹ روٹھ جاؤں تو میری ماں اور والد صاحب تڑپنے لگتے ہیں"۔

"پھر سمجھو کام ہو گیا" ——راجہ شاہباز خان نے کہا—— "تم اپنے والد صاحب سے یہ کہو کہ انہوں نے مسلم لیگ کے امیدوار کو ووٹ نہ دیئے اور گاؤں والوں کے ووٹ نہ دلائے تو تم گھر سے چلے جاؤ گے"۔

"اصل بات یہ ہے الطاف!" ——افضل نے اُسے کہا—— "ہم نہ نماز پڑھتے ہیں نہ نیکی کا کوئی اور کام کرتے ہیں۔ روزے ہم دکھاوے کے رکھتے ہیں لیکن ہم مسلمان تو ہیں اگر ہم مسلمانوں کے خلاف ہو گئے تو سیدھے دوزخ میں جائیں گے"۔

تحریکِ پاکستان کی تاریخ تو آپ جانتے ہیں۔ 1946ء کے الیکشن میں ہی مسلمانوں کی جیت ہار پر فیصلہ ہونا تھا کہ مسلمانوں کا پاکستان کا جو مطالبہ ہے وہ تسلیم کیا جائے گا یا نہیں۔ مسلمانوں نے دوسری بات یہ ثابت کرنی تھی کہ مسلمان ایک الگ قوم ہیں اور اُن کی نمائندہ جماعت کانگرس نہیں مسلم لیگ ہے۔ دوقومی نظریے پر تو عالموں نے کتابیں لکھ ماری ہیں لیکن ہم پسماندہ دیہات کے لوگ دو جملوں میں جو میں نے لکھ دیئے ہیں، دوقومی نظریہ سمجھ گئے تھے۔ اتنی سی بات تو ہمارے کُتے بھی سمجھ گئے تھے۔ میں پہلے سنا چکا ہوں کہ ایک بار کانگرسی ہندو ہمارے گاؤں میں یہ پروپیگنڈہ کرنے آئے کہ کانگرس مسلمانوں کی نمائندہ جماعت ہے اور ہندو مسلم بھائی بھائی ہیں۔ اُس وقت تک ہمارے ذہن بیدار ہو چکے تھے۔ ہم اپنے کُتے لے آئے اور کانگرس کے ان ورکروں کے قریب چھوڑ دیئے۔ ہمارے ذرا سے اشارے پر کُتوں نے انہیں اپنی زبان میں اور اپنی حرکتوں سے بھگا دیا۔

بات لمبی ہوتی جا رہی ہے۔ ذرا مختصر کر دیتا ہوں تا کہ آپ بور نہ ہوں۔ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ الطاف کا باپ اثر و رسوخ والا آدمی تھا۔ اس کی ایک وجہ تو اس کی بڑی زمینداری تھی اور دوسری وجہ یہ کہ اس کے تین بھائی اور سات آٹھ بھتیجے تھے۔ سب لٹھ باز تھے جسے ہماری زبان میں ڈانگ مار کہتے ہیں۔ اس برادری کا سربراہ الطاف اور اس کا باپ تھا۔ اردگرد کے تین گاؤں ان کے زیرِ اثر تھے۔ تمام چھوٹی ذاتیں اپنے آپ کو ان کے حکم کا پابند سمجھتی تھیں——احتراماً یا جبراً——اس طرح کم و بیش آٹھ سو ووٹ اِن لوگوں کے بلکہ الطاف کے ہاتھ میں تھے۔

الطاف کا ذہن ہم نے صاف کر دیا تھا۔ بعد میں معلوم ہُوا کہ اُس نے اپنے باپ کے ساتھ اچھی خاصی تو تو مَیں مَیں کی اور اُسے گھر سے ہمیشہ کے لئے نکل جانے کی دھمکی دے کر منوا لیا کہ اس کے تمام ووٹ مسلم لیگ کو دیئے جائیں گے۔

اتنی لمبی تمہید کے بعد یہاں سے اصل کہانی شروع ہوتی ہے۔ محترم عنایت اللہ نے اپنی کتاب "داستان ایمان فروشوں کی" میں سلطان صلاح الدّین ایوبی کی کہانیوں میں لکھا ہے کہ کس طرح صلیبی اور یہودی اپنی حسین، جوان اور تربیت یافتہ لڑکیوں کو جاسوسی کے لئے اور مسلمان زعما کی کردار کشی کے لئے بھیجا کرتے تھے۔ آپ نے سنا ہو گا کہ ہندو اپنی لڑکیوں کو اس مقصد کے لئے پاکستان میں استعمال کر رہے ہیں اور ہندوستان میں وہاں کے مسلمانوں کو اپنے شیشے میں اتارنے کے لئے ہندو لڑکیوں کا کھلم کھلا استعمال ہو رہا ہے۔

تحریکِ پاکستان کے دور میں مَیں نے سنا ہے کہ کالجوں میں مسلمان لڑکوں کو جو مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے سرکردہ تھے، مسلم لیگ سے ہٹانے کے لئے ہندو لڑکیوں نے اپنے حُسن کے جادو چلائے تھے۔

میں بھی ایسا ہی ایک واقعہ سنانے لگا ہوں جو پہلے اس لئے نہ سنایا کہ آپ یہ سمجھیں کہ میں ہیرو بن رہا ہوں اور آپ اس حقیقی واقعہ کو من گھڑت قصہ نہ کہہ بیٹھیں۔ میں قبر کے کنارے آ بیٹھا ہوں۔ یہ واقعہ اس لئے سنا رہا ہوں کہ ہماری نوجوان نسل کو پتہ چلے کہ آزادی کی جدوجہد میں قوم کا ہر فرد جہاں کہیں بھی تھا اور جو کچھ بھی تھا اور جو کچھ وہ کر سکتا تھا، اُس نے کیا تھا، بغیر کسی لالچ کے اور یہ بھی حقیقت ہے کہ آزادی کے تحفظ کے لئے بھی قوم کے ہر فرد کو اسی طرح بلکہ اس سے زیادہ کام کرنا ہو گا جتنا آزادی کے حصول کے لئے کیا تھا۔ دیکھ لیں ہماری قوم خود غرضی اور مفاد پرستی پر آ گئی ہے اور آزادی خطرے میں پڑ گئی ہے۔

کہانی یوں سنی کہ الطاف نے اپنے گاؤں اور اپنے زیرِ اثر ہر گاؤں کے لوگوں کو مسلم لیگ کے جھنڈے تلے جمع کرنا شروع کر دیا اس سے پہلے کانگرسی بہت خوش تھے کہ یہ سات آٹھ سو ووٹ مسلم لیگ کو نہیں ملیں گے۔ یہ ووٹ کانگرس کو بھی نہیں مل رہے تھے کیونکہ الطاف کا باپ یونینسٹ پارٹی کا پیروکار تھا پھر بھی کانگرس کو امید تھی کہ ان ووٹوں کی کچھ تعداد اُن کے ہاتھ آ جائے گی۔ بہر حال کانگرسیوں کو یہی اطمینان کافی تھا کہ یہ ووٹ مسلم لیگ کو نہیں مل رہے۔ مسلمانوں کے لئے یہ زندگی اور موت کا سوال تھا۔ ہندو اتنے دولت مند تھے کہ ووٹ خرید بھی سکتے تھے مسلمانوں کے پاس اتنا پیسہ نہیں تھا۔ اللہ کے فضل و کرم سے ہمارا

تمام علاقہ مسلم لیگی ہو گیا۔

ہمیں یہ خوشخبری ملی کہ الطاف ووٹ اکٹھے کرنے میں دن رات ایک کر رہا ہے تو ہم بہت ہی خوش ہوئے۔ ادھر ہم نے کُتوں کے شکار کو روک دیا تھا۔ پھر اپنے گاؤں کے بوڑھے جمعداروں اور صوبیداروں پر ہم نے قابو پا لیا تھا۔ وہ اس طرح کہ ہم اُن کی بات ہی نہیں سنتے تھے۔ یہ نہ سمجھیں کہ اُن کے خیالات میں انقلاب آ گیا تھا۔ ہم انہیں اگلے جہان کے عذاب سے ڈراتے تھے تو وہ ہمیں انگریزوں سے ڈراتے تھے۔ حقیقت یہ تھی کہ نہ وہ دوزخ کے عذاب سے ڈرتے نہ ہم انگریزوں سے ڈرتے تھے۔

الیکشن میں صرف ایک مہینہ رہ گیا تھا۔ مسلم لیگی ورکروں نے فہرستیں تیار کر لی تھیں۔ اب انہیں پروپیگنڈے کی ضرورت نہیں تھی۔ کانگرسیوں نے اپنی چکر بازیاں عروج پر پہنچا دی تھیں۔ وہ اب غریب کسانوں کو در پردہ روپے پیسے کا لالچ دے رہے تھے لیکن اب وہ کامیاب نہیں ہو سکتے تھے۔

انہی دِنوں ایک روز الطاف کا دوست رحیم ہمارے پاس بڑی خطرناک خبر لے کر آیا۔ اس نے بتایا کہ الطاف کا تو دماغ خراب ہو گیا ہے۔ اُس نے تفصیل یہ سنائی کہ اُن کے گاؤں میں ایک ہندو ساہوکار رہتا ہے۔ اُس کی چار بیٹیاں ہیں۔ بیٹا ایک بھی نہیں۔ ان چار بیٹیوں میں ایک جس کی عمر بیس اکیس سال تھی، بہت ہی خوبصورت ہے اور ابھی اُس کی شادی نہیں ہوئی۔ رحیم نے بتایا کہ الطاف پر اُس کا جادو چل گیا ہے اور الطاف دنیا کو بھول گیا ہے۔

مزید تفصیلات یہ ہیں کہ الطاف کا گاؤں ہمارے گاؤں سے بڑا تھا، وہاں ہندوؤں کے دس گیارہ گھر تھے، یہ تاجر تھے۔ ہمارے علاقے کی تجارت تھی ہی ہندوؤں اور سکھوں کے ہاتھ میں۔ دیہات میں چھوٹی سی دکان سے لے کر تھوک کے کاروبار تک پر ہندوؤں اوران کے بعد سکھوں کی اجارہ داری تھی۔ ہندوؤں میں چند ایک ساہوکارہ کرتے تھے۔ وہ زیور، مکان اور زمین گروی رکھ کر سود پر قرض دیتے تھے۔ مسلمانوں میں یہ خرابی تھی کہ مقدمہ بازی کو انہوں نے ہابی بنا رکھا تھا۔ خاندانی دشمنیوں کے تحت آپس میں خون خرابہ اور قتل کرتے اور کھیت گروی رکھ کر ہندو ساہوکاروں سے قرضے لیتے اور مقدمے لڑتے تھے۔ ساری عمر سود ادا کرتے رہتے اور آخر کار اصل زر کے عوض اپنی زمینیں ساہوکاروں کے حوالے کر دیتے تھے۔

الطاف کے گاؤں کا یہ ہندو ساہوکار بہت دولتمند تھا اور وہ سیاست میں بھی منہ مارتا ھا۔ مسلمانوں کے خلاف ہر ہندو کے دل میں تعصب ہوتا تھا لیکن یہ ہندو ساہوکار غیر معمولی لور پر متعصب تھا۔ وہ تو اس مقصد کے لئے ہر قیمت دینے پر تیار تھا کہ مسلمانوں کو پاکستان ملے۔ اپنے گاؤں کے چند ایک لوگوں اور کئی اور گاؤں کے لوگوں کی زمینیں اور مکان اُس کے پاس گروی رکھے ہوئے تھے۔ جو کسان اُسے نقد سُود نہیں دے سکتے تھے، اُن کا پیدا کیا وا اناج وہ اُٹھا کر منڈی میں دے آتا اور سُود کے ساتھ منافع بھی کما لیتا تھا۔ وہ تو پاکستان کو رد کنے کی خاطر اپنا دھرم بھی دینے کو تیار تھا۔

اُس کی بڑی بیٹی شادی شدہ تھی۔ دوسرے نمبر والی بیٹی اپنی بڑی اور دونوں چھوٹی ہنوں سے کہیں زیادہ خوبصورت اور زندہ دل تھی۔ مسلمان لڑکیوں کی طرح گاؤں میں اچتی کودتی پھرتی تھی لیکن اُس کے چال چلن پر ایک بھی دھبہ نہیں تھا۔ سنا تھا کہ گاؤں کے سلمان امیرزادے اُس کے ساتھ دوستی لگانے کے جتن کرتے رہتے اور منہ کی کھاتے تھے۔ وہ تو صحیح معنوں میں شہزادی تھی۔ اُسے روپے پیسے اور ریشمی کپڑوں کا لالچ نہیں تھا۔

اس لڑکی نے الطاف کو اپنے حُسن کے جادو میں لے لیا۔ ماں باپ کا اکلوتا بیٹا الطاف لاڈوں میں پلا تھا اس لئے باغی اور خودسر تھا۔ اُس کی بیوی تھی، چھوٹے چھوٹے دو بچے تھے۔ وہ انہیں بھی بھول گیا۔ الیکشن بھی اُس کے ذہن سے اُتر گیا لیکن لڑکی نے اُسے الیکشن یاد دلا کر اس طرح استعمال کرنا شروع کر دیا کہ الطاف مسلمان ووٹروں کا رُخ کانگرس کی طرف پھیرنے لگا۔ اُس نے مسلم لیگ کے خلاف پروپیگنڈہ شروع کر دیا تھا۔

میں راجہ شاہباز خان اور راجہ محمد افضل کو ساتھ لے کر الطاف کے گاؤں گیا۔ الطاف گھر نہیں تھا۔ اُس کا باپ اور اُس کی ماں کا یہ حال دیکھا جیسے ان کا اکلوتا بیٹا مر گیا ہو۔ دونوں رو پڑے۔ اُس کی بیوی بھی ہمارے پاس آ بیٹھی۔ وہ بھی رونے لگی۔ یہ تینوں کہتے تھے کہ اس ہندو جادوگرنی نے ان سے الطاف چھین لیا ہے۔ ہم نے پوچھا کہ الطاف ہے کہاں؟ انہوں نے بتایا کہ وہ تو دن رات اپنے رَہٹ پر رہتا ہے۔

رَہٹ سبزیوں کے باغ کے لئے بنایا گیا تھا۔ سبزیاں منڈی میں جاتی تھیں۔ باغ میں چھوٹا سا ایک مکان تھا۔ ہمیں بتایا گیا کہ ہندو لڑکی روزانہ رات وہاں جاتی ہے اور الطاف کے ساتھ کچھ وقت گزار کر آتی ہے۔ ہم تینوں الطاف کے والدین اور بیوی کو تسلی دلاسہ دے کر الطاف کے پاس چلے گئے۔ وہ اپنے باغ میں تھا۔

ہمیں دیکھ کر وہ بہت خوش ہُوا۔ پہلے کی طرح محبت اور گرمجوشی سے ملا۔ ہم نے اُ
بتایا کہ ہم کیا سن کر آئے ہیں۔ اُس نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ وہ اِس ہندولڑ
مسلمان کر کے اس کے ساتھ شادی کر رہا ہے۔ میں تفصیلات کیا سناؤں۔ اُس کی ذہنی
جذباتی حالت ایسی تھی جیسے اُس پر اس لڑکی نے کالے علم کا جادو کروا دیا ہو۔ ہم نے
لیگ اور آنے والے الیکشن کی بات چھیڑی تو اُس نے بیزاری اور بے رُخی کا اظہار کر
بات گول کر دی۔ رحیم ہمارے ساتھ تھا۔

ہم تینوں وہاں سے آ گئے اور ایک سکیم بنالی۔ رحیم نے ہمیں بتایا تھا کہ لڑکی ہر روز
بلا ناغہ فلاں وقت باغ میں جاتی اور کم و بیش ایک گھنٹہ وہاں گزار کر آتی ہے۔ ہم نے پہ
یہ سوچا تھا کہ اس لڑکی کے باپ کو ڈرائیں لیکن اس میں کچھ خطرے نظر آئے۔ آخر ہم
ایک اور سکیم بنالی جو رحیم کو سمجھا کر اپنے گاؤں آ گئے۔ ہم نے تو جیسے قرآن پاک پر ہاتھ
کر حلف اٹھا لئے تھے کہ اس لڑکی کو اغوا کرنا پڑے یا اس کے باپ کو قتل کرنا پڑے، الطاف
اس لڑکی کے جادو سے نکالیں گے۔

ہم نے رحیم کے ساتھ مل کر سکیم تو تیار کر لی۔ ہمیں اس ہندو ساہوکار پر اتنا غصہ تھا
ہم نے اغوا اور قتل تک کا ارادہ کر لیا تھا لیکن ہم جب اپنے گاؤں پہنچے اور شام کو تینوں دو
ٹہلتے ٹہلتے کھیتوں کی طرف نکل گئے تو تینوں چپ چاپ تھے۔ ایسی چپ تو ہمیں کبھی بھی نہ
لگی تھی۔ میں سمجھ گیا کہ میرے دونوں دوستوں ——راجہ شاہباز خان اور افضل —— کی
اندر سے وہی حالت ہو رہی ہے جو میری ہو رہی تھی۔

میری حالت یہ تھی کہ ہم الطاف کے گاؤں سے آئے اور اپنے گھروں کو چلے گئے
مَیں نے تنہائی میں اپنی سکیم پر غور کیا۔ اس سکیم کی عملی شکل کو میں تصور میں لایا تو میں نے
محسوس کیا جیسے میں بزدل ہو گیا ہوں۔ دلیر اور نڈر رہنا اور بات ہے لیکن کسی لڑکی کے ا
کسی کو قتل کرنے کے جُرم میں جس دلیری اور بے خوفی کی ضرورت ہوتی ہے وہ ہم تینوں
کسی میں بھی نہیں تھی۔ ہمارے علاقے میں خاندانی اور دیرینہ عداوتوں کی بنا پر لاٹھیو
کلہاڑیوں اور برچھیوں سے کھلی لڑائی میں خون خرابہ اور قتل معمولی بات ہی نہیں بلکہ
کارروائی سمجھی جاتی تھی۔ کسی کو کسی نے انتقامی طور پر قتل کرنا ہوتا تھا تو دن دہاڑے اور للکا
کیا جاتا اور قاتل اعلان کرتا تھا کہ میں نے اپنے خاندان کے خون کا بدلہ لے لیا ہے۔ ق
کا سراغ لگانے کے لئے کسی انسپکٹر احمد یار خان کی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔ قاتل خو

سامنے آ جاتا اور اگر اُسے پھانسی کی سزا ہو جاتی تو تکبیر اور یا علی کے نعرے لگاتا پھانسی کے
تختے تک جایا کرتا تھا۔

ہم جو واردات کرنے چلے تھے اسے ہم جرم نہیں سمجھتے تھے لیکن انگریزوں کا قانون
چلتا تھا جو اغوا اور قتل کو سب سے زیادہ گھناؤنے جرائم سمجھتا تھا۔ میری بزدلی یا دل میں ڈر
پیدا ہونے کی وجہ یہ بھی تھی کہ ہم نے یہ واردات ایسے طریقے سے کرنی تھی کہ پکڑے نہ
جاتے۔ اس کا ہمیں تجربہ نہ تھا۔ اگر ہم تینوں کو ایک سو ہندوؤں کے خلاف میدان میں اُتار
دیا جاتا تو ہم ڈرنے کی بجائے زیادہ دلیر ہو کر میدان میں اُترتے۔

''کوئی بات کرو یارو!''——راجہ شاہباز خان نے کھیتوں میں چلتے چلتے کہا——''ہم
تو لگتا ہے کہ کسی کے جنازے کے ساتھ جا رہے ہیں''——اُس نے میری طرف دیکھا اور
پوچھا——''کیا سوچ رہے ہو صابو؟''

''کل رات کی سوچ رہا ہوں''——میں نے کہا۔

''میں بھی یہی سوچ رہا ہوں''——افضل نے کہا۔

''سوچنا کیا ہے''——شاہباز نے کہا——''کل چلیں گے۔ رحیما وہاں موجود ہوگا۔
اگر شکنتو آ گئی تو اُٹھا لیں گے...... صابو! تم ڈر تو نہیں رہے؟''

''ڈر تو میں بھی رہا ہوں باز!''——افضل ہنس کر بولا۔

''پتہ ہے کیوں؟''——مَیں نے کہا——''ہم نے ایسی واردات کبھی کی نہیں، سوچی
بھی نہیں کبھی''۔

''اللہ مالک ہے صابو!''——راجہ شاہباز خان نے کہا——''ہم لڑکی کو اپنے لئے تو
نہیں اٹھائیں گے۔ اُسے کہیں لے جا کر بیچنا تو نہیں۔ ہم نے تو خدا کو راضی کرنا ہے۔ خدا
ضرور ہماری مدد کرے گا...... تم ووٹوں کو اور مسلم لیگ کو بھول جاؤ۔ یہ دیکھو کہ ایک کافر لڑکی
نے ہمارے ایک اچھے بھلے مسلمان بھائی کو اپنے جال میں اس طرح لے لیا ہے کہ وہ اپنے
ماں باپ اور بیوی بچوں کو ہی بھول گیا ہے''۔

ہم تینوں دوستوں نے باتیں شروع کر دیں تو مجھ میں بُزدلی کا جو احساس پیدا ہو گیا تھا
وہ ختم ہو گیا، مگر ایک ڈر پھر بھی دِل پر سوار رہا۔ وہ یہ تھا کہ اگر ہم اپنی سکیم میں کامیاب ہو گئے
تو الطاف کا ردِعمل کیا ہوگا۔ ہم اُس کے ردِعمل کی جو قیاس آرائیاں کرتے تھے وہ خطرناک
نظر آتی تھیں۔

اُسی شام کا واقعہ ہے کہ ہمارے لہو کو گرمانے کا ایک بہانہ مل گیا۔ ہمارے گاؤں
رہنے والا ایک حوالدار ایک مہینے کی چھٹی آ گیا۔ ہمارے گاؤں کے قریب چھوٹا سا ایک
گاؤں تھا جو آج کل ہمارے گاؤں کا حصہ بن گیا ہے۔ اس گاؤں کا ایک آدمی نیوی میں پیٹی
آفیسر تھا۔ وہ دو تین دن پہلے چھٹی آیا تھا۔ اُس کی چھٹی بھی ایک مہینہ تھی۔ اس حوالدار
پیٹی افسر کو ان کے گھر والے رو پیٹ چکے تھے کیونکہ وہ دونوں جنگ عظیم میں جاپانیوں کے
جنگی قیدی ہو گئے تھے۔ چار سال گزر گئے تھے، ان کی کوئی خبر نہیں ملی تھی۔ فوجی سناتے تھے
کہ جاپانی جنگی قیدیوں سے صبح سے رات تک مشقت کرواتے ہیں اور انہیں بھوکا مار دیتے
ہیں۔

یہ افواہیں غلط نہیں تھیں۔ ہمارے علاقے کے چند ایک فوجی جن کی یہ سرکاری
اطلاعیں آئی تھیں کہ جاپان کی فوج نے جنگی قیدی بنا لیا ہے، آج تک واپس نہیں آئے
نیوی کا یہ پیٹی آفیسر اور بلوچ رجمنٹ کا حوالدار اس طرح آئے جیسے اگلے جہان سے واپس
آئے ہوں۔

حوالدار جس روز آیا، اُسی شام کو وہ گاؤں میں باہر بیٹھ گیا۔ یہ دیہاتیوں کی روزمرہ
کی محفل ہُوا کرتی تھی۔ مَیں جس شام کا واقعہ سنا رہا ہُوں، اُس شام کی محفل میں گاؤں کے
تقریباً سبھی آدمی موجود تھے۔ سب حوالدار کی باتیں سننے آئے تھے۔ ساتھ والے گاؤں
سے پیٹی آفیسر بھی آ گیا تھا اور اِس محفل میں موجود تھا۔ وہ حوالدار سے ملنے آیا تھا۔ پتہ چلا
کہ یہ دونوں جنگی قید میں اکٹھے رہے ہیں۔

یہ دونوں گاؤں کے لوگوں کو جنگ کی اور اپنی قید کی باتیں سنا رہے تھے۔ ہم بھی اس
محفل میں موجود تھے۔ ہمارے لئے اُن کی ہر بات دلچسپ تھی لیکن مَیں آپ کو اُن کی صرف
ایک بات سناؤں گا جو میری اِس کہانی کی ضرورت کے مطابق ہے۔ محترم برادر احمد یار خان
کی بعض کہانیوں میں آپ نے انڈین نیشنل آرمی (آئی این اے) کے متعلق پڑھا ہوگا
مَیں اِس پیٹی آفیسر اور حوالدار کی زبانی اس کا مختصر سا ذکر کروں گا۔

آئی این اے کا تفصیلی تذکرہ بہت لمبا ہے۔ مَیں اس کا ایک اہم اور قابلِ غور حصہ
سناؤں گا۔ ہمارا علاقہ فوجی ہے۔ جنگ عظیم کے دوران فوجی محاذوں سے چھٹی پر آتے
رہتے تھے۔ برما فرنٹ سے آنے والے سنایا کرتے تھے کہ جاپانی فوج کے مورچوں کی
طرف سے لاؤڈ سپیکروں پر اُردو اور پنجابی زبان میں آوازیں آیا کرتی تھیں کہ ہندوستانیو

اپنے ملک کو انگریزوں سے آزاد کراؤ اور اس طرف آ جاؤ۔

فوجی ایسی کئی اور باتیں سنایا کرتے تھے جو سب کی سب سچّی نہیں ہو سکتی تھیں۔
ہمارے لوگ زیب داستان اور بات کا بتنگڑ بنانے کا شغل کیا کرتے ہیں۔ آخر ہمیں اسی پیٹی
آفیسر اور حوالدار سے سچی باتیں معلوم ہوئیں۔ یہ دونوں جنگی قیدی ہوئے تو انہیں ان کی
رضامندی سے آئی این اے میں شامل کر لیا گیا۔

انڈین نیشنل آرمی کی حقیقت یہ تھی کہ سبھاش چندر بوس ایک کٹر کانگرسی بنگالی ہندو
تھا۔ جنگ عظیم میں جاپان بھی شامل ہو گیا۔ اس کا بحری بیڑہ بحرالکاہل کے چھوٹے بڑے
جزیروں کو فتح کرتا ہُوا طوفان کی طرح ان ملکوں تک پہنچ گیا جو آج سنگا پور، ملائشیا اور
انڈونیشیا کہلاتے ہیں۔ اِن تمام علاقوں کو فتح کرتا ہُوا جاپان کا فوجی طوفان برما پر بھی چڑھ گیا
اور انگریزوں کی فوجیں بہت بُری طرح بھاگ آئیں۔ جاپانی فوج نے تھوک کے حساب
سے جنگی قیدی پکڑے۔ انگریزوں کی پوری پوری پلٹنوں سے جاپانی فوج نے ہتھیار
ڈلوائے اور انہیں جنگی قیدی بنایا۔

برما سے آگے ہندوستان تھا۔ جاپانیوں نے ہندوستان کو فتح کرنا تھا۔ سبھاش
چندر بوس کسی طرح جاپان پہنچ گیا اور جاپان کے بادشاہ کو شیشے میں اتار لیا۔ ظاہر ہے اُس
نے وہاں یہی کہا ہوگا کہ ہندوستان پر جاپان حملہ کرے گا تو ہندوستان کی پبلک جاپانی فوج
کی مدد کرے گی۔ برما پر جاپانیوں نے حملہ کیا تھا تو وہاں کی پبلک نے جاپانی فوج کی مدد اور
راہنمائی کی تھی۔

مختصراً یہ قصہ یوں بنا کہ جاپانیوں نے انگریزوں کی انڈین آرمی کے جنگی قیدیوں کی
ایک فوج بنالی اور اس کا کمانڈر انچیف سبھاش چندر بوس کو بنا دیا۔ اس فوج کو آئی این اے کا
نام دیا گیا۔ اس میں مسلمان، ہندو اور سکھ فوجی شامل تھے۔ بعض جنگی قیدیوں نے اس میں
شامل ہونے سے انکار کر دیا تھا۔ جاپانیوں نے ان کے ساتھ ایسا بُرا سلوک روا رکھا کہ ان
میں سے زیادہ تر زندہ نہ رہ سکے۔

انگریزوں نے برما پر جوابی حملہ کیا تو جاپانی پسپا ہونے لگے۔ اُس وقت تک آئی این
اے کو اتنی زیادہ شہرت مل چکی تھی کہ کوئی نہ کوئی فوجی اِدھر سے بھگوڑا ہو کر جاپانی فوج کے
مورچوں میں چلا جاتا اور اُسے آئی این اے میں شامل کر لیا جاتا تھا۔ انڈین نیوی کے چند
ایک جنگی جہاز بھی جاپانیوں نے پکڑ لئے تھے اور ان کے عملے کو جنگی قیدی بنا لیا تھا اس لئے

آئی این اے میں کچھ تعداد نیوی والوں کی بھی تھی۔

جاپانی فوجیں انگریزوں اور امریکیوں کے جوابی حملے کے آگے ٹھہر نہ سکیں اور پ
ہوتے ہوتے تباہ ہوتی گئیں۔ اس کی اور سبھاش چندر بوس کی بنائی ہوئی انڈین نیشنل آر
بنی بنائی رہ گئی۔ اس دوران سبھاش چندر بوس ہوائی جہاز میں کہیں جا رہا تھا کہ ہوائی جہا
ہوائی اڈے پر اُترتے ہوئے گر پڑا اور سبھاش چندر بوس مارا گیا۔

6 اگست 1945ء کے روز امریکہ نے جاپان کے ایک شہر ہیروشیما پر ایٹم بم گرا
جاپان سے ہتھیار ڈلوا لئے۔ جاپان اور سبھاش چندر بورس کی انڈین نیشنل آرمی کے افس
ہندوستانی فوج کے کیپٹن تھے، پکڑے گئے اور سپاہیوں اور چھوٹے عہدوں کے فوجیوں
چھوڑ دیا گیا۔ اِن میں ہمارے گاؤں کا یہ حوالدار اور ساتھ والے گاؤں کا یہ پیٹی آفیسر ش
تھا۔ ان دونوں نے آئی این اے کی اصل حقیقت اور سبھاش چندر بوس کے درپردہ عز
بتائے۔

انہوں نے بتایا کہ مسلمان اور سکھ فوجی اس لئے آئی این اے میں شامل ہوئے
کہ ہندوستان کو انگریزوں سے آزاد کرائیں اور جاپان ہندوستانیوں کو حکومت دے کر
فوجیں واپس لے جائے گا لیکن آئی این اے کے ہندو افسروں نے اپنے آپ کو ہندوستا
کا بادشاہ سمجھنا شروع کر دیا تھا۔ آہستہ آہستہ ان کے عزائم سے پردہ اٹھتا گیا اور یہ راز
کہ سبھاش چندر بوس نے جو کانگرسی ہندو تھا، جاپانیوں کے ساتھ یہ معاہدہ کیا تھا
ہندوستان کو فتح کر کے ہندوؤں کے حوالے کر دیا جائے گا اور یہاں صرف ہندوؤں
حکومت ہوگی۔ ہندوستان کے کانگرسی لیڈروں کو اس پلان کا نہ صرف علم تھا بلکہ وہ اس پلا
میں شامل تھے۔ وہ ہندوستان کی دوسری قوموں، خصوصاً مسلمانوں کو اپنا محکوم اور غلام
چاہتے تھے۔

پیٹی آفیسر تعلیم یافتہ آدمی تھا۔ حوالدار تو صرف واقعات سناتا تھا لیکن پیٹی آفیسر
کی باتیں کرتا اور سننے والوں کو ہندوستان کی سیاست سمجھاتا تھا۔ اُس نے ہمیں بتایا کہ
جو الیکشن ہو رہے ہیں انہیں ہم اُس قسم کے الیکشن نہ سمجھیں جو پہلے ہوتے رہے ہیں۔ اب
نے اِس ملک میں اپنی قسمت کا فیصلہ کرنا ہے۔ اگر ہم کانگرس کے اِس جال میں آگئے
کانگرس ہی مسلمانوں کی نمائندہ جماعت ہے تو یہ سمجھ لو کہ ہم نے اپنے ہاتھوں غلامی کی ز
اپنے گلے میں ڈال لی اور زنجیر ہندوؤں کے ہاتھ میں دے دی۔

''ہم اِس ہندو قوم کو قریب سے دیکھ آئے ہیں'' — پیٹی آفیسر نے کہا — ''اس کے
لیڈروں نے ہندوستان کو فوج سے فتح کر کے مسلمانوں کو غلام بنانے کی سکیم بنائی تھی۔ اب
سوچ لو۔ کانگرس کے امیدوار کو ووٹ نہ دینا۔ مسلم لیگ نے جو امیدوار کھڑا کیا ہے اُسی کو
ووٹ دینا خواہ اُس کے ساتھ تمہاری خاندانی دشمنی ہی کیوں نہ ہو''۔

دوسرے دن میں، شاہباز اور افضل پیٹی آفیسر کے گاؤں چلے گئے اور اُس سے مزید
باتیں پوچھیں۔ ہمیں اُس وقت ہندوستان میں مسلمانوں کی جدوجہد آزادی کی تاریخ کا علم ہی
نہیں تھا۔ مَیں میٹرک پاس تھا۔ محمود غزنوی کے سترہ حملے امتحان میں پاس ہونے کے لئے یاد
کئے تھے اور 1857ء میں ہندوستانیوں کی ''بغاوت'' اور ''غدر'' کے واقعات زبانی یاد کئے
تھے۔ سید احمد شہیدؒ کے نام سے بھی ہم واقف نہیں تھے۔ پیٹی آفیسر نے ہمیں آزادی کی
جدوجہد کی وہ کہانی سنائی جو سکول کی کتابوں میں آ ہی نہیں سکتی تھی۔ 1857ء میں ہندوؤں نے
جس طرح مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کے لئے انگریزوں کا ساتھ دیا تھا، وہ تفصیل سے سنایا۔

یہ ساری باتیں جو اُس وقت ہمارے لئے نئی تھیں، لکھنے کی ضرورت نہیں۔ ''حکایت''
میں یہ باتیں آ چکی ہیں اور آتی رہتی ہیں۔ ویسے بھی میری کہانیوں میں جن کے کردار کٹے
ہی ہوتے ہیں، آپ کو آزادی کے لئے جہاد اور تحریک پاکستان کی باتیں اچھی نہیں لگیں گی۔
میں اس سال کے اگست میں کچھ زیادہ ہی جذباتی ہو گیا ہوں۔ اس کی ایک وجہ تو بڑھاپا ہو
سکتا ہے کہ اپنے جذبات پر قابو پانے کی ہمت نہیں رہی اور دوسری وجہ یہ ہے کہ پاکستان
ذلت و رسوائی، تنگدستی اور جگ ہنسائی اور بے ایمانی کے اُس درجے تک پہنچ گیا ہے جہاں
سے اللہ کا خاص کرم ہی واپس لا سکتا ہے۔ یہ تباہی دیکھتے دیکھتے ہم اتنے مایوس اور پریشان
ہو جاتے ہیں کہ وہ وقت یاد آ جاتا ہے جو ہندوستان کے مسلمان اس ملک کو حاصل کرنے
کے لئے جدوجہد کر رہے تھے۔ آج میری اپنی جذباتی حالت ایسی ہو رہی ہے کہ ذہن
1946-47ء کے دَور میں چلا گیا ہے۔

لوگوں نے بے دریغ قربانیاں دی تھیں۔ ان کے مقابلے میں مَیں نے اور میرے
دوستوں نے کچھ بھی نہیں کیا تھا۔ مَیں وہی سناتا ہوں جو ہم سے ہو سکا تھا۔ الطاف کو ایک
ہندو لڑکی نے اپنے جال میں لے لیا تھا اور سات آٹھ سو ووٹ اُس کے ساتھ اس جال میں
آ گئے تھے۔ ہم نے اسی جال کو توڑنا تھا۔

میں سنا رہا تھا کہ ہم نے اس لڑکی کے اغوا کی یا اس کے باپ کے قتل کی سکیم تو بنا لی تھی

لیکن ہم تینوں دوست ڈر رہے تھے کیونکہ ہم نے ایسی واردات کبھی کی نہیں تھی۔ ہم نے دونوں وارداتیں ایک ہی بار نہیں کرنی تھیں۔ پہلے لڑکی کو اغوا کرنا تھا۔ اگر یہ واردات ناکام ہو جاتی تو اس کے باپ کو قتل کرنا تھا۔ ہمارے دلوں میں ڈر موجود رہا۔ خداوند تعالیٰ نے پیٹی آفیسر اور حوالدار کو بھیج دیا۔ انہوں نے ہمیں ہندوؤں کے جو مسلم کُش قصے سنائے، ان سے ہمارا حوصلہ مضبوط ہو گیا۔ ہمارا یہ ارادہ بھی مضبوط ہو گیا کہ اِس ہندو ساہوکار کے منصوبے کو ختم کرنے کے لئے ہم اپنی جانیں بازی پر لگا دیں گے۔

ہم نے اُس رات کارروائی کرنی تھی۔ سورج غروب ہونے کے بعد اندھیرا ہو گیا تو ہم تینوں دوست اپنی اپنی گھوڑیوں پر سوار ہوئے اور گاؤں سے نکل گئے۔ میں نے اپنی ماں، بیوی اور والد صاحب کو ایک اور گاؤں کا نام لے کر بتایا کہ وہاں شہر سے مسلم لیگ کے دو لیڈر آئے ہوئے ہیں انہوں نے بلایا ہے۔ آپ یہ سن کر حیران ہوں گے کہ ماں نے روکنے اور کوسنے کی بجائے دعاؤں سے رخصت کیا۔ صرف یہ کہا کہ کسی کے ساتھ لڑائی جھگڑا نہ کرنا۔ اگر میں ماں کو بتا دیتا کہ میں ایک لڑکی کو اغوا کرنے جا رہا ہوں تو ماں گھوڑی کی لگام پکڑ لیتی اور سارا گاؤں سنتا کہ ماں اپنے بیٹے کو کہیں جانے سے روک رہی ہے۔

الطاف کا گاؤں سولہ سترہ میل دور تھا۔ ہم نے ایک خاص وقت پر الطاف کے گاؤں اور اُس کے رہٹ کے درمیان پہنچنا تھا۔ وقت تھوڑا رہ گیا اور علاقہ کھڈ نالوں اور گھاٹیوں کا تھا۔ ہم نے گھوڑیوں کی رفتار خاصی تیز رکھی۔ ہمارے جانور اس علاقے کی اونچ نیچ سے واقف تھے۔ کہیں ٹھوکر نہیں کھاتے تھے۔

آسمان پر بادل گھرے ہوتے جا رہے تھے۔ سردیوں کا موسم شروع ہو چکا تھا۔ راتیں خاصی سرد ہو گئی تھیں۔ رحیم کو ہم نے انتظار کرنے کو کہا تھا، وہ وہاں کھڑا تھا۔ یہ جگہ اُس کے گاؤں سے اڑھائی تین فرلانگ دور تھی۔ وہ دوسری زمین کی نسبت گہری تھی۔ ہم نے گھوڑیاں وہاں ایک درخت کے ساتھ باندھ دیں اور اُسی طرف چل پڑے جس راستے سے ساہوکار کی بیٹی شگفتو الطاف کے پاس باغ میں جایا کرتی تھی۔

میرے دِل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ مجھے خیال آیا کہ ہم دو تین جرائم پیشہ آدمیوں کو جانتے تھے، ان میں سے کسی کو پیسے دے کر یہ کروا لیتے۔ میں نے ایک بار پھر اپنے آپ میں بزدلی محسوس کی۔ اس کا میں نے یہ علاج کیا کہ پیٹی آفیسر کی باتیں ذہن میں لے آیا۔

''اگر اس ملک میں ہندوؤں کی حکومت آ گئی تو یہاں ایک بھی مسجد سلامت نہیں

رہے گی'' ـــــ پیٹی آفیسر نے کہا تھا ـــــ ''اسلام کا نام ونشان مٹ جائے گا۔ مسلمانوں کو زبردستی ہندو بنایا جائے گا۔ ہماری عزت بھی سلامت نہیں رہے گی''۔

اور اس قسم کی چند اور باتیں تھیں جو پیٹی آفیسر نے کہی تھیں۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ مجھ جیسے دیہاتی اور پسماندہ لوگ اسلام کے نام پر جانیں تک قربان کر دیتے ہیں۔ زیادہ علم و فضل والے اور یونیورسٹیوں کی ڈگریوں والے ذرا سوچ سمجھ کر قدم اٹھاتے ہیں۔ میں نے پیٹی آفیسر کی باتوں کو اپنے ذہن میں تازہ کیا تو میرا حوصلہ جو ذرا کمزور پڑ گیا تھا پھر مضبوط ہو گیا اور ہم آگے بڑھتے گئے۔ اس کے ساتھ ہی پھوہار پڑنے لگی جو ذرا تیز ہوتی گئی۔ سردیوں کی بارش ایسی ہی ہُوا کرتی تھی جو کئی کئی دن بند نہیں ہوتی تھی۔ ہمیں افسوس یہ ہُوا کہ ہم جس کام کے لئے گئے تھے وہ چوپٹ ہو رہا تھا۔ ہم پھر بھی اُس جگہ پہنچ گئے جہاں ہم نے اپنے شکار پر جھپٹنا تھا۔

ہم نے یہ فیصلہ پہلے کر لیا تھا کہ لڑکی کو کون پکڑے گا۔ یہ کام مَیں نے اپنے ذمّے لیا تھا لیکن افضل نے کہا کہ یہ کام وہ کرے گا۔ آخر فیصلہ ہُوا کہ لڑکی کو رحیم پکڑے گا۔ رحیم چھپ کر بیٹھ گیا اور ہم تینوں دوست وہاں سے پیچھے ہٹ آئے اور ایک کھڈ میں بیٹھ گئے۔ پھوہار اور تیز تو نہ ہوئی لیکن کم بھی نہ ہوئی۔ وہ موسم ابھی سردیوں کی بارش کا نہیں تھا۔ ہمیں امید تھی کہ پھوہار رک جائے گی۔ بارشوں نے پندرہ بیس دنوں بعد شروع ہونا تھا۔ اُس زمانے میں موسم باقاعدہ ہوتے تھے۔ سب کو معلوم ہوتا تھا کہ یہ دن آندھیوں کے ہیں۔ آندھیاں ضرور آتی تھیں۔ موسم سرما کی بارش اپنے مخصوص دنوں میں ضرور آتی تھی۔ آج کل انسانوں کی طرح موسموں کا بھی کوئی اعتبار نہیں رہا۔ محکمہ موسمیات پیش گوئی کرتا ہے کہ آئندہ چوبیس گھنٹوں میں فلاں فلاں جگہ بارش ہوگی۔ اس پیشین گوئی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آسمان پر جو تھوڑے سے بادل نظر آتے ہیں وہ بھی اُڑ جاتے ہیں۔

رحیم اُس جگہ سے اٹھ آیا اور ہمارے پاس آ کر کہنے لگا کہ آج کام ہوتا نظر نہیں آتا۔

''کیا تم نے الطاف کو رہٹ پر جاتے دیکھا تھا؟'' ـــــ مَیں نے رحیم سے پوچھا۔

''ہاں بھائی!'' ـــــ رحیم نے جواب دیا ـــــ ''وہ اپنے معمول کے مطابق رہٹ پر چلا گیا ہے اور وہیں ہے۔ لڑکی اس بوندا باندی میں گھر سے نہیں نکلے گی''۔

''انتظار کر لیتے ہیں'' ـــــ راجہ شاہباز خان نے کہا ـــــ ''یہ تو ہلکی ہلکی پھوہار ہے۔ ہو سکتا ہے وہ آ جائے''۔

رحیم اپنی جگہ جا کر بیٹھ گیا۔ ہم نے اپنے اُوپر کمبل لئے ہوئے تھے جو بھیگتے جا رہے تھے۔ ہماری گھوڑیاں ایک درخت کے نیچے کھڑی تھیں اس لئے وہ پھوہار سے محفوظ تھیں۔ میرے اندازے کے مطابق ہم ڈیڑھ گھنٹہ وہاں انتظار کرتے رہے۔ لڑکی نہ آئی۔ کچھ وقت اور گزرا تو رحیم پھر ہمارے پاس آ گیا۔

"اب نہیں آئے گی" ——رحیم نے کہا—— "اُس کا وقت گزر گیا ہے"۔

"کچھ دیر اور انتظار کر لیتے ہیں" ——مَیں نے کہا—— "اتنی دُور سے آنا جانا آسان تو نہیں۔ ہوسکتا ہے آج ہی ہمارا کام ہو جائے"۔

رحیم پھر اپنی جگہ چلا گیا اور دو چار منٹ بعد ہی واپس آ گیا۔ آتے ہی کہنے لگا کہ سر نیچے کر لو، الطاف واپس آ رہا ہے۔ ہم جہاں چھپے ہوئے تھے وہ جگہ ایک کھڈ تھا۔ راستہ ہمارے قریب سے گزرتا تھا جو چند گزوں کی بلندی پر تھا۔ رحیم بھی ہمارے قریب آ کر بیٹھ گیا۔ اس کھڈ کے کنارے پر آک کے دو تین پودے اور دو تین جھاڑیاں تھیں۔ یہ ہمارے لئے بڑی اچھی اوٹ تھی۔

تھوڑی دیر گزری ہوگی کہ ہمیں ہلکی سی کھانسی کی آواز آئی۔ رات تو چاندنی تھی لیکن بادلوں کی وجہ سے روشنی بہت کم ہو گئی تھی۔ پھر بھی دور سے گزرتا ہوا آدمی سائے کی طرح نظر آ جاتا تھا۔ ہمیں الطاف گزرتا ہُوا نظر آیا۔ وہ رہٹ کی طرف سے آ رہا تھا اور اپنے گھر کو جا رہا تھا۔

اب تو لڑکی کے آنے کا امکان ختم ہی ہو گیا تھا۔ الطاف جب گاؤں میں داخل ہو گیا تو ہم اپنی گھوڑیوں کی طرف چلے گئے۔ رحیم وہاں تک ہمارے ساتھ آیا اور ہم رخصت ہو گئے۔

ہم جب اپنے گاؤں میں داخل ہوئے تو پھوہار بھی ختم ہو گئی۔ اپنے اپنے گھر جا کر گھر والوں سے کچھ جھوٹ بولے اور سو گئے۔

اگلی رات اُسی وقت ہم پھر گھروں میں پہلے سے طے کیا ہُوا ایک جھوٹ بول کر الطاف کے گاؤں کو روانہ ہو گئے اور اُسی جگہ پہنچے جہاں ہم نے گزشتہ رات گھوڑیاں چھوڑی تھیں۔ رحیم وہاں پہلے سے موجود تھا۔ ہم اُسی کھڈ میں جا بیٹھے۔ رحیم نے ہمیں بتایا تھا کہ الطاف رہٹ پر چلا گیا ہے۔ رحیم رہٹ کی طرف جانے والے راستے میں چھپ کر بیٹھ گیا۔

اُس رات موسم بالکل صاف تھا۔ چاندنی بہت ہی صاف تھی۔ رحیم ابھی چھپا ہی تھا کہ لڑکی آتی ہوئی نظر آئی۔ وہ ہم سے دور نہیں تھی۔ حسبِ معمول میرے دل کے دھڑکنے کی رفتار

تیز ہو گئی۔ مجھے یقین تھا کہ رحیم لڑکی کو پکڑ لے گا لیکن ڈر یہ تھا کہ لڑکی نے اگر چیخ ماردی تو خطرہ پیدا ہو جائے گا۔ رات کے سناٹے میں اور دیہاتی علاقے میں رات کی چیخ بڑی دور تک سنائی دیتی ہے۔

لڑکی رحیم کے قریب سے گزری۔ میں کچھ حیران ہُوا کہ یہ لڑکی کتنی دلیر ہے کہ رات کے وقت سنسان علاقے میں سے ایک غیر آدمی کے پاس جا رہی ہے۔ میں حیران اُس کے باپ پر بھی ہُوا کہ باپ ہوتے ہوئے وہ اپنی بیٹی کو کس طرح استعمال کر رہا ہے۔ مجھے پٹی آفیسر کی بات یاد آئی۔ اُس نے کہا تھا کہ ہندو مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کے لئے اس سے بھی زیادہ بے غیرتی کی حرکتیں کر گزرتے ہیں۔ پٹی آفیسر نے پنڈت چانکیہ کا نام لیا تھا جسے ہندو اپنا اوتار مانتے ہیں، اُس نے بتایا تھا کہ پنڈت چانکیہ نے ہندوؤں کو جو اصول بتائے ہیں ان میں ایک یہ بھی ہے کہ اگر تمہارا دشمن تم پر اچانک آ پڑے اور تم بھاگ نہ سکو تو اپنی بیوی کو دشمن کے حوالے کر دو اور اپنی جان بچاؤ۔

لڑکی جونہی رحیم کے قریب سے گزر کر ایک دو قدم آگے گئی، رحیم نے اُٹھ کر پیچھے سے اُس کے اُوپر کھیس پھینکا۔ ایک ہاتھ اُس کے منہ پر رکھا اور دوسرا بازو پیچھے سے اُس کے پیٹ اور کمر کے گرد لپیٹ کر اُسے گھسیٹ لیا۔ وہ تقریباً دو گز بلندی پر تھی جس کی ڈھلان تھی۔ رحیم اُسے نیچے گھسیٹ لایا۔ ہم اُٹھ کھڑے ہوئے۔ ہم نے اپنے چہرے پگڑیوں میں چھپا لئے تھے۔ ہم تینوں کے پاس کلہاڑیاں تھیں جن کے دستے رنگدار اور پھل چاندی کی طرح چمکتے تھے۔

"منہ سے آواز نہ نکالنا شکنتو!" —— ہم میں سے معلوم نہیں کس نے کہا—— "کلہاڑی سے گردن کاٹ دیں گے۔ چپ چاپ ہمارے ساتھ چلی چلو"۔

رحیم نے اُسے چھوڑ دیا اور اُس کے منہ سے بھی ہاتھ ہٹا دیا۔ اُس نے لڑکی کے اوپر پڑا ہُوا کمبل اس طرح کر دیا جس طرح سردی میں کمبل لیا جاتا ہے۔ لڑکی ذرا سی بولی تو اُسے ڈانٹ کر چپ کرا دیا گیا۔ رحیم نے اُسے آگے کو دھکیلا اور ہم چاروں اُس کے پیچھے چل پڑے۔ وہ رو رہی تھی۔ مُڑ مُڑ کر ہماری طرف دیکھتی تھی اور رحیم اُسے ہلکا سا دھکا دے دیتا تھا۔

ہم اُسے تقریباً تین فرلانگ دور لے گئے اور ایک ایسی جگہ قریب قریب کھڑے دو درختوں کے نیچے لے گئے جو وہاں کی زمین سے کچھ نیچے تھی۔ اُسے اپنے سامنے کھڑا کر لیا۔ وہ کانپ اور رو رہی تھی۔

''مجھے گھر لے چلو''۔۔۔ اُس نے روتے ہوئے کہا۔۔۔ ''میں تمہیں باپو سے جتنے پیسے کہو گے دلا دوں گی''۔

''ہمیں پیسے نہیں چاہئیں''۔۔۔ افضل نے کہا۔

''مجھے کہیں اور لے جاؤ گے؟''

''نہیں''۔۔۔ افضل نے اُسے کہا۔۔۔ ''یہیں سے چھوڑ دیں گے۔ شرط یہ ہے کہ ہماری بات مان لینا''۔

''مان لوں گی''۔۔۔ اُس نے کہا۔۔۔ ''لیکن تم چار آدمی ہو اور میں......''

وہ غلط سمجھ رہی تھی۔ ہم نے اُس کی یہ غلط فہمی دُور کر دی۔ اُس پر جو دہشت طاری تھی وہ میں بیان نہیں کر سکتا۔ تصور میں لائیں چار جوان آدمی، چہرے پگڑیوں میں چھپے ہوئے اور ہاتھوں میں چمکتی ہوئی کلہاڑیاں اور وہ نوجوان اور خوبصورت لڑکی، اُس کا تو کھڑے کھڑے دم نکل جانا چاہئے تھا۔ وہ بہت ہی خوبصورت لڑکی تھی۔

''ہم تمہیں اُس غرض سے یہاں نہیں لائے جس غرض سے تم الطاف کے پاس جایا کرتی ہو''۔۔۔ میں نے اُسے کہا۔۔۔ ''ہم تم سے کوئی اور بات منوانا چاہتے ہیں''۔

''تم جو کہو گے مانوں گی''۔۔۔ اُس نے میری بات پوری نہ ہونے دی۔ کہنے لگی۔۔۔ ''مجھے چھوڑ دینا''۔

''بات یہ ہے''۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔ ''آج رات کے بعد تمہارا الطاف کے ساتھ تعلق ختم ہے۔ تم اُس سے نہیں ملو گی۔ اگر تمہیں اُس کے ساتھ دیکھا گیا تو آج کی طرح تمہیں پھر اُٹھا لائیں گے۔ رات کو تمہارے گھر سے اُٹھا لائیں گے پھر تمہیں بہت خراب کریں گے اور قتل کر دیں گے''۔

''ہم صرف یہی نہیں کریں گے''۔۔۔ راجہ شاہباز خان نے کہا۔۔۔ ''تمہارے گھر ڈاکہ ڈالیں گے اور تمہارے گھر کا صفایا کر کے تمہاری دوسری بہنوں کو بھی اٹھا کر لے جائیں گے''۔

''ایسے ہی کروں گی''۔۔۔ لڑکی نے کہا۔۔۔ ''میں گھر سے باہر نکلنا چھوڑ دوں گی''۔

''ایک بات اور''۔۔۔ افضل نے کہا۔۔۔ ''آج تم الطاف کے پاس نہیں جا رہیں۔ ہم تمہیں چھوڑ دیں گے تو ہو سکتا ہے وہ تمہیں مل جائے۔ وہ تم سے پوچھے گا کہ کہاں سے آ رہی ہو تو کہنا کہ تمہاری طرح میرا ایک دوست اور بھی ہے، میں آج اُس کے پاس چلی گئی

تھی''۔

''وہ تو مجھے مارے گا''۔۔۔ لڑکی نے کہا۔

''تم مار کھا لینا یا بھاگ جانا''۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔ ''یہ نہ بتانا کہ تمہیں اٹھایا گیا تھا''۔

یہ ہماری سکیم کا ایک حصہ تھا۔ یہ سنانے سے پہلے میں اس ہندو لڑکی کی کچھ اور باتیں سناتا ہوں۔ اسے ہم نے وہاں بٹھا لیا اور کہا کہ وہ سچ بتائے کہ وہ الطاف کے پاس محبت کی خاطر جاتی ہے یا یہ کوئی اور چکر ہے؟

''اگر تم نے جھوٹ بولا تو بہت بُری موت ماریں گے''۔۔۔ راجہ شاہباز خان نے اسے کہا۔۔۔ ''کیا تم الطاف کے ساتھ شادی کرنے کے لیے مسلمان ہو جاؤ گی؟''

''نہیں''۔۔۔ لڑکی نے جواب دیا۔۔۔ ''سچی بات یہ ہے کہ یہ دھوکہ ہے۔ باپو کے پاس راولپنڈی سے دو آدمی آئے تھے۔ وہ کانگرس کے لیڈر تھے۔ وہ میرے باپو کے پاس بہت دیر بیٹھے رہے تھے۔ وہ چلے گئے تو باپو نے مجھے الگ بٹھا کر کہا کہ صوبیدار میجر کے بیٹے الطاف کو اپنے ساتھ باندھ لو اور اسے کبھی کبھار گھر بھی لے آیا کرو۔ میں نے دوسرے ہی دن اسے باندھ لیا''۔

شکنتو نے اپنا وہ پورا عمل سنایا جس سے اس نے الطاف کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی تھی۔ الطاف ساہوکار کے گھر بھی گیا۔ پھر ساہوکار الطاف کے پاس رہٹ پر جاتا رہا۔ ساہوکار کی بیٹی نے بتایا کہ ساہوکار نے الطاف کو کچھ رقم اور سونے کی ایک انگوٹھی بھی دی تھی۔

شکنتو کی باتیں سن کر ہم نے اپنی سکیم کے اگلے حصے پر عمل شروع کیا جو اس طرح تھا کہ افضل اور راجہ شہباز خان وہاں سے چلے گئے۔ انہوں نے گھوڑیوں کے پاس جا کر میرا انتظار کرنا تھا۔ میں لڑکی کے پاس بیٹھا رہا اور رحیم بھی چلا گیا۔ رحیم الطاف کے پاس چلا گیا تھا۔ یہ پہلے سے طے شدہ تھا۔ رحیم نے الطاف کو شکنتو کے متعلق گمراہ کرنا تھا جو رحیم نے کر لیا۔ اس نے بعد میں ہمیں بتایا تھا کہ الطاف کے ساتھ اس کی کیا باتیں ہوئی تھیں۔ اس نے بتایا کہ الطاف اپنے سبزیوں کے باغ کے باہر اس راستے پر کھڑا تھا جس راستے سے شکنتو نے آنا تھا۔ رحیم کو دیکھ کر وہ خوش نہ ہوا بلکہ اس نے رحیم سے کہا کہ تم اس وقت کدھر آ نکلے ہو یار!

''میں جانتا ہوں طافو!''۔۔۔ رحیم نے کہا۔۔۔ ''میں جانتا ہوں تم کس کے انتظار میں ہو''۔

''وہ آ رہی ہو گی یار!''۔۔۔ الطاف نے کہا۔۔۔ ''تم کھسکو یہاں سے۔ تمہیں دیکھ کر

وہ واپس نہ چلی جائے''۔

''وہ شاید آج نہیں آئے گی''___ رحیم نے کہا___ ''آئی بھی تو دیر سے آئے گی''۔

''تمہیں کیسے پتہ چلا کہ وہ نہیں آئے گی یا دیر سے آئے گی؟''___ الطاف نے پوچھا۔

''وہ اس وقت کسی اور یار کے پاس ہے''___ رحیم نے جواب دیا___ ''میں تمہیں یہی بتانے آیا ہوں۔ میں ویسے ہی کھیتوں کی طرف آ گیا تھا۔ شگفتو کو گاؤں سے نکلتے دیکھ جانتا ہوں وہ تمہارے پاس آیا کرتی ہے لیکن وہ راستہ بدل گئی اور اس طرف نیچے اتر گئی۔ مجھے شک ہوا۔ تم تو مانتے ہی نہیں ہو۔ اس کنجری نے کسی اور کو بھی یار بنایا ہوا ہے''۔

''وہ شگفتو نہیں ہو گی''___ الطاف نے کہا___ ''تمہیں غلطی لگی ہے''۔

''اوئے طافو!''___ رحیم نے کہا___ ''اس دھوپ جیسی چاندنی میں کسی کو پہچاننے میں غلطی نہیں لگ سکتی۔ فوراً میرے ساتھ چلو ورنہ اسے موقعہ پر نہیں پکڑ سکو گے''۔

''ٹھہر رحیمے!''___ الطاف نے کہا___ ''میں کلہاڑی لے آؤں۔ اگر میں نے شگفتو کو کسی اور کے ساتھ دیکھ لیا تو دونوں کو قتل کر دوں گا''۔

''پاگل نہ بن طافو!''___ رحیم نے کہا___ ''ایک بدکار اور دھوکے باز ہندوانی کے پیچھے تم پھانسی چڑھو گے؟ اس کا ساہوکار باپ پیسہ خرچ کر کے تمہیں پھانسی دلوا دے گا۔ خالی ہاتھ میرے ساتھ چلو''۔

الطاف اس کے ساتھ چل پڑا۔

''میں چھپ چھپ کر اس کے پیچھے گیا''___ رحیم راستے میں الطاف کو بتاتا گیا___ ''آگے ایک آدمی کھڑا تھا۔ میں ذرا اور آگے جا کر دیکھنے لگا۔ اس آدمی کو میں نہیں پہچان سکا کیونکہ وہ درختوں کے سائے میں تھا۔ شگفتو سیدھی اس کے بازوؤں میں چلی گئی۔ پھر میں نے ان کی ہر حرکت دیکھی۔ تمہارا خیال آ گیا کہ اس لڑکی کے پیچھے تم اپنی برادری اپنی قوم اور اپنے بچوں کو بھی بھول گئے ہوا اور کہتے ہو کہ وہ تمہاری بیوی بننے کے لیے مسلمان ہو جائے گی۔ اگر وہ تمہاری وفادار ہوتی تو تمہارے ساتھ یہ ناجائز یارانہ نہ لگاتی، مسلمان ہو جاتی''۔

''تم نے پھر وہی بکواس شروع کر دی ہے''___ الطاف نے کہا۔

''چلو، اپنی آنکھوں سے دیکھ لینا''___ رحیم نے کہا۔

میں نے لڑکی کو اپنے پاس بٹھایا ہوا تھا اور میں رحیم اور الطاف کا انتظار کر رہا تھا۔ سکیم

کے مطابق رحیم الطاف کے ساتھ اونچی آواز میں باتیں کرتا آ رہا تھا تاکہ مجھے دور سے پتہ چل جائے کہ وہ آ رہے ہیں۔ لڑکی مجھ سے بار بار پوچھتی تھی کہ ہم اس کے ساتھ کیا سلوک کریں گے۔ میں نے اسے ذرا دھمکا کر وہ بات پھر سمجھا دی جو پہلے سمجھا چکے تھے۔

''دیکھو شگفتو!''___ میں نے اسے کہا___ ''تم اتنی دیر سے ہمارے قبضے میں ہو۔ تمہارے ساتھ کوئی بیہودہ سلوک نہیں ہوا۔ اب بھی نہیں ہو گا لیکن ہم نے تمہیں جو بتایا ہے اس پر عمل کرنا ورنہ تمہارا پورا خاندان تباہ ہو جائے گا...... سنو۔ ابھی الطاف آئے گا۔ میں پہلے ہی یہاں سے چلا جاؤں گا۔ الطاف تم سے پوچھے گا کہ یہ کون تھا جس کے پاس تم بیٹھی ہوئی تھیں۔ کہنا کہ یہ میرا دوست تھا۔ الطاف تمہیں ڈانٹنے لگا، دھمکیاں دے گا لیکن تم نے اپنی بات پر قائم رہنا ہے۔ یہ بھی کہنا کہ میرے دو دوست اور بھی ہیں''۔

یہ ہماری سکیم کا لبِ لباب تھا جو میں نے اسے تفصیل سے سمجھا دیا۔

''میں تمہارا مطلب سمجھ گئی ہوں''___ اس نے کہا___ ''تم چاہتے ہو کہ طافو سے میں تعلق توڑ لوں...... کیا تم یہ مسلمانوں کی ووٹیں حاصل کرنے کے لیے تو نہیں کر رہے؟''

''اگر ہمارا مطلب یہ نہ ہوتا تو کیا تم جیسی حسین لڑکی کو ہم چھوڑ دیتے؟''___ میں نے کہا___ ''تم ہمارا مطلب سمجھ گئی ہو۔ ہمارے راستے سے ہٹ جاؤ ورنہ تمہیں بتا چکا ہوں کہ تمہارا، تمہاری بہنوں کا اور تمہارے سارے خاندان کا انجام کیا ہو گا۔ اپنے باپ کو بھی سمجھا دینا''۔

اتنے میں مجھے رحیم کی باتیں سنائی دینے لگیں۔ میں نے کچھ منٹ انتظار کیا۔ الطاف اور رحیم مجھے اپنی طرف آتے دکھائی دینے لگے۔ جب میں نے دیکھا کہ انہوں نے مجھے دیکھ لیا ہے تو میں اٹھا اور دوسری طرف دوڑ پڑا۔ رحیم نے الطاف سے کہا، وہ دیکھا۔ الطاف نے مجھے بہت بری گالی دے کر رکنے کے لیے للکارا۔ رحیم نے بعد میں بتایا کہ الطاف مجھے پکڑنے کے لیے دوڑنے لگا، لیکن رحیم نے اسے روک لیا۔

''تم اس تک نہیں پہنچ سکو گے''___ رحیم نے اسے کہا___ ''وہ اتنا زیادہ فاصلہ دے گیا ہے۔ ہم دونوں خالی ہاتھ ہیں۔ اس کے ہاتھ میں شاید کلہاڑی ہے۔ کلہاڑی نہ ہوئی تو چاقو تو ضرور ہو گا''۔

یہی وجہ تھی کہ رحیم نے الطاف کے ساتھ رہٹ سے چلتے کلہاڑی نہیں اٹھانے دی تھی۔ اسے تو معلوم تھا کہ یہ میں ہوں۔

''ادھر آ کافر کی بچی!''___ الطاف نے شگفتو کو اپنی طرف بلایا۔ وہ آئی تو اس کے منہ پر بڑی زور سے تھپڑ مار کر پوچھا___ ''یہ کون تھا؟''

شگفتو تیورا کر گری اور رونے لگی۔ الطاف نے اسے بازو سے پکڑ کر اور جھٹکا دے کر اٹھایا۔

''سچ بتا یہ کون تھا؟''___ الطاف نے گرج کر پوچھا۔

رحیم نے ہمیں بعد میں سنایا کہ لڑکی کے منہ سے بات نہیں نکلتی تھی۔ اسے ہم نے جو دھمکیاں دی تھیں، وہ ان سے بھی ڈرتی تھی۔

''معلوم نہیں کون تھا''___ لڑکی نے سسکتے ہوئے کہا۔

الطاف اسے ایک اور تھپڑ مارنے لگا تو رحیم اس کے آگے ہو گیا۔

''عورت ذات پر ہاتھ نہ اٹھاؤ طافو!''___ رحیم نے کہا___ ''تم نے دیکھ لیا ہے یہ اس یار کے پاس بیٹھی تھی۔ میں جانتا ہوں اس کے دو یار اور بھی ہیں''۔

الطاف تو غصے سے باؤلا ہوا جا رہا تھا اور رحیم اس پر قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اگر رحیم اسے چھوڑ دیتا تو وہ لڑکی کا گلا گھونٹ دیتا۔ لڑکی کو پتہ نہ چل سکا کہ رحیم ان چار آدمیوں میں سے تھا جنہوں نے پگڑیوں میں چہرے چھپائے ہوئے تھے نہ اسے یہ معلوم ہو سکتا تھا۔ اس چہرے کو شگفتو پہچانتی تھی۔ یہ اُس کے گاؤں کا آدمی تھا۔

''کیا تمہارے تعلقات دو اور آدمیوں کے ساتھ بھی ہیں؟''___ الطاف نے شگفتو سے پوچھا۔

شگفتو نے سر ہلایا جس کا مطلب تھا کہ اس کے تعلقات دو اور آدمیوں کے ساتھ ہیں۔

''اب میری بات سن شگفتو!''___ رحیم نے اسے کہا___ ''اگر میں طافو کو ڈھیلا چھوڑ دوں تو یہ تمہارا گلا دبا دے۔ میں جو پوچھوں اس کا ٹھیک جواب دے دے...... کیا تیرے باپ نے تجھے وہ ووٹیں اپنی طرف کھینچنے کے لیے طافو کے پیچھے نہیں ڈالا جو اس کے ہاتھ میں ہیں؟ جھوٹ بولو گی تو ہم دونوں تمہیں جان سے مار ڈالیں گے''۔

''ہاں!''___ اس نے کہا___ ''یہ ٹھیک ہے''۔

الطاف پھر اس کی طرف لپکا لیکن رحیم نے اسے پکڑ لیا۔

''بھاگ جا یہاں سے شگفتو!''___ رحیم نے لڑکی سے کہا۔

لڑکی بہت تیز دوڑ پڑی۔ الطاف کو رحیم نے بڑی مشکل سے اپنے قابو میں رکھا۔ ادھر میں، افضل اور راجہ شاہباز خان اپنی گھوڑیوں پر سوار ہو کر بہت دور نکل آئے تھے۔ ہمیں خطرہ نظر آ رہا تھا کہ ہمارے ڈرامے کا بھانڈہ پھوٹ گیا تو رحیم کے لیے بہت مشکل پیدا ہو جائے گی۔ ہم رحیم کے لیے پریشان تھے۔

اگلے روز رحیم ہمارے گاؤں آ گیا۔ اس کی باتیں سن کر ہمیں تسلی ہوئی۔ اس نے بتایا کہ الطاف تو جیسے سچ مچ پاگل ہو گیا تھا۔ کبھی کہتا کہ وہ اس لڑکی کو نہیں چھوڑے گا جو اسے دھوکہ دیتی رہی ہے اور کبھی کہتا کہ وہ لڑکی کے باپ کو قتل کر دے گا۔ رحیم نے الطاف کو گاؤں کے ایک جوان آدمی کا نام بتایا کہ اس کے ساتھ بھی شگفتو کا یارانہ ہے۔ اگلی صبح ہی سویرے سویرے رحیم اس آدمی کو الطاف کے پاس لے گیا۔ اس آدمی کو رحیم نے جھوٹ بولنے کے لیے تیار کیا ہوا تھا۔

''طافو کو شگفتو کی اصلیّت بتاؤ''___ رحیم نے اسے کہا___ ''یہ بھی بتاؤ کہ وہ تمہیں کس وقت اور کہاں ملتی ہے''۔

''جہاں اسے اشارہ کروں آ جاتی ہے''___ اس نے کہا___ ''یہ تو طوائف ہے طافو! میں نے تمہیں پہلے نہیں بتایا کہ تم مانو گے نہیں اور میرے گلے پڑ جاؤ گے''۔

طافو اس جھوٹ کو سچ مان گیا۔ حقیقت یہ تھی کہ شگفتو ایسی لڑکی نہیں تھی۔ رحیم نے ہمارے گاؤں آ کر یہ باتیں سنائیں۔ اس نے واپس جا کر طافو کو یہ پٹی پڑھائی کو ساہوکار سے انتقام لینے کا یہی ایک طریقہ ہے کہ ہندوؤں کو مسلمانوں کا ایک بھی ووٹ نہ ملے۔

طافو تیار ہو گیا اور ہندوؤں کے خلاف میدان میں اتر آیا اور پہلے سے زیادہ جوش و خروش سے مسلم لیگ کے لیے اپنے زیر اثر دیہاتیوں کو اکٹھا کرنے لگا۔ ہمارے ساتھ اس کی ملاقاتیں شروع ہو گئیں۔ رحیم نے ہمیں بتایا کہ شگفتو گھر سے باہر آتی ہی نہیں۔ میں آپ کو یہ بھی بتا دوں کہ اب الطاف کے اس جوش و خروش میں وہ جذبہ نہیں تھا جسے قومی جذبہ کہا جاتا ہے۔ اب وہ انتقامی جذبے کے تحت میدان میں اترا تھا۔ ہمیں ان ووٹوں کی ضرورت تھی جو اس کے ہاتھ میں تھیں۔ ہمیں اس کے جذبے سے غرض نہیں تھی۔

یہ سب ووٹ جن کی آخر میں تعداد چھ سو کے قریب تھی، مسلم لیگ کے پاس آ گئے۔ پھر الیکشن ہوئے اور ہم جیت گئے۔ اب تو میں یوں کہوں گا کہ ہم نے الیکشن نہیں جیتا بلکہ پاکستان جیت لیا۔ اسی الیکشن کی ہار جیت پر ہندوستان کے مسلمانوں کی قسمت کا فیصلہ ہونا

تھا۔ یہ فیصلہ مسلمانوں کے حق میں ہو گیا مگر ہمارے دوست الطاف نے اس کہانی کو یہیں
ختم نہ کیا۔ یہ بھی سن لیں۔

الیکشن ختم ہونے کے شاید ایک مہینے بعد الطاف اور رحیم کے گاؤں کا وہ آدمی ہمارے
گاؤں ہم سے ملنے آیا تھا جس سے رحیم نے الطاف کے آگے یہ جھوٹ بلوایا تھا کہ اس کے
شکنتو کے ساتھ تعلقات ہیں۔ اس نے بتایا کہ ایک روز پہلے رحیم اور الطاف کی بڑی سخت
لڑائی ہوئی ہے۔ لڑائی بھی ایسی کہ دونوں طرف سے لاٹھیاں اور کلہاڑیاں نکل آئیں۔ رحیم
بھی زخمی ہوا، الطاف بھی زخمی ہوا اور دونوں طرف سے دو دو تین تین زخمی ہو گئے۔ معاملہ
تھانے تک جاتے جاتے اس طرح رہا کہ دونوں طرف سے بزرگوں نے پیش امام اور شاہ
صاحب کو جو اس علاقے کے پیر تھے، درمیان میں لا کر راضی نامہ کرا دیا ہے۔

چونکہ الطاف اور رحیم ہمارے دوست تھے اس لیے ہم ان کی عیادت کے لیے ان
کے گاؤں چلے گئے۔ لڑائی کی وجہ تو معلوم کرنی ہی تھی، ہمیں غم یہ لگ گیا تھا کہ رحیم اور
الطاف دوست تھے اور ان کے خاندانوں میں بھی دوستانہ تعلقات تھے مگر اب ان کی خاندانی
دشمنی شروع ہو گئی تھی۔ اس زمانے میں ہمارے علاقے میں خاندانی دشمنیاں ایک رواج تھا
جس میں آئے دن خون خرابہ ہوتا تھا۔ کبھی ایک فریق کا ایک آدمی قتل ہو گیا کبھی دوسرے
فریق کا کبھی ادھر کے ایک دو آدمی پھانسی چڑھ جاتے کبھی ادھر کے۔ ہم اس ارادے سے
گئے تھے کہ اپنے ان دونوں دوستوں میں ایسی صلح صفائی کرائیں گے کہ ان کی دشمن ان کے
خاندانوں سے نکل جائے۔

پہلے ہم رحیم کے گھر گئے۔ اسے ایک لاٹھی کندھے پر لگی اور کلہاڑی کا ایک گہرا زخم
پیٹھ پر تھا۔ ہمیں دیکھ کر وہ ہنس پڑا۔ ہم نے الطاف کے ساتھ لڑائی کی وجہ پوچھی تو اس نے
بتایا کہ الطاف کو پتہ چل گیا ہے کہ شکنتو اور اس کے ساتھ ہم نے کیا ڈرامہ کھیلا تھا۔ اس پر ان
کی لڑائی ہوئی تھی۔

الطاف کے گھر گئے۔ اس کے بازو پر کلہاڑی لگی تھی اور دو لاٹھیوں کی دو ضربیں پیٹھ
پر لگی تھیں۔ لڑائی کی جو کہانی ہمارے سامنے آئی وہ اس طرح تھی کہ شکنتو کے ساتھ الطاف
کے تعلقات الیکشن سے پہلے ختم ہو گئے تھے۔ الیکشن کے بعد شکنتو نے باہر نکلنا شروع کر دیا۔
لڑائی سے ایک دو روز پہلے الطاف اپنے سبزیوں والے باغ میں گھوم پھر رہا تھا۔ شکنتو کہیں
سے آ رہی تھی۔ وہ باغ کے قریب سے گزری۔ الطاف کو دیکھ کر وہ رک گئی۔ الطاف اس کی

طرف چل پڑا۔

"میں تمہیں ایک بات بتانا چاہتی ہوں" ___ اس نے الطاف سے کہا۔

میرا خیال ہے کہ شکنتو کہیں سے آ نہیں رہی تھی بلکہ وہ یہی بات الطاف کو بتانے اور
الطاف اور رحیم کو آپس میں ٹکرانے کے لیے الطاف کے رہٹ پر گئی تھی۔ اس نے دیکھ لیا ہو گا
کہ الطاف رہٹ پر گیا ہوا ہے۔ وہ ہندو لڑکی تھی جسے زہریلی ناگن کہا جائے تو صحیح ہو گا۔
الطاف اسے باغ میں بنائے ہوئے اپنے مکان میں لے گیا۔

"ووٹوں کا معاملہ ختم ہو گیا ہے" ___ لڑکی نے کہا ___ "تمہارے دوست جو چاہتے
تھے وہ بھی ہو گیا ہے۔ اب میں وہ غلط فہمی دور کرتی ہوں جو تمہارے دل میں اس رات ڈالی
گئی تھی جس رات تم نے اپنے دوست رحیم کے ساتھ مجھے ایک آدمی کے ساتھ بیٹھا ہوا دیکھا
تھا۔ مجھے آج تک معلوم نہیں کہ وہ آدمی کون تھا۔ اگر وہ میرے سامنے آئے تو میں اسے نہیں
پہچان سکوں گی، کیونکہ اس نے پگڑی اپنے سر اور منہ پر لپیٹی ہوئی تھی۔ وہ چار آدمی تھے۔
مجھے پکا شک ہے کہ ان میں تمہارا دوست رحیم بھی تھا"۔

لڑکی نے الطاف کو سنایا کہ وہ اس کے پاس آ رہی تھی۔ راستے میں کسی نے اس پر کمبل
پھینکا اور اسے گھسیٹ کر نیچے لے گیا۔ ہم نے اس کے ساتھ جو باتیں کی تھیں وہ اس نے
الطاف کو سنائیں اور بتایا کہ ان چاروں میں سے ایک آدمی چلا گیا تھا۔

"انہوں نے مجھے کہا تھا کہ اب الطاف آئے گا" ___ لڑکی نے الطاف کو سنایا ___
"وہ تم سے پوچھے گا کہ یہ کون ہے جس کے پاس تم بیٹھی ہوئی تھیں۔ تم کہنا کہ یہ میرا دوست
ہے۔ انہوں نے مجھے دھمکیاں دی تھیں کہ تم نے اس طرح نہ کہا تو تمہاری دوسری بہنوں کو
بھی اغوا کریں گے اور تمہارے گھر ڈاکہ ڈال کر تمہارا گھر خالی کر دیں گے۔ انہوں نے یہ
بھی کہا تھا کہ تم کہنا کہ میرے تعلقات دو اور آدمیوں کے ساتھ بھی ہیں"۔

شکنتو نے الطاف کو بتایا کہ خوف سے اس کی تو جان ہی نکل گئی تھی۔ اس نے ڈاکوؤں
کی کہانیاں سنی تھیں جو سن کر وہ ڈر جایا کرتی تھی۔ اس رات وہ چار ڈاکوؤں کے ہاتھ لگ گئی
تھی۔ اس نے خوف کے مارے ان کی ہر بات مان لی۔

"وہ آدمی جو میرے پاس بیٹھا ہوا تھا، اس نے کہا تھا کہ یہ سب ووٹوں کا معاملہ
ہے" ___ شکنتو نے الطاف کو سنایا ___ "اس نے کہا تھا کہ الطاف سے تعلق توڑ لو اور گھر سے
باہر نکلنا چھوڑ دو۔ پھر رحیم تمہیں ساتھ لے کر آ گیا۔ تم خود سوچو طافو! مجھے انہوں نے کہا تھا

کہ اب طافو آئے گا۔ تم آ گئے تو میں سمجھ گئی کہ ان میں سے چوتھا آدمی جو چلا گیا ہے وہ تمہیں بلانے گیا ہے۔ تمہارے ساتھ جو آدمی آیا وہ رحیم تھا۔ کیا تم رحیم سے اب پوچھ نہیں سکتے کہ یہ کیا معاملہ تھا؟''

لڑائی کے بعد الطاف مجھے، افضل اور راجہ شاہباز خان کو شکنتو کی یہ باتیں سنا رہا تھا تو مجھے اپنی غلطی کا احساس ہو رہا تھا۔ ہم جرائم پیشہ تو تھے نہیں کہ ہمیں تجربہ ہوتا اور ہم ایسی غلطیاں نہ کرتے۔ ہم سے غلطی یہ ہوئی تھی کہ رحیم لڑکی کے سامنے چلا گیا تھا اور وہ الطاف کو ساتھ لے آیا۔ پھر مجھ سے غلطی یہ ہوئی کہ میں لڑکی کو یہ کہہ بیٹھا کہ ووٹوں کے معاملے میں ہمارے راستے سے ہٹ جاؤ۔

اس ہندولڑکی کی باتیں سن کر الطاف پر ایک بار پھر اس کا جادو سوار ہو گیا اور وہ غصے سے پھٹنے لگا۔ لڑکی کو گھر بھیج کر وہ رحیم سے ملا اور پوچھا کہ شکنتو کی یہ باتیں سچی ہیں یا جھوٹی۔ رحیم نے اسے کہا کہ ان ہندوؤں کی ذہنیت کو تم نہیں سمجھتے۔ یہ ہار کر ہمیں آپس میں لڑانا چاہتے ہیں۔ اس طرح کچھ اور باتیں کہہ سن کر رحیم نے اسے ٹال دیا۔

اگلے روز پھر الطاف نے رحیم کو گھیر لیا۔ رحیم نے پھر ٹال مٹول کی مگر اس سے اگلے روز الطاف نے رحیم کو کوئی سخت بات کہہ دی تو رحیم کے دماغ کو گرمی چڑھ گئی۔ اس نے ایک کی دو سنائیں اور ان کی لڑائی ہو گئی۔

ہم نے الطاف کو سمجھانے کی بہت کوشش کی کہ ہندو تمہیں ایک لڑکی کے ذریعے لڑا رہے ہیں لیکن وہ سمجھ ہی نہیں رہا تھا۔ اس کا غصہ اُتر ہی نہیں رہا تھا۔ بار بار کہتا تھا کہ رحیم وہ آدمی مجھے بتا دے جو اس رات شکنتو کے پاس بیٹھا ہُوا تھا۔ ہم اس کا غصہ ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرتے رہے لیکن وہ پہلے سے زیادہ بھڑک اٹھا۔ وہ مسلمان اور ہندو کا فرق بھول گیا۔ اس کا ارادہ یہ نظر آتا تھا کہ وہ رحیم سے انتقام لے گا اور قتل تک نوبت پہنچا دے گا۔ ہم تینوں دوستوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور آنکھوں آنکھوں میں طے کر لیا۔

''طافو!''___ راجہ شاہباز خان نے اسے کہا___ ''تم ہماری نیت سمجھ نہیں رہے۔ میں تمہیں بتاتا ہوں وہ آدمی کون تھا جس نے شکنتو کو اپنے پاس بٹھایا ہُوا تھا''___ شاہباز نے میری طرف اشارہ کر کے کہا___ ''وہ صابو تھا۔ افضل اور میں بھی ساتھ تھے۔ ہم گھوڑیوں پر آئے تھے اور ہم دونوں گھوڑیوں کے پاس کھڑے تھے''۔

''ہاں طافو!''___ میں نے کہا___ ''یہ جھوٹ نہیں...... اور یہ بھی جھوٹ نہیں کہ یہ

ہندولڑکی صرف تمہاری نہیں۔ اس نے تمہیں بیوقوف بنایا ہوا تھا''۔

''اور یہ بھی سن طافو!''___ راجہ شاہباز خان نے کہا___ ''اگر تم ٹھنڈے نہیں ہو گے تو تمہارے گاؤں میں اور ہر اس گاؤں میں جہاں تمہارے والد صاحب کا رعب داب چلتا ہے، ہم مشہور کر دیں گے کہ تم نے اور تمہارے والد صاحب نے شکنتو کے باپ سے رقم لے کر مسلمانوں کی ووٹیں ہندوؤں کی طرف دی تھیں اور ہم نے یہ ڈرامہ کھیل کر یہ ووٹیں مسلم لیگ کر دلوائی ہیں''۔

طافو خاموشی سے یہ باتیں سن رہا تھا اور ہم تینوں کی طرف باری باری دیکھتا تھا۔

''ہم یہ بات شکنتو کی زبانی مشہور کرا سکتے ہیں''___ افضل نے کہا___ ''تمہارے گاؤں کا بچہ بچہ دیکھتا رہا ہے کہ شکنتو رات کو تمہارے رہٹ پر جاتی تھی...... طافو بھائی دِل سے رحیم کی دشمنی نکال دو''۔

''اگر نہ نکالوں تو تم کیا کر لو گے؟''___ الطاف نے ذرا رعب سے پوچھا۔

''نہ نکالو''___ راجہ شاہباز خان نے کہا___ ''پھر ہمیں بھی اپنا دشمن سمجھو''۔

''پھر تم کسی کو نظر نہیں آؤ گے''___ میں نے کہا۔

اس پر وہ کچھ گرم ہُوا لیکن ہم نے اسے ٹھنڈا کر لیا اور وہاں سے آ گئے۔ بعد میں اس کے ساتھ کبھی کبھار ملاقات ہو جاتی تھی۔ اس دوران ساہوکار نے صرف اپنی بیوی کو اپنے پاس رکھا اور بیٹیوں کو گاؤں سے کہیں بھیج دیا۔ 14 اگست 1947ء سے پہلے ساہوکار اپنی بیوی کو ساتھ لے کر غائب ہو گیا۔ جب خبریں آنے لگیں کہ مشرقی پنجاب میں ہندوؤں اور سکھوں نے مسلمانوں کو قتل کرنا اور لوٹنا شروع کر دیا ہے اور ادھر سے مسلمان ہجرت کر کے آ رہے ہیں تو الطاف کے گاؤں کے لوگوں نے ساہوکار کے گھر کا تالا توڑا۔ اس کے گھر سے دو تین پرانے ٹرنک، کچھ کپڑے اور چند ایک برتن نکلے۔ وہ لوگوں کے گروی رکھے ہوئے زیورات ساتھ لے گیا تھا۔ لوہے کا سیف بالکل خالی تھا۔ مسلمانوں کو کام کی جو چیز ملی وہ بہی کھاتے تھے جن میں ان لوگوں کے کھاتے لکھے ہوئے تھے جنھوں نے اس سے سودی قرضے لیے ہوئے تھے۔ مقروضوں نے یہ کھاتے جلا ڈالے اور قرضے معاف ہو گئے۔

+++

بن سوچے گھر سے چل نکلی

اپنے باپ اور خاوند کے قدموں میں سر رکھ کر معافی مانگوں گی، کہوں گی مجھے ذبح کر دو۔

بن سوچے گھر سے چل نکلی

پہلے ہی میں بتا دیتا ہوں کہ اس کہانی میں شکار والی کوئی بات نہیں۔ یہ ایک واقعہ ہے۔ ہم گھروں سے نکلے تو شکار کے لیے ہی تھے لیکن شکار تک نوبت نہ آئی۔ شکار تو ایک بہانہ تھا ہم گھومنے پھرنے نکل گئے تھے۔ اس روز ہم صرف پانچ لڑکے تھے اور ہمارے ساتھ کُتے بھی پانچ ہی تھے۔ ہمارے باقی ساتھی اس وجہ سے ساتھ نہیں گئے تھے کہ موسم پر اعتبار نہیں تھا۔ مارچ کا مہینہ تھا اور بہار کی بارشوں کا موسم شروع ہو گیا تھا۔

آج کل کے لوگوں کی طرح آج کل کا موسم بھی بدل گیا ہے۔ مثلاً اسی سال کے ساون کو دیکھ لیں۔ ہمارے علاقے میں ساون کے مہینے میں آسمان پر ہر وقت بادل منڈلاتے رہتے تھے۔ اگر ہر روز نہیں تو ایک دن کا وقفہ پڑتا تھا، مغرب سے کالی گھٹا اٹھتی تھی اور چمکتی گرجتی بڑھتی آتی اور ایسا موسلا دھار مینہ برستا تھا کہ ندی نالے چڑھ جاتے اور ہر طرف پانی ہی پانی نظر آتا تھا مگر اب حال یہ ہے کہ ساون کے بادل شہروں کے لوگوں کی طرح پانی کو ترستے رہتے ہیں۔ بادلوں کی ٹوٹیاں شہروں کی ٹوٹیوں کی طرح خشک رہتی ہیں۔ اس سال کے ساون میں تو بادل بھی نہیں آئے۔ شاید شرم کے مارے نہیں آئے۔

موسمِ بہار کی بارشوں کا بھی دستور تھا۔ کالی گھٹا آتی اور کھل کر برستی تھی۔ بہار کی گھٹاؤں میں ایک خطرہ یہ ہوتا تھا کہ اولے بھی پڑتے تھے اور کبھی اتنے موٹے اولے پڑتے تھے کہ ایک اولے کا وزن نصف سے ڈیڑھ چھٹانک تک ہوتا تھا۔ دوسرا خطرہ یہ کہ بہار کی گھٹاؤں میں گرنے والی بجلی ہوتی تھی۔ اب وہ بات نہیں رہی۔ کبھی تو شک ہوتا ہے کہ خداوند تعالیٰ نے پاکستان کے بادلوں کا انتظام پاکستانیوں کے حوالے کر دیا ہے۔ اسی لیے بادلوں میں نہ پانی رہا ہے نہ بجلی۔

کچھ دن گزرے ہم چار پانچ بوڑھے اکٹھے بیٹھے گپ شپ لگا رہے تھے۔ بوڑھے جب مل بیٹھتے ہیں تو یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ آج کی نسل بدمعاش ہے اور ہم شریف ہُوا کرتے تھے۔ میری محفل کے دو بوڑھے ایسے ہیں جو جوانی میں شاید شریف ہوتے

ہوں گے، اب ان کے چال چلن کا یہ حال ہے کہ کوئی عورت قریب سے گزر جائے تو وہ عینکیں اتار کر صاف کرتے اور آنکھوں پر رکھ لیتے ہیں اور جب تک عورت جاتی نظر آتی رہتی ہے وہ دیکھتے رہتے ہیں۔

اس روز ہم گھر کے باہر بیٹھے آج کی اور اپنے کل کی باتیں کر رہے تھے۔ باتیں رشوت اور بے انصافی کی ہونے لگیں تو ایک بوڑھا بولا ــــ ''انگریزوں کی حکومت کی بات ہی کچھ اور تھی جی۔ کیا ٹائم پر بارشیں ہوتی تھیں۔ اب تو بدانتظامی کا یہ حال ہے کہ بارشیں ہوتی ہی نہیں، ہوتی ہیں تو بے ٹائمی ہوتی ہیں۔''

ہمارا ایک اور بوڑھا دوست جس کے سامنے عورت آ جائے تو سر جھکا لیتا ہے اور عورت قریب سے گزر جائے تو پیچھے مڑ مڑ کر دیکھتا رہتا ہے، کہنے لگا ــــ ''انگریزوں کے زمانے میں معمولی سی بھینس بھی تیرہ چودہ سیر روزانہ دودھ دیتی تھی۔ آج بھینس تین چار سیر سے زیادہ دودھ نہیں دیتی۔''

''اس لحاظ سے پاکستان بابرکت ہے۔'' ــــ میں نے کہا ــــ ''بھینس چاہے تین چار سیر ہی دودھ دے، گوالا تین کو تیرہ اور چار کو چودہ سیر بنا لیتا ہے۔''

معلوم نہیں یہ بڑھاپے کا فائدہ ہے یا نقصان کہ بوڑھا بات شروع کرتا ہے تو بات سے بات نکلتی چلی جاتی ہے اور اصل بات کہیں روپوش ہو جاتی ہے۔ میں نے بات یہ شروع کی تھی کہ اس روز شکار پر ہم صرف پانچ لڑکے گئے تھے۔ ہمارے باقی دوست اس وجہ سے جا سکے کہ موسم کا کچھ بھروسہ نہ تھا۔ موسمِ بہار کی بارش اچانک آ جاتی تھی اور بہت تیز برستی تھی اور اس کے ساتھ اولے بھی پڑتے اور بجلی گرنے کا خطرہ بھی ہوتا تھا۔ ہم پہلے تین بار اسی موسم میں خراب ہو چکے تھے۔

ہم دراصل شکار کے موڈ سے نہیں نکلے تھے۔ موسم بہت اچھا تھا اور فراغت بھی تھی۔ ہمارا علاقہ بارانی ہے۔ بارشیں وقت پر ہو جانے کی وجہ سے گندم کی فصل نہایت اچھی اٹھی تھی۔ اس کی خوشی الگ تھی اس لئے ہم پر سیر سپاٹے کا اور ہنسنے کھیلنے کا موڈ طاری تھا۔

ہم جب شکار کے لیے جایا کرتے تھے تو صبح ابھی تاریک ہوتی تھی تو ہم نکل جاتے تھے۔ اس صبح اچانک لہو گرم کرنے کا موڈ بن گیا تو ہم کُتوں کے ساتھ اس وقت گھروں سے نکلے جب سورج افق سے اٹھ رہا تھا۔ ہم میں سے تین لڑکوں کی ماؤں کے موڈ کالعدم سیاسی پارٹیوں کے لیڈروں جیسے تھے۔ ان میں میری ماں خاص طور پر قابلِ ذکر تھیں۔ ہم پانچ

اکٹھے نکلنے کی بجائے اکیلے اکیلے گلیوں میں گم ہو گئے اور مختلف راستوں سے گاؤں سے نکل گئے جس طرح دشمن کے علاقے میں پھنسے ہوئے گوریلے چھپ چھپ کر نکلا کرتے ہیں۔

ہم گاؤں سے نکل گئے اور گپیں ہانکتے اپنے علاقے کی زمین کے کھڈ نالوں میں غائب ہو گئے۔ کُتوں کو ہم نے کھلا چھوڑ دیا تھا اور وہ بھی ہماری طرح ہنسی خوشی اِدھر اُدھر بھاگ دوڑ رہے تھے۔ دو تین بار کُتے کسی شکار کے پیچھے دوڑے۔ ہم نے اُنہیں کھلی چھٹی دے رکھی تھی۔

اس طرح کم و بیش ہم چار میل دور نکل گئے اور اچانک وہ خوبصورت بادلوں کے ٹکڑے جو آسمان میں الگ الگ منڈلا رہے تھے اکٹھے ہونے لگے۔ ہم اُس وقت نشیبی علاقے میں تھے۔ کالی سیاہ گھٹا بڑی تیزی سے آئی اور بادلوں کے سفید ٹکڑوں کو اس طرح نگلنے لگی جس طرح سمندر میں بڑی مچھلیاں چھوٹی مچھلیوں کو نگلتی چلی جاتی ہیں۔ ہم نے اِدھر اُدھر دیکھا کہ کہیں بارش سے پناہ مل جائے۔ وہاں اونچی دیواروں جیسے لمبے لمبے اور اونچے ٹیلے تھے۔ ہم دوڑ کر ایک ٹیلے کی اوٹ میں جا کھڑے ہوئے۔

بارش یقینی تھی لیکن ایسے ہُوا جیسے کوئی چھوٹے چھوٹے پتھر پھینک رہا ہو۔ یہ اولے تھے۔ ایک ہمارے قریب گرا۔ یہ بلا مبالغہ آدھے پاؤ کا تھا۔ ایسے اولے کہیں کہیں گر رہے تھے۔ یہ ہمارے لیے عجوبہ نہیں تھے۔ کبھی کبھی اس سائز کے اولے تھوڑی سی تعداد میں گرا کرتے تھے۔ ہمارے سامنے جو اولے گرے وہ چند ایک ہی تھے۔

اس کے بعد اولے زیادہ پڑنے لگے اور بڑی تیز ژالہ باری شروع ہو گئی۔ اب اولوں کا سائز کم ہوتا چلا جا رہا تھا۔ ان کا سائز بچوں کے کھیلنے والی کانچ کی گولیوں جتنا تھا لیکن یہ ژالہ باری اتنی شدید تھی کہ ہمارے سامنے زمین سفید ہو گئی۔ اس کے ساتھ بجلی کی چمک اور کڑک ایسی تھی کہ دل دہل جاتے تھے لیکن ہمارے دل دہلنے والے نہیں تھے۔ ہمیں بہت لطف آ رہا تھا۔ گھٹا نے جو اندھیرا پھیلا دیا تھا وہ ہمیں بہت اچھا لگ رہا تھا۔ ژالہ باری کے بعد بڑی تیز بارش شروع ہو گئی۔ ہمارے ایک دوست نے ذرا پرے جا کر ایک اچھی جگہ دیکھ لی جہاں بارش سے بچنے کے علاوہ بڑے آرام سے بیٹھا بھی جا سکتا تھا۔ ہم وہاں جا بیٹھے۔

آدھ گھنٹے تک بارش ختم ہو گئی۔ ہم پناہ سے نکلے اور چل پڑے۔ اب ہمیں واپس آنا تھا۔ اگر ہم شکار کھیلنا چاہتے تو بیکار تھا۔ ژالہ باری اور بارش کی وجہ سے ہمارا شکار یعنی گیدڑ

خرگوش، سیہہ وغیرہ زمین کے نیچے چلے گئے تھے۔ وہاں سے تقریباً ایک میل آگے ایک جگہ
بلندی سے پانی گرتا تھا۔ ہم نے دو تین بار یہ آبشار دیکھی تھی۔ ہمارے ایک دوست نے کہا
کہ اب یہ آبشار دیکھنے والی ہوگی، چلو وہاں تک چلتے ہیں۔ ہم سب اٹھے اور اُدھر کو چل
پڑے۔ کیچڑ زیادہ ہو گیا تھا۔ پھسلن بھی تھی۔ ہم چلتے پھسلتے وہاں جا پہنچے۔ واقعی آبشار دیکھنے
کے قابل تھی۔ اوپر کے تمام علاقے کا پانی سیلابی ندی کی طرح آ کر چالیس پچاس فٹ کی
بلندی سے گر رہا تھا۔ اس کا شور ہمیں بہت اچھا لگا اور ہم مختلف زاویوں سے آبشار کو دیکھنے
لگے۔

میں چونکہ کوئی اور واقعہ سنانے لگا ہوں اس لئے میں وہ سب منظر بیان نہیں کر رہا جو
ہم نے وہاں دیکھے۔ کچھ دیر وہاں گزار کر ہم وہاں سے چل پڑے۔ ہم نے اب واپس آنا
تھا۔ اس موسم میں گھوم پھر کر ہم یوں محسوس کر رہے تھے جیسے ہمارے جسموں میں خون بڑھ گیا
ہو اور ہم پہلے سے زیادہ تندرست اور توانا ہو گئے ہوں۔ ہم اگر اس راستے سے واپس آتے
جس راستے سے گئے تھے تو ہمیں بہت مشکل پیش آتی۔ اس طرف کھڈ، نالے اور گھاٹیاں
زیادہ تھیں۔ ہم نے دور کا چکر کاٹنے کا ارادہ کر لیا۔

وہ علاقہ ایسا تھا جس میں ریت اور کنکریاں زیادہ تھیں۔ سلوں والی چٹانیں بھی تھیں
اور وہ علاقہ عام راستوں سے ہٹ کر آبادیوں سے بہت دور تھا۔ ہم نے کتوں کو کھلا چھوڑا
ہوا تھا اور چلتے جا رہے تھے۔ کتے ہمارے آگے آگے بکھرے ہوئے اِدھر اُدھر گھوم پھر رہے
تھے۔

ہم ٹیلوں اور چٹانوں کے درمیان جا رہے تھے کہ تقریباً ڈیڑھ سو گز دور ایک آدمی
ایک طرف سے سامنے آیا اور ہمیں دیکھ کر بہت تیزی سے واپس چلا گیا۔ صاف پتہ چلتا تھا
کہ وہ ہمیں دیکھ کر پیچھے کو بھاگا ہے۔ وہ علاقہ ایسا تھا جیسے ہم ایک گلی میں جا رہے تھے اور وہ
اس گلی سے ملنے والی گلی میں سے آیا اور پیچھے کو بھاگ گیا۔ ہمیں کوئی شک نہیں ہونا چاہئے
تھا۔ ہم بھی تو اس ویرانے میں گھوم پھر رہے تھے لیکن اس سے پہلے ایسے واقعات ہو چکے تھے
کہ ایک آدمی ہمیں دیکھ کر چھپ گیا۔ ہم نے جا کر دیکھا تو وہ کوئی مجرم نکلا۔

ہم آگے چلتے گئے اور اس جگہ جا پہنچے جہاں وہ آدمی سامنے آیا تھا۔ وہاں ٹیلوں کے
درمیان سے تنگ سا راستہ تھا۔ ہم اُدھر کو ہو گئے۔ اُدھر مٹی کی دیواروں کی طرح ٹیلے کھڑے
تھے۔ درخت بہت تھے۔ گھاس بھیگی ہوئی تھی۔ ہمارے سامنے جو علاقہ آ گیا یہ کسی وسیع و

عریض قلعے کے اندر کے حصے جیسا لگتا تھا۔ ہم اس کے اندر چلے گئے۔

ہمارے سامنے ایک ٹیلا دوسروں سے ذرا لمبا تھا اور کچھ آگے جا کر ختم ہو جاتا تھا۔
ہمارے ایک دوست نے آہستہ سے کہا کہ اس ٹیلے کے پیچھے سے ہمیں کوئی دیکھ رہا ہے۔ ہم
نے اُدھر دیکھا۔ وہ جو کوئی بھی تھا بہت ہی بیوقوف تھا۔ وہ ہمیں ٹیلے کے اگلے سرے کے
پیچھے چھپا ہوا ایک آنکھ سے اس طرح جھانک رہا تھا کہ اس کا آدھا چہرہ صاف نظر آتا تھا۔ یہ
یقیناً وہی شخص تھا جو پہلے ہمیں دیکھ کر پیچھے کو بھاگا تھا۔

ہم اسی طرف چلے جا رہے تھے۔ ہم نے اُدھر نہیں جانا تھا۔ ہم وہ جگہ پیچھے چھوڑ آئے
تھے جہاں سے ہم نے دوسری طرف مڑ جانا تھا۔ ہم تو اس آدمی کی پُراسرار حرکتیں دیکھ کر اس
کے تعاقب میں چل پڑے تھے۔ وہ عمر ہی ایسی تھی۔ ذرا سا کہیں شک ہوتا تھا تو اُدھر چل
پڑتے تھے کہ کوئی تماشہ ہو گا۔ کتوں کے ساتھ ہماری دوستی اتنی گہری اور اتنی پرانی تھی کہ ہم
میں ان کی کئی عادتیں پیدا ہو گئی تھیں جن میں ایک یہ تھی کہ ہم مشک لیتے پھرتے تھے۔ اسی
عادت کے تحت ہم اس آدمی کے پیچھے چل پڑے تھے کہ وہ کر کیا رہا ہے۔

میں آپ کو جو کہانیاں سناتا رہتا ہوں یہ ہماری اسی عادت سے حاصل ہوئی تھیں کہ
ہمیں بلی اور کتے والا تجسس تھا۔ خدا نے علامہ اقبال سے کہا تھا ___ ''ڈھونڈنے والوں کو ہم
دنیا نئی دیتے ہیں'' ___ ہم انہی ڈھونڈنے والوں میں سے تھے اس لیے ہمیں خدا نئی سے نئی
کہانیاں دیتا تھا۔ کون ژالہ باری اور بارش میں ویرانوں میں پھرتا ہے! وہ ہم تھے۔ گھر کی
چار دیواری کے قیدیوں کو ہم یہ واقعات سنایا کرتے تھے تو وہ حیران ہوتے تھے اور آج یہ
واقعات سناتا ہوں تو بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ تو افسانے لگتے ہیں۔

کوئی جو کچھ بھی سمجھے۔ بات یہ ہے کہ اس وقت بے سمجھ تھے اور یہ دیکھنے کے لیے
آگے چلے گئے کہ یہ آدمی کون ہے اور کیا کر رہا ہے۔ ہم بہت تیز چلتے وہاں تک پہنچ گئے اور
اس طرف مڑے جدھر وہ آدمی کھڑا تھا۔ وہ جگہ ایسی تھی جسے آپ نیم گول کنواں کہہ لیں۔
وہاں گولائی میں مٹی کی دیوار کھڑی تھی جیسے ہماری زبان میں دندی کہا جاتا ہے۔ اس میں
بڑے بڑے تودے لٹک رہے تھے۔ پتہ چلتا تھا کہ ابھی گر پڑیں گے۔ دیوار میں شگاف
سے بھی تھے اور ایک شگاف زمین کے ساتھ تھا جو چھوٹا سا غار یا گُف بنا ہوا تھا۔

وہ آدمی اس گف کے سامنے کھڑا تھا۔ اس کے چہرے پر گھبراہٹ اور پریشانی سی
تھی۔ وہ ہم سے ذرا ہی بڑا تھا۔ عمر تئیس چوبیس سال ہو گی۔ شکل صورت بڑی اچھی تھی۔

قد بت بھی اُس وقت کے معیار کے مطابق اچھا تھا۔ وہ دیہاتی تھا لیکن کپڑوں سے خوش حال اور بڑی ذات کا دیہاتی لگتا تھا۔ وہ ہمیں چپ چاپ کھڑا دیکھ رہا تھا۔

ہم پولیس کے آدمی تو نہیں تھے کہ اس سے باز پُرس کرتے کہ وہ یہاں کیا کر رہا ہے۔ ہم بھی اسے خاموشی سے دیکھتے رہے۔ میرے عزیز دوست شہباز خان نے سب سے پہلے دیکھا اور ہمیں آہستہ سے بتایا کہ اس کے پیچھے گف میں کوئی آدمی لیٹا ہُوا ہے۔ میں نے اس آدمی کے پیچھے دیکھا تو مجھے دو پاؤں اور گھٹنوں تک ٹانگیں نظر آئیں۔ مجھے شک ہُوا یہ عورت کی ٹانگیں ہیں۔ وہ عورت تھی یا مرد، زندہ نہیں ہوسکتا تھا۔ یہ شک بھی ہُوا کہ یہ آدمی اور اندر چھپی ہوئی عورت یہاں حدود آرڈیننس کی خلاف ورزی کرنے آئے ہوں گے۔ اس وقت انگریز کا قانون چلتا تھا۔ اس قسم کی نازیبا حرکات اس وقت بھی جرم تھا۔

''وہ کون ہے؟'' ___ شہباز خان نے اس آدمی سے پوچھا۔

''تم کیا کرو گے پوچھ کر؟'' ___ اس نے عام سے لہجے میں کہا ___ ''جاؤ اپنا کام کرو''۔

''نہیں جاتے'' ___ میں نے جاہل دیہاتیوں کی طرح کہا ___ ''ہم یہیں کھڑے رہیں گے''۔

''لاش ہے؟'' ___ ہمارے ایک دوست نے پوچھا۔

اس نے سر ہلا کر بتایا کہ لاش نہیں۔ ہمارے کُتے اس کے قریب چلے گئے۔ وہ شخص بوہلی سے زیادہ ڈرا اور پرے ہٹ گیا۔

''انہیں ایک طرف کرو یارو!'' ___ اس نے کہا ___ ''تم کہاں سے آ گئے ہو!''

ہم ٹلنے والے نہیں تھے۔ اس کے ساتھ کچھ اور مکالموں کا تبادلہ ہُوا۔ آخر اس نے لمبا سانس لیا اور ہم سے ہمارے گاؤں کا نام پوچھا۔ ہم نے بتا دیا۔

''تم سب خاندانی معلوم ہوتے ہو'' ___ اس نے کہا ___ ''مجھے امید ہے کہ تم میری مدد کرو گے''۔

''کیوں نہیں کریں گے!'' ___ میرے دوست افضل نے کہا ___ ''تم بات کرو''۔

اس نے اپنے گاؤں کا نام بتایا۔ وہ تحصیل چکوال کا ایک گاؤں تھا جس کا ہمارے گاؤں سے فاصلہ پندرہ بیس میل کے درمیان تھا۔ گاؤں کی ایک لڑکی اس کے پیچھے گھر سے نکل آئی تھی۔ طے کیے ہوئے پروگرام کے مطابق وہ صبح سویرے گھر سے نکل آیا تھا۔ لڑکی

کھیتوں میں جانے کے بہانے گھر سے نکلی اور اس آدمی کے پیچھے پیچھے آ گئی۔ وہاں سے کھڈنالوں اور ٹیلوں گھاٹیوں کا علاقہ شروع ہو جاتا تھا اونٹ اور ہاتھی بھی غائب ہو جاتے تھے۔

وہ دونوں عام راستوں سے دور دور ٹیلوں وغیرہ کی اوٹ میں چھپتے چھپاتے چلتے آئے اور جب یہاں پہنچے تو اولے پڑنے لگے۔ اس نے پہلے اولوں کا سائز وہی بتایا جو میں نے آپ کو بتایا ہے۔ ہمیں تو قریب ہی پناہ مل گئی تھی اور بڑی جلدی اس پناہ میں چلے گئے تھے لیکن ان دونوں کے قریب کوئی جگہ سر چھپانے کے لیے نہیں تھی۔ قریب کوئی درخت بھی نہیں تھا۔

اس آدمی کے سر پر پگڑی تھی۔ پگڑی پر ایک اولہ لگا جس کی ضرب سے سر بچ گیا۔ لڑکی کے سر پر ململ کا دوپٹہ تھا۔ اس کے سر پر ایک دو وزنی اولے لگے۔ غور کریں کہ ایک تو اولے وزنی تھے اور وہ آسمان سے آئے تھے۔ رفتار کا اندازہ آپ کر سکتے ہیں۔ لڑکی گر پڑی۔ اس کے فوراً بعد ژالہ باری تیز ہوگئی۔ اولوں کا سائز چھوٹا تو ہو گیا تھا لیکن اتنا چھوٹا نہیں کہ انسان اپنے سر پر ان کی ضربیں سہہ سکتا۔

اس جوان نے اس لڑکی کو اٹھا لیا اور اس جگہ تک آ گیا۔ لڑکی بیہوش تھی۔ اولے ختم ہوئے بہت وقت گزر چکا تھا مگر لڑکی ابھی تک بیہوش پڑی تھی۔ ہم نے باری باری لڑکی کو دیکھا۔ وہ گف میں لیٹی ہوئی نہیں بیٹھی ہوئی تھی۔ وہاں لیٹنے کی جگہ نہیں تھی۔ لڑکی کی پوزیشن یہ تھی کہ اس کی پیٹھ گف کی دیوار کے ساتھ لگی ہوئی تھی اور ٹانگیں آگے کو لمبی کی ہوئی تھیں۔ لڑکی کا سر ایک طرف کو ڈھلکا ہُوا تھا۔

میں نے لڑکی کے ماتھے پر گول ابھار دیکھا تھا۔ خون نہیں نکلا تھا۔ خون سر پر نظر نہیں آتا تھا۔ خون نہ نکلے تو چوٹ کا درد شدید ہوتا ہے۔ لڑکی خاصی خوبصورت تھی وہ زندہ تھی۔

''میں نے پگڑی بارش میں بھگو کر اس کے منہ میں قطرہ قطرہ پانی ٹپکایا ہے'' ___ اس خوبرو جوان نے کہا ___ ''لیکن یہ تو ہوش میں آتی ہی نہیں''۔

''تم اسے لے جا کہاں رہے تھے؟'' ___ میں نے پوچھا ___ ''کیا تم ہمیشہ کے لیے گاؤں سے جا رہے ہو؟''

''ایک بڑے گہرے دوست کے گھر لے جا رہا ہوں'' ___ اس نے جواب دیا ___ ''وہ میرے انتظار میں ہوگا۔ سارا معاملہ طے کیا ہوا ہے۔ ہم وہاں جائیں گے تو میرا دوست

نکاح پڑھوا دے گا۔ پھر میں اپنے باپ کو پیغام بھیجوں گا کہ میں نے اس لڑکی کے ساتھ شادی کر لی ہے، مجھے واپس آنے کی اجازت دو۔ اجازت نہیں دو گے تو ساری عمر میری صورت نہیں دیکھ سکو گے“۔

”کیا لڑکی یتیم ہے؟“ ___ میرے ایک دوست نے پوچھا ___ ”اس کا آگے پیچھے کوئی نہیں؟“

”سبھی ہیں“ ___ اس نے جواب دیا ___ ”اس کا باپ ہے۔ چچا ہے۔ دو بھائی ہیں۔ نکاح پڑھا گیا تو ان کے قدموں میں سر رکھ کر معافی مانگ لوں گا، لیکن اس وقت یہ ڈر ہے کہ لڑکی کو غائب پا کر اسے ڈھونڈنے نکل پڑے تو کوئی انہیں یہ نہ بتا دے کہ لڑکی اس طرف جاتی دیکھی گئی تھی۔ وہ یہاں آ گئے تو ہم دونوں کو زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ لڑکی ہوش میں نہیں آ رہی۔ اسے کندھے پر اٹھا کر تو میں کہیں نہیں جا سکتا...... کیا تم میری مدد کر سکتے ہو؟“

”کیا مدد کریں؟“

”تم خود سوچو“ ___ اس نے کہا ___ ”ایک یہ ہو سکتا ہے کہ لڑکی کو باری باری اٹھاؤ میں بھی اٹھاؤں گا اور ہمیں دوست کے گاؤں پہنچا دو۔ دوسری مدد یہ ہو سکتی ہے کہ تمہارا گاؤں قریب ہے۔ وہاں تک پہنچا دو۔ میں کہوں گا کہ یہ میری بیوی ہے۔ تمہارے گاؤں میں کوئی سیانا ہو گا۔ وہ اسے ہوش میں لے آئے گا اور کوئی دوا دارو دے دے گا۔

ہم اس جرم میں شامل ہو کر پھنسنا نہیں چاہتے تھے۔ نہ پھنستے تو اپنے بزرگ ہمیں جوتے مارتے ہم نے اسے کہا کہ یہ لڑکی اس کی بیوی ہوتی یا بہن ہوتی یا کوئی اور رشتہ ہوتا ہم اسے اٹھا کر اپنے گاؤں جاتے اور ہر طرح کی مدد کرتے۔

”پھر یہی مدد کر دینا“ ___ اُس نے کہا ___ ”کسی کو یہ نہ بتانا کہ تم نے مجھے یہاں اس لڑکی کے ساتھ دیکھا تھا“۔

ہم نے اس کو تسلی دی کہ ہم کسی کو نہیں بتائیں گے پھر ہم وہاں سے آ گئے راستے میں انہی کی باتیں کرتے رہے۔

ابھی پندرہ دن ہی گزر رہے تھے۔ رات کا پچھلا پہر تھا۔ رات کو بارش برسی تھی اور بجلی کے دھماکے اتنے زوردار تھے کہ لوگ جاگے اٹھے اور مویشی جو بیٹھے ہوئے تھے بدک کر اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ میری بھی آنکھ کھل گئی تھی۔ میرے والد صاحب نے کہ تھا کہا بجلی کہیں

قریب گری ہے۔ اس کے بعد ہم پھر سو گئے تھے۔ رات کے پچھلے پہر باہر کی کچھ آوازوں سے آنکھ کھل گئی۔ یہ دو تین آدمیوں کی آوازیں تھیں۔ بارش کبھی کی ختم ہو چکی تھی۔

اپنے والد صاحب کے ساتھ میں بھی اٹھا کر اور ہم باہر نکلے۔ گاؤں کے تین چار آدمی باہر کھڑے اونچی آواز میں باتیں کر رہے تھے۔ پتہ چلا کہ ابھی ابھی ان میں سے ایک آدمی کے دروازے پر کسی نے بڑی زور زور سے ہاتھ مارے اور اس کے ساتھ ایک عورت کی چیختی ہوئی آوازیں سنائی دیں ___ ”دروازہ کھولو...... جلدی کرو...... دروازہ کھولو“۔

دروازہ کھولا۔ لالٹین کی روشنی میں دیکھا کہ ایک جوان لڑکی ہے جس کے چہرے پر خون کی لکیریں ہیں اور اس کے کپڑے بھیگے ہوئے ہیں اور ان پر خون بھی ہے۔ دروازہ کھولنے والا آدمی ڈر گیا۔ وہ لڑکی کو اپنے گھر میں نہیں لے جانا چاہتا تھا لیکن لڑکی اسے دھکیل کر اندر چلی گئی۔

”مجھے تھانے تک لے چلو یا میرے گاؤں تک پہنچا دو“ ___ لڑکی روتی اور کہتی تھی ___ ”میں اپنے خاوند کو زہر دے کر آئی ہوں“۔

اس نے اپنے گاؤں کا نام بتایا۔ اپنے باپ اور اپنے خاوند کا نام بھی بتایا۔ اس گھر کا آدمی بہت گھبرایا۔ اس نے ساتھ والے گھروں سے آدمیوں کو جگایا اور بتایا کہ یہ ماجرا ہُوا ہے۔ ان آدمیوں نے کہا کہ نمبردار اور دو چار معززین کو جگا لو۔ چنانچہ نمبردار اور ہماری برادری کے تین چار بزرگوں کو جگایا گیا۔ ان میں میرے والد صاحب بھی تھے۔ میں بھی ان ان کے ساتھ اس گھر میں گیا جہاں لڑکی آئی تھی۔

اتنی دیر میں اس گھر کی اور دو اور گھروں کی عورتوں نے لڑکی کے چہرے سے خون صاف کر دیا تھا اور اس کے بھیگے ہوئے کپڑے اتروا کر اپنے کپڑے پہنا دیئے تھے۔ وہ عورتوں کو بتا چکی تھی کہ اس پر کیا بیتی ہے۔ اس نے ان عورتوں کو جو بیان دیا تھا وہ بزرگوں کو ایک عورت نے سنایا۔ لڑکی کے سر کے ایک طرف زخم آیا تھا۔ عورتوں نے اس پر پٹی باندھ دی تھی۔ وہ کہتی تھیں کہ زخم معمولی ہے۔

لڑکی نے یہ بیان دیا تھا کہ وہ گھر سے ایک آدمی کے ساتھ نکلی آئی تھی۔ میں اس لڑکی کو دیکھ رہا تھا۔ جب پتہ چلا کہ یہ گھر سے کسی کے ساتھ نکلی آئی تھی تو میرا شک یقین میں بدل گیا۔ یہ وہی لڑکی تھی جسے پندرہ روز پہلے ہم نے ایک آدمی کے ساتھ گف میں بیوشی کی حالت میں دیکھا تھا۔ میں نے اسے وہ دن یاد دلایا اور کہا کہ اس کے سر پر اولے لگے تھے۔

اس نے کہا کہ وہ وہی ہے۔

وہ جس کے ساتھ گھر سے بھاگی تھی اس نے ہمیں بتایا تھا کہ لڑکی غیر شادی شدہ ہے لیکن لڑکی نے اب بتایا کہ وہ شادی شدہ ہے۔ شادی ہوئے ابھی ایک ہی سال گزرا تھا۔ اس کو خاوند اچھا نہیں لگتا تھا۔ وجہ یہ بتائی کہ وہ مذہبی آدمی تھا اور اس نے مولویوں جیسی داڑھی رکھی ہوئی تھی۔ وہ اس لڑکی سے بھی نماز پڑھواتا تھا اور مذہب میں ڈوبا ہوا تھا۔ لڑکی نے عورتوں کو بتایا تھا کہ اس کا خاوند مردہ سا ہو گیا تھا۔ بیوی کو وہ پکا مسلمان بنا رہا تھا۔ اسے نماز باقاعدہ پڑھنے کو کہتا تھا۔

لڑکی نے اپنی زبان سے تو ایسی بات نہیں کہی ہو گی یہ میرا اپنا خیال تھا کہ لڑکی آزاد خیال اور ہنسنے کھیلنے والی ہو گی اور خاوند مذہب میں ڈوبا ہوا سنجیدہ آدمی تھا۔ لڑکی کی محبت اس آدمی کے ساتھ تھی جس کے ساتھ ہم نے اسے دیکھا تھا۔ لڑکی کی نوجوانی اور خوبصورتی میں ایسی کشش تھی جو کسی بھی آدمی کی عقل کو بیکار کر سکتی تھی۔ یہ آدمی ابھی نوجوان اور ناتجربہ کار تھا، عقل سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ لڑکی اس کے آگے روتی اور کہتی تھی کہ وہ خاوند سے تنگ آ گئی ہے۔

لڑکی نے یہ بھی بتایا کہ شادی کے پانچ چھ مہینے بعد خاوند نے اسے مارنا پیٹنا شروع کر دیا تھا۔ اس نے لڑکی پر بہت پابندیاں عائد کر دی تھیں جو لڑکی قبول نہیں کرتی تھی۔ لڑکی اپنے والدین سے شکایت کرتی تھی تو وہ اسے کہتے تھے کہ خاوند اسے ناجائز تنگ نہیں کرتا، وہ اس کا حکم مانے اور اسی گھر کو اپنا گھر سمجھے۔

لڑکی تنگ آ گئی۔ ابھی شادی کو ایک سال پورا نہیں ہوا تھا۔ اس نے اپنے چاہنے والے پر اپنا ایسا اثر پیدا کیا کہ وہ اس کے اشاروں پر ناچنے لگا۔ انہوں نے کہیں بھاگ جانے کا ارادہ کر لیا۔ یہ آدمی کہتا تھا کہ وہ فوج یا پولیس میں بھرتی ہو جائے گا۔ لڑکی کو اس نے اپنے علاقے کے ایک گاؤں میں رہنے والے ایک دوست کے گھر رکھنا تھا اور نکاح پڑھوا کر فوج یا پولیس میں بھرتی ہونے کے لئے چلے جانا اور ادھر ہی کہیں اپنا ٹھکانہ بنانا تھا۔

ان کی اس سکیم میں صرف جذبات استعمال ہو رہے تھے۔ عقل سے کام نہیں لیا گیا تھا۔ یہ سکیم کامیاب ہونے والی تھی ہی نہیں۔ اس میں صرف ایک کام آسان تھا۔ یہ تھا گھر سے بھاگ جانا۔ اس کے آگے یہ سکیم ایک سہانا خواب تھا۔ میں آپ کو ایک دلچسپ بات بتاؤں۔ ہماری جوانی کے وقتوں میں بھی ایسے ہوتا تھا اور اب بھی ہوتا ہے کہ دیہات میں

کوئی لڑکی کسی کے ساتھ گھر سے بھاگتی ہے۔ اسے اپنے ساتھ لے جانے والا کسی گاؤں میں اپنے دوست کے گھر رکھتا تھا۔ وہ جتنے دن وہاں رہتی ہے اس دوست کی داشتہ بنی رہتی ہے۔ یہ قیمت یا اجرت ہے جو دوست لڑکی کو چھپا کر رکھنے کے عوض وصول کرتا ہے بلکہ وہ اپنے ایک دو دوستوں کو بھی مدعو کرتا ہے۔ لڑکی اتنی مجبور ہوتی ہے کہ بولتی نہیں۔

دیہات میں کسی سے کچھ بھی پوشیدہ نہیں رکھا جا سکتا۔ لڑکی والوں کو پتہ چل جاتا ہے کہ لڑکی فلاں گاؤں میں ہے۔ لڑکی والے اگر مضبوط خاندان کے ہوں تو وہ لاٹھیاں اور کلہاڑیاں لے کر جاتے ہیں اور اپنی لڑکی کو برآمد کراتے ہیں۔ اگر وہ یہ کارروائی نہ کریں تو معززین کو ساتھ لے کر لڑکی کو واپس لیتے ہیں۔ یہاں سے خاندانی عداوتیں شروع ہو جاتی ہیں جن میں لڑائیاں ہوتی ہیں قتل کی وارداتیں ہوتی ہیں اور یہ سلسلہ نسل در نسل چلتا ہے۔

اس آدمی اور لڑکی نے بھی ایسی ہی سکیم تیار کی تھی۔ لڑکی نے بہت خراب ہونا تھا۔ ان کے سامنے ایک مسئلہ یہ بھی تھا کہ لڑکی شادی شدہ تھی۔ خاوند کی موجودگی میں اس کا نکاح کسی اور کے ساتھ نہیں ہو سکتا تھا۔ اس کا انہوں نے یہ حل نکالا کہ لڑکی کے خاوند کو زہر دینے کا فیصلہ کر لیا۔ اس آدمی نے لڑکی سے کہا کہ وہ ایسا زہر لے آئے گا جو فوراً اثر نہیں کرتا بلکہ اس کا اثر آہستہ آہستہ ہوتا ہے اور اس اثر سے آدمی ایسی بیماری میں مبتلا ہو جاتا ہے جس سے کسی بھی ڈاکٹر کو یہ شک نہیں ہوتا کہ یہ زہر کا اثر ہے۔

لڑکی نے ہمارے گاؤں کی عورتوں کو یہ ساری باتیں بلا جھجک بتائیں۔ اللہ کی طرف سے اس پر ایسی مصیبت ٹوٹی تھی کہ اس کے سینے میں سے تمام راز اپنے آپ باہر آ رہے تھے۔ اس نے بتایا کہ اس آدمی نے اسے زہر لا دیا جو لڑکی نے رات کو دودھ میں ملا کر اور اس میں چینی زیادہ ڈال کر خاوند کو پلا دیا۔ دوسری صبح وہ گھر سے اس آدمی کے پیچھے نکل گئی۔

خدا کی بے آواز لاٹھی فوراً حرکت میں آ گئی۔ وہ زیادہ دور نہیں گئے تھے کہ آسمان سے گرے ہوئے اولوں نے لڑکی کو گرا دیا۔ یہ میں آپ کو سنا چکا ہوں کہ لڑکی کس طرح بیہوش ہوئی تھی۔ ہم ان دونوں کو وہیں چھوڑ کر آ گئے تھے۔ اس کے بعد اس لڑکی پر جو بیتی وہ اس نے اس طرح سنائی کہ لڑکی کو بہت دیر بعد ہوش آئی۔ اس کا سرا بھی تک چکرا رہا تھا اور سر میں بڑا سخت درد تھا۔

لڑکی گھبرا کر اٹھی اور اس جگہ سے باہر نکلی۔ وہ جس کی خاطر گھر سے نکلی تھی وہ وہاں غائب تھا۔ لڑکی نے اسے نام لے کر پکارا مگر اس ویرانے میں اسے کوئی جواب نہ ملا میں

سمجھ گیا کہ لڑکی ہوش میں نہیں آرہی تھی اور وہ آدمی محبت پر لکیر پھیر کر بھاگ گیا۔ جذبا کالعدم ہوگئے اور عقل کام کرنے لگی۔ اس نے ہمیں کہا تھا کہ وہ یہاں پکڑا گیا تو لڑکی وا اسے قتل کردیں گے۔ اسے شک ہُوا ہوگا کہ لڑکی زندہ نہیں رہے گی۔

لڑکی اس ویرانے میں ماری ماری پھرنے لگی۔ اس نے عورتوں کو بتایا کہ وہ ا گاؤں جانے سے ڈرتی تھی عصر کا وقت ہوگیا تھا اور وہ صبح سے غائب تھی۔ وہ گھر جاتی سورج غروب ہو چکا ہوتا۔ خاوند جو مذہب کا شیدائی اور مذہبی پابندیوں کا قائل تھا، لڑکی اپنے گھر میں داخل نہ ہونے دیتا اور لڑکی کا باپ اس کی الگ پٹائی کرتا۔ لڑکی کے سر کو ہی سخت چوٹیں آئی تھیں جو اسے تکلیف دے رہی تھیں۔ اس کے ساتھ یہ خوف کہ وہ اکیلی گ نہیں جاسکتی اور گئی تو اس کے ساتھ بہت بُرا سلوک ہوگا۔

وہ کہتی تھی کہ اسے یہ امید نہیں تھی کہ جس نے اس کی محبت کی خاطر اپنی جان کو خطرے میں ڈال دیا تھا وہ اسے اکیلا چھوڑ کر بھاگ جائے گا۔ وہ اسے ڈھونڈنے لگی اور بار اسے پکارتی تھی۔ وہ ادھر بھاگتے دوڑتے ایسی جگہ پہنچ گئی جہاں قریب سے راستہ گز تھا۔ اچانک دو آدمی آگئے۔ لڑکی نے چھپنے کی کوشش کی لیکن ان آدمیوں نے اس کو دیکھ تھا۔ وہ اس کے پیچھے آئے اور اسے پکڑ لیا۔ انہوں نے لڑکی سے پوچھا کہ وہ کس گاؤں رہنے والی ہے اور یہاں کیا کر رہی ہے۔ لڑکی نے رونا شروع کردیا۔ انہوں نے اسے دلاسا دیا اور ایسی شفقت سے پیش آئے کہ لڑکی نے بتادیا کہ وہ کس گاؤں کی رہنے والی اور وہ یہاں تک کس طرح پہنچی اور کس طرح بیہوش پڑی رہی ہے۔ اس نے روتے رو بتایا کہ وہ جس کی خاطر گھر سے نکلی تھی وہ اسے بیہوشی کی حالت میں چھوڑ کر بھاگ گیا ہے۔

یہ دونوں بلکہ ان میں سے ایک آدمی بہت چالاک تھا بعد میں پتہ چلا یہ شخص ما بدمعاش اور جرائم پیشہ تھا۔ اس نے لڑکی کو اپنے قبضے میں لینے کے لیے اسے دھوکہ دیا۔

''اس شخص کو میں جانتا ہوں''۔ اس نے لڑکی سے کہا۔ ''وہ بہت بڑا دھوکے ہے۔ وہ پہلے بھی دو لڑکیوں کو ورغلا کر گھر سے نکال لے گیا تھا اور انہیں بیچ کر واپس آ تھا۔ وہ دوسرے گاؤں کی لڑکیاں تھیں۔ اب وہ تمہیں محبت کا دھوکا دے کر بیچنے کے ساتھ لے جارہا تھا''۔

اس شخص نے ایسی ہمدردی اور ایسے پیار سے اس لڑکی کے ساتھ باتیں کیں کہ و باتوں کو سچ ماننے لگی۔ لڑکی نے اس سے پوچھا کہ وہ اب کہاں جائے۔ اس چالاک آ

نے لڑکی کو بہت ڈرایا اور کہا کہ اس نے تین چار آدمیوں کو ادھر ادھر گھومتے پھرتے دیکھا ہے اور اس نے ان سے پوچھا تھا کہ کیا ان کا کوئی مویشی گم ہوگیا ہے؟ انہوں نے بتایا کہ ان کی لڑکی لاپتہ ہوگئی ہے اور وہ اسے ڈھونڈ رہے ہیں۔ اس شخص نے لڑکی کے ساتھ یہ جھوٹ بھی بولا کہ وہ آدمی کہتے تھے کہ لڑکی جہاں ملی وہیں اسے قتل کرکے زمین میں دبادیں گے۔

مختصر یہ کہ ان دونوں آدمیوں نے لڑکی کو خوفزدہ کردیا اور اس کے ساتھ شفقت اور پیار کا مظاہرہ بھی کیا اور اس طرح لڑکی پر ایسا اثر ڈالا جیسے اس پر انہوں نے جادو کردیا ہو۔ لڑکی ان کے ساتھ چل پڑی۔ اتفاق سے یہ آدمی جوان دونوں میں سے بہت چالاک تھا لڑکی کو ہمارے گاؤں سے تھوڑی ہی دور چھوٹے سے ایک گاؤں میں لے آیا۔ یہ چھوٹا سا گاؤں تھا۔ اس قسم کے گاؤں کو ہمارے علاقے میں ڈھوک کہتے ہیں۔ یہ ڈھوک ہمارے گاؤں کے بالکل قریب تھی۔ فاصلہ ایک میل سے بھی کم تھا۔ ہماری چھتوں سے یہ ڈھوک صاف نظر آتی تھی۔

لڑکی نے جب اس آدمی کا نام لیا تو ہم سمجھ گئے کہ یہ آدمی لڑکی کو دھوکے میں لایا تھا۔ میں اس کا نام نہیں بتا رہا کیونکہ اس کی اگلی نسلیں زندہ ہیں اور اس کی موجودہ نسل باعزت زندگی بسر کررہی ہے یہ شخص بدمعاش اور بڑا جوئے باز تھا۔ پولیس کے ساتھ بھی اس کا یارانہ تھا اور وہ نمبرداروں کو بھی ہاتھ میں رکھتا تھا۔ اس کی بیوی تھی لیکن اولاد نہیں تھی۔ یہ برائے نام بیوی تھی۔ غریب اور سادہ طبیعت کی عورت تھی اور وہ نوکرانیوں کی طرح اس شخص کے ساتھ رہ رہی تھی۔ یہ آدمی اپنا رعب رکھتا تھا۔ بدمعاش اور بدکردار ہونے کے باوجود اپنے اور ارد گرد کے دیہات کے لوگ اس کی عزت کرتے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ کسی کے گھر میں چوری چکاری نہیں کرتا تھا اور ہر کسی کے ساتھ پیار سے بولتا تھا۔ ہمارے گاؤں میں بھی اس کا آنا جانا تھا اور ہمارے ساتھ اس کی گپ شپ رہتی تھی۔

وہ لڑکی کو اپنے گھر لے آیا۔ جب وہ اپنے گاؤں میں پہنچا تھا اس وقت رات ہو چکی تھی۔ اس نے اپنی بیوی کے متعلق لڑکی کو بتایا کہ یہ اس کی نوکرانی ہے۔ اس نے لڑکی کو شادی کے لیے راضی کرلیا۔ اس نے یہ بھی نہ سوچا کہ لڑکی کا خاوند زندہ ہے۔ صبح یہ شخص ڈھوک کی مسجد کے مولوی کو گھر لے آیا۔ دو اور آدمی آئے جن میں ایک وہی تھا جو گزشتہ روز اس آدمی کے ساتھ تھا۔

مولوی نے ان کا نکاح پڑھا دیا۔ آج کل تو نکاح فارم بن گئے ہیں اس وقت نکاح

رجسٹر ہُوا کرتا تھا۔ لڑکی نے بتایا کہ نکاح کے وقت کوئی رجسٹر نہیں تھا۔ ایک کاغذ پر لڑکی کا انگوٹھا لگوایا گیا تھا۔ اس کاغذ پر اس آدمی نے انگوٹھا لگایا تھا اور کاغذ پر مولوی نے کچھ لکھا تھا۔ لڑکی اَن پڑھ تھی۔ اسے کچھ پتہ نہ چلا کہ کاغذ پر کیا لکھا گیا تھا۔

چودہ پندرہ دن گزر گئے۔ ان دنوں لڑکی اپنے گھر کی چھت پر جاتی رہی۔ گاؤں کی تین چار عورتوں سے اس کی ملاقات ہوئی۔ کسی نے بھی لڑکی کو یہ نہ بتایا کہ یہ آدمی اچھے چال چلن کا نہیں۔ صرف اس آدمی کی بیوی تھی جس نے اسے بتایا کہ وہ اس شخص کی نوکرانی نہیں بلکہ بیوی ہے۔

ان چودہ پندرہ دنوں کے دوران لڑکی کے سر کی چوٹیں بالکل ٹھیک ہوگئیں اور اس کا رنگ روپ نکھر آیا۔ ایک روز اس شخص نے لڑکی سے کہا کہ اس کے ایک دوست کی بہن کی شادی ہے اور وہ اسے اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہے۔ اس نے لڑکی کو دور کا کوئی گاؤں بتایا۔ لڑکی اپنے آپ کو اس کی بیوی سمجھ رہی تھی۔ وہ شادی پر جانے کے لیے تیار ہوگئی۔ یہ شخص اس کے لیے بڑے اچھے کپڑے سلوا کر لایا تھا۔

وہ رات کو اس گاؤں کو روانہ ہوئے۔ یہ آدمی لڑکی کے لیے ایک گھوڑی لے آیا تھا اور خود پیدل چل پڑا تھا۔ لڑکی نے یہ بھی سوچا کہ شادی پر جانا تھا تو دن کے وقت کیوں نہ گئے۔ دراصل لڑکی اس آدمی سے اتنی متاثر ہو چکی تھی کہ وہ جو کہتا تھا وہ کرتی تھی۔ اس آدمی کی عمر پینتیس چھتیس سال تھی اور وہ اچھی شکل وصورت کا آدمی تھا۔

بے شک لڑکی دھوکے کا شکار ہوئی تھی لیکن وہ اپنے بڑے ہی شریف اور نیک خاوند کو دھوکہ دے کر آئی تھی۔ خدا کی لاٹھی اس کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ موسم ابھی تک بارشوں والا تھا۔ وہ اپنے گاؤں سے بمشکل ایک ہی میل دور گئے ہوں گے کہ موسمِ بہار کی گھٹا اپنے ساتھ بجلیاں لیے بڑی تیزی سے آگئی۔ بارش شروع ہوگئی اور اس کے ساتھ ہی بجلی بڑے زور زور سے کڑکنے لگی۔ یہ تو آپ جانتے ہیں کہ بجلی درختوں پر گرا کرتی ہے۔ یہ دونوں بارش سے بچنے کے لیے ایک گھنے درخت کے نیچے جا کھڑے ہوئے۔ لڑکی گھوڑی سے اتر آئی۔ اس کے اترتے ہی اتنی زور کا دھماکہ ہُوا جیسے آسمان پھٹ گیا ہو جس درخت کے نیچے وہ کھڑے تھے اس میں سورج جیسی چمک ہوئی اور بڑی زور سے کڑکڑ کی آواز آئی۔ ایک موٹا ٹہن ٹوٹ کر گر رہا تھا۔ یہ بجلی تھی جو اس درخت پر گری تھی اور اس سے ٹہن ٹوٹ گیا تھا۔ میں نے اندازہ کیا، یہ وہی دھماکہ تھا جس پر ہمارے گھر میں سب بھاگ پڑے تھے اور

میرے والد صاحب نے کہا تھا کہ بجلی قریب ہی کہیں گری ہے۔

اندازہ کریں کہ جو لوگ تقریباً ایک میل دور تھے اور گھروں کے اندر سوئے تھے، اس دھماکے سے جاگ پڑے تھے۔ ان کا کیا حال ہُوا ہوگا جن کے سر پر یہ دھماکہ ہوا تھا۔ لڑکی نے بتایا کہ وہ فوراً بیہوش ہوگئی اور جب وہ ہوش میں آئی تو بہت بڑا ٹہن اپنی ٹہنیوں کے ساتھ اس کے قریب گرا ہوا تھا اور لڑکی کے سر میں بڑا تیز درد ہو رہا تھا۔ وہ فوراً اٹھی۔ اس نے محسوس کیا کہ اس کے سر میں چوٹ آئی ہے اور یہ چوٹ اس وقت آئی ہوگی جب وہ دھماکے اور چمک سے ہی بیہوش ہو کر گر پڑی تھی۔

ہم نے بعد میں جا کر وہ درخت دیکھا تھا۔ ٹہن اتنا بڑا تھا کہ یہ اس لڑکی کے اوپر گرتا تو وہ زندہ نہ رہ سکتی۔ اس ٹہن کی کوئی سوکھی ہوئی موٹی ٹہنی لڑکی کے سر کے دائیں طرف لگی جس سے خون نکلنے لگا تھا۔ بہرحال لڑکی کا زندہ رہنا ایک معجزہ تھا۔ اسے تو صرف دھماکے سے ہی مر جانا چاہئے تھا۔

لڑکی پر ایسا خوف طاری ہُوا کہ اسے وہ اولے یاد آ گئے جنہوں نے چودہ پندرہ روز پہلے اسے بیہوش کر کے گرا دیا تھا۔ اس کے ذہن میں یہ خیال آ گیا کہ اس کے قریب بجلی گری ہے اور اس کے بعد بجلی اس کے سر پر گرے گی اور وہ جل کر راکھ ہو جائے گی۔

اُس نے اس آدمی کو پکارا مگر وہاں نہ گھوڑی تھی نہ وہ آدمی تھا۔ اُس نے درخت کے ارد گرد گھوم کر دیکھا۔ ٹہن کی شاخوں کے نیچے دیکھا۔ بارش کبھی کی تھم چکی تھی۔ بادل پھٹ گئے تھے۔ ان میں سے چاند نکلتا تھا تو دھلی ہوئی فضا میں چاندنی بڑی صاف نکلتی تھی۔ وہ آدمی کہیں نظر نہ آیا۔ لڑکی کے سر پر چوٹ کا اثر اور دماغ پر خوف کا اثر اور رات کی تنہائی، وہ واپس چل پڑی۔ بار بار اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا آتا اور گزر جاتا تھا۔ وہ روتی اور خدا سے معافیاں مانگتی تھی اور پھسلتی اور سنبھلتی چلتی آ رہی تھی۔ ظاہر ہے کہ وہ اپنے ہوش وحواس میں نہیں تھی۔ وہ جس گاؤں میں داخل ہوئی وہ ہمارا گاؤں تھا۔ اس نے پہلے ہی دروازے پر دستک دی اور دروازہ کھل گیا۔

نمبردار اور گاؤں کے معزز بزرگوں نے لڑکی کے ساتھ باتیں کیں تو اس نے یہی کہا کہ مجھے تھانے لے چلو، میں نے اپنے خاوند کو زہر دیا ہے یا مجھے میرے گاؤں پہنچا دو۔

”میں اپنے باپ اور اپنے خاوند کے قدموں میں سر رکھ کر معافی مانگوں گی“ ___ اس نے کہا ___ ”اور انہیں کہوں گی کہ مجھے اپنے ہاتھوں ذبح کر دو“۔

اس کا گاؤں کم وبیش بیس میل دور تھا۔ ہمارے بزرگوں نے پہلا کام یہ کیا کہ گاؤں میں ایک ہندو حکمت اور جراحی کرتا تھا۔ اسے بلا کر لڑکی کے سر پر مرہم پٹی کرائی گئی پھر دو آدمی گھوڑیوں پر لڑکی کے گاؤں بھیجے گئے۔ انہیں لڑکی کے باپ کا نام بتا کر کہا گیا تھا کہ کسی کو پتہ نہ چلنے دیں اور صرف اس کے باپ کو بتائیں کہ اگر اس کی لڑکی لاپتہ ہے اور اس کا یہ نام ہے تو وہ ہمارے گاؤں میں ہے، آکر لے جائے۔

وہ ڈھوک ہمارے گاؤں کی نمبرداری میں آتی تھی۔ نمبردار نے اُس بدمعاش کو بلایا اور اسے بتایا کہ لڑکی نے یہ بیان دیا ہے۔ اس شخص نے انکار کر دیا اور کہا کہ وہ کسی ایسی لڑکی کو جانتا ہی نہیں۔ نمبردار نے اُس سے اور کچھ نہ پوچھا۔ وہ سرکاری آدمی تھا۔ اس نے تھانے میں جا کر یہ اطلاع تو ضرور دینی تھی کہ ایک لڑکی اس حالت میں ہمارے گاؤں آئی ہے، اس کا یہ بیان ہے اور اُسے وارثوں کے حوالے کیا جاتا ہے۔

دن کا پچھلا پہر تھا جب لڑکی کا باپ، چچا اور ایک بھائی آ گئے۔ انہوں نے لڑکی کو دیکھا تو وہ باپ کے قدموں پر گر پڑی۔ باپ بالکل چپ رہا۔ لڑکی کے چچا اور بھائی نے بھی کچھ نہ کہا۔ ان کی خاطر تواضع کی گئی۔ انہیں بتایا گیا کہ لڑکی نے انہیں کیا کہا تھا۔ انہیں لڑکی کا سارا بیان سنا دیا گیا۔

''آپ لوگ ہم پر ایک مہربانی کریں'' ___ لڑکی کے باپ نے ہمارے بزرگوں سے کہا ___ ''آپ کسی اور کو پتہ نہ چلنے دیں کہ لڑکی نے کیا کہا ہے اور اس نے اپنے خاوند کو زہر دیا ہے۔ اس کا تو دماغ خراب ہے۔ آپ خود دیکھ رہے ہیں''۔

''کیا اس کا خاوند زندہ ہے؟'' ___ لڑکی کے باپ سے پوچھا گیا۔

''زندہ تو ہے'' ___ اُس نے جواب دیا ___ ''لیکن بہت دنوں سے معلوم نہیں اُسے کیا ہو گیا ہے۔ پیٹ اور سینے میں جلن بتاتا ہے اور کہتا ہے کہ سر پھٹ رہا ہے۔ سب کہتے ہیں کہ اپنی بیوی کے چلے جانے کا صدمہ ہے جو اُسے کھا رہا ہے۔ کسی حکیم اور کسی سیانے کو پتہ نہیں چل رہا کہ یہ کیا بیماری ہے۔ اگر آپ کے گاؤں سے وہاں خبر پہنچ گئی کہ ہماری لڑکی نے یہ کہا تھا کہ اس نے اپنے خاوند کو آہستہ آہستہ اثر کرنے والا زہر دیا تھا تو لڑکی کے سسرال سیدھے تھانے پہنچیں گے اور ہماری لڑکی کو گرفتار کرا دیں گے''۔

یہ تو بڑا لمبا قصہ ہے کہ باپ نے کیا کہا اور ہمارے کسی بزرگ نے کیا کہا۔ ہم سب سمجھ سکتے ہیں کہ لڑکی کے باپ، چچا اور بھائی کے دلوں پر کیا گزر رہی ہوگی۔ لڑکی کے کرتوت

نے سارے گاؤں میں ان کی پگڑی اچھال دی تھی۔ لوگ اپنی طرف سے بھی کہانیاں گھڑ لیتے ہیں۔ انہیں ذرا سا اشارہ چاہیے۔ یہاں تو ان کے سامنے بہت بڑا واقعہ ہو گیا تھا۔ وہ لڑکی کو اپنے ساتھ لے گئے۔

اگلے روز اس لڑکی کے خاوند کا باپ دو آدمیوں کے ساتھ آ گیا۔ یہ بھی لڑکی کے باپ ی طرح معزز لوگ تھے۔ انہوں نے بتایا کہ لڑکی اپنے گاؤں پہنچی تو عورتیں اس کے گھر چلی ئیں۔ لڑکی کا دماغ ٹھکانے نہیں آیا تھا۔ وہ یہی رٹ لگا رہی تھی کہ میں نے اپنے خاوند کو ہر دیا ہے اور مجھے ذبح کر دو یا تھانے لے چلو۔ لڑکی کی ماں نے بہت کوشش کی کہ لڑکی چپ جائے لیکن وہ چپ نہیں ہوئی تھی۔ اُس کے باپ نے گاؤں کی عورتوں کو باہر نکال دیا لیکن توں اور برادری کی عورتوں کو باہر نہیں نکالا جا سکتا تھا۔

لڑکی کی ماں نے یہ مشہور کیا کہ لڑکی پر دشمنوں نے الٹے تعویذ کر دیئے ہیں۔ انہی کے سے وہ گھر سے چلی گئی تھی لیکن گاؤں میں کسی راز کو چھپا کر رکھنا ناممکن ہوتا ہے۔ لڑکی کے رال نے رات ہی رات جاسوسی کر لی تھی۔ عورتیں جو لڑکی والوں کی رشتہ دار تھیں وہ اس سسرال کی بھی رشتہ دار تھیں۔ انہوں نے خبر دوسری طرف پہنچا دی۔ اب یہ لوگ ہمارے ں آئے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ لڑکی کے خاوند کا ایک چچا اور ایک بڑا بھائی اُسے تھانے گئے ہیں۔ انہوں نے زہرخورانی کی رپورٹ درج کرائی تھی۔ یہ آدمی جو ہمارے گاؤں آئے تھے وہ یہ مقصد لے کر آئے تھے کہ انہیں یہاں سے گواہ مل جائیں کہ لڑکی یہاں آئی اور اس نے اپنے خاوند کو زہر دینے کا اقبال کیا تھا۔

ہمارے بزرگوں نے انہیں جواب دیا کہ پولیس نے آ کر پوچھا تو ہم سوچ سمجھ کر ادے دیں گے۔

چھ سات دنوں بعد پولیس بھی آ گئی۔ معلوم ہوا کہ لڑکی کے خاوند کو تھانے لے گئے اس زمانے میں پولیس بڑی تیزی سے حرکت میں آتی تھی۔ اسے ہسپتال بھیج دیا گیا۔ ں سے اس کا تھوک، خون اور قے کیا ہوا کچھ مواد اور نہ جانے کیا کیا لاہور بھیجا گیا۔ ے ایکسپرٹ کی رپورٹ آئی کہ اس شخص کے معدے میں زہر گیا ہے اور اس کی تمام ف کا باعث زہر ہے۔

لڑکی کو اور جس کے ساتھ وہ گھر سے نکلی تھی اسے بھی گرفتار کر لیا گیا تھا۔ تھانیدار نے ڑکی نے بڑا لمبا بیان دیا ہے۔ اس بیان کے مطابق ہم پانچوں دوستوں کے بیان

ہوئے۔لڑکی ہمارے گاؤں میں جس کے گھر آئی تھی اور ہمارے پانچ بزرگوں کے بیان ہوئے۔ ڈھوک کے اس آدمی کو، مولوی کو اور ان کی نشاندہی پر بوگس نکاح کے دونوں گواہوں کو گرفتار کیا گیا۔

چونکہ یہ کیس چکوال تحصیل کا تھا اس لیے مجسٹریٹ کی عدالت کے بعد یہ جہلم سیشن کورٹ میں گیا۔ ہم سب گواہی دینے جاتے رہے۔لڑکی کو ہم ہر پیشی پر دیکھتے تھے۔وہ تو بالکل پاگل ہو چکی تھی۔ملزموں کے وکیل نے اسی نکتے کو پکڑ لیا کہ جس لڑکی کے اقبالی بیان پر مقدمہ کھڑا کیا گیا ہے وہ لڑکی پاگل ہے اور مخبوط الحواس ہے۔سرکاری ڈاکٹروں کو کورٹ میں طلب کیا گیا تھا۔انہوں نے لڑکی کو مخبوط الحواس قرار دے دیا تھا۔جس کے نتیجے میں تمام ملزموں کو بری کر دیا گیا۔

جس آدمی نے اس لڑکی کے ساتھ نکاح پڑھوایا تھا، وہ محض دھوکہ تھا۔ وہ لڑکی کو کسی کی شادی پر نہیں بلکہ اسے بیچنے کے لیے لے جا رہا تھا۔ گاہک انتظار میں تھا۔لڑکی کو اس کے پاس پہنچانا اور رقم وصول کرنی تھی لیکن راستے میں اس درخت پر بجلی گری جس کے نیچے انہوں نے بارش سے پناہ لی تھی تو وہ اتنا دہشت زدہ ہُوا کہ لڑکی کو چھوڑ کر بھاگ آیا۔

چھ سات مہینے اور گزر گئے تو اس لڑکی کے گاؤں کا ایک آدمی مل گیا۔ اس نے بتایا کہ لڑکی بالکل ہی پاگل ہو گئی تھی۔ایک روز وہ مر گئی۔ اُس کے ماں باپ کہتے تھے کہ اُس پر اچانک کسی بیماری کا حملہ ہُوا اور رات ہی رات مر گئی لیکن اس کو گھر والوں نے زہر دے کر یا کسی اور طریقے سے مار ڈالا تھا۔

+++

ہندو کا ناگ دیوپیر کا جن

لڑکی کے بھاگ نکلنے کا کوئی راستہ نہ تھا۔اسے ہندوؤں کے ناگ دیوتا، پیر کے جن، سپیروں کے شیش ناگ اور ایک بدمست بھینسے نے گھیر لیا تھا۔لڑکی نے منہ آسمان کی طرف کر کے کہا۔۔۔ ''یا اللہ!''

ہندو کا ناگ دیوپیر کا جن

میرے عزیز بھائی عنایت! ''حکایت کی ستائیسویں سالگرہ مبارک ہو۔ مجھے زیادہ خوشی تو یہ دیکھ کر ہوتی ہے کہ تم 27 برسوں سے صداقت' حق گوئی اور بے باکی پر روزِ اوّل کی طرح قائم ہو۔ ہمارے ملک میں تو اخبار رسالوں کے مالکان اور ایڈیٹر چڑھتے سورج کے پجاری ہیں۔ انہوں نے صحافت کو بکاؤ مال بنا دیا ہے۔ میں ذاتی طور پر جانتا ہوں کہ تم نے دولت اکٹھی کرنے کی بجائے نقصان اٹھایا ہے لیکن میرے بھائی' بھوک برداشت کر لینا ایمان نہ بیچنا۔ یہ نہ بھولنا کہ تم پاکستان کے اس خطے کی مٹی کی پیداوار ہو جس کے قبرستانوں میں آدھی قبریں راہِ حق کے شہیدوں کی ہیں۔ یہ شہید کشمیر کی جنگ آزادی (48-1947ء) لڑے تھے جنگ ستمبر 1965ء پھر جنگ دسمبر 1971ء لڑے اور ان میں تحریکِ پاکستان کے شہید بھی ہیں۔

پاکستان میں جو امریکی کلچر چل نکلا ہے اور ہمارے معاشرے کی اصل اقدار کی جس طرح مٹی پلید ہو رہی ہے، اس سے کبھی اس قدر دلبرداشتہ ہو جاتا ہوں کہ راولپنڈی شہر سے بھاگ کر اپنے گاؤں چلا جاتا ہوں اور قبرستان میں جا کر گاؤں کے شہیدوں اور اپنے مرحوم دوستوں کی روحوں سے باتیں کرتا ہوں۔ اس حالت میں کوئی مجھے دیکھ لے تو گاؤں کے لوگوں کو جا کر بتائے کہ بابا صابو بڑھاپے میں آ کر پاگل ہو گیا ہے بے چارا! کبھی تو ایسی کیفیت طاری ہو جاتی ہے جیسے وہ میری باتیں سن رہے ہیں اور میں ان کی سُن رہا ہوں۔ میں روحانی سکون محسوس کرنے لگتا ہوں۔

آج تم یاد آئے ہو تو اپنے (بلکہ اچھے) وقتوں کی بہت سی باتیں یاد آ گئی ہیں لیکن بات ''حکایت'' کی سالگرہ کی ہی کروں گا اور میں اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ سالگرہ نمبر میں شرکت کروں۔ میرے پاس روح کی گہرائیوں سے نکلی ہوئی دعائیں ہیں جو عنایت اور ''حکایت'' کے لئے وقف ہیں اور کوئی نہ کوئی واقعہ ذہن کی تاریکیوں سے ڈھونڈ کر نکال لیتا اور پیش کر دیا کرتا ہوں۔

کبھی تو ذہن ہوحق ویرانہ بن جاتا ہے جیسے اس میں اجاڑ اور ویرانی کے سوا کچھ ہے ہی نہیں۔ میں کئی دن ایسا واقعہ یاد کرنے کی کوشش کرتا رہا جو سالگرہ نمبر کے معیار کے مطابق ہو لیکن بڑھاپے نے دماغ کے خلئے اتنے کمزور کر دیئے ہیں کہ کبھی تو جام ہی ہو جاتے ہیں اور یہ بھی یاد نہیں رہتا کہ کتے ہمیں شکار پر لے جایا کرتے تھے یا ہم کتوں کو ساتھ لے جایا کرتے تھے۔ ایک رات اور دن راولپنڈی میں ایسا زبردست موسلا دھار مینہ برسا کہ نالہ لئی چڑھ گیا اور اس نے تباہی مچا دی۔ بہت سی آبادیاں اس کی زد میں آ گئیں۔ نالہ لئی کا جوش صرف ایک دن رہتا ہے پھر پانی اتر جاتا ہے۔ میں دو دن نالہ لئی کا سیلاب دیکھنے بلکہ اپنے دو پوتوں کو دکھانے کے لئے گیا۔

میں بچوں کو ایسی جگہ لے گیا جہاں نالے کے قریب آبادی نہیں تھی۔ ایک طرف کھیت ہیں اور دوسری طرف بنجر اور غیر آباد جگہ ہے۔ لوگوں کے مکان کچھ دور ہیں۔ ایک جگہ زمین ٹیکری کی طرح اونچی تھی۔ میں بچوں کو اس جگہ لے گیا۔ سیلاب جو کناروں سے باہر آ گیا تھا اب کناروں کے اندر چلا گیا تھا لیکن اس کا جوش و خروش ابھی قائم تھا۔

میں جہاں کھڑا تھا وہاں سے بیس بائیس قدم دور کم و بیش ایک گز لمبا سانپ آہستہ آہستہ رینگتا جا رہا تھا۔ وہاں کئی اور تماشائی موجود تھے۔ انہوں نے بھی سانپ دیکھ لیا تھا۔ ''سانپ، سانپ'' کا شور بپا ہو گیا۔ بعض لوگ سانپ پر پتھر اور ڈھیلے پھینکنے لگے۔ سانپ صاف بچ کر نکل گیا اور کہیں غائب ہو گیا۔

یہ سانپ دیکھ کر میرے ذہن کے ویرانے میں بہار آ گئی۔ یادوں کا چشمہ پھوٹ پڑا اور ایسا ہی ایک سانپ یاد آ گیا۔ یہ کوبرا قسم کا سانپ تھا۔ ہم ایسے سانپ کو پھنیئر سانپ کہا کرتے تھے۔ یہ کالے رنگ کا ہوتا ہے اور سارے جسم پر بیضوی نشان ہوتے ہیں۔ اس کے پھن کے پیچھے یہ V نشان ہوتا ہے۔ بہت ہی زہریلا سانپ ہے۔ انسان ہو یا حیوان ہے۔ یہ جسے بھی ڈس لے وہ چند منٹوں میں مر جاتا ہے۔

یہ ہندوستان کا مشہور سانپ ہے۔ جنوبی ہندوستان میں تو یہ افراط سے پایا جاتا ہے اور وہاں کے ہندو اس کی باقاعدہ پوجا کرتے ہیں اور اسے مارنا گناہ سمجھتے ہیں۔ ہندو عورتیں اور مرد برتنوں میں دودھ ڈال کر ان جگہوں پر جا رکھتے ہیں جہاں یہ سانپ ہوتے ہیں۔ سانپ بلوں سے باہر آ کر دودھ پینے لگتے ہیں۔ اس وقت ہاتھ جوڑ کر کچھ پڑھتے اور کوبرا سانپ کو دیوتا مانتے ہوئے اس کی پوجا کرتے ہیں۔

یہ سانپ ہمارے علاقہ پوٹھوہار میں بھی پایا جاتا ہے لیکن اتنا عام نہیں۔ لوگ اس پھنیئر سانپ کا نام سن کر ہی ڈر جاتے ہیں۔ پھنیئر کا مطلب ہے پھن والا۔ کوبرا سانپ کا پھن پھیلی ہوئی حالت میں خاصا چوڑا ہوتا ہے۔

نالہ لئی کے کنارے کوبرا سانپ دیکھا تو جوانی کا ایک واقعہ یاد آ گیا۔ یہ واقعہ سنانے سے پہلے ایک اور بات کہنا چاہوں گا۔ سیلاب آتا ہے تو سانپ باہر آ جاتے ہیں۔ یہ اس لئے کہ پانی ان کے بلوں کے اندر چلا جاتا ہے۔ یہ جب باہر آتے ہیں تو پانی سے نکل کر درختوں پر چڑھ جاتے ہیں۔ سیلابوں میں اکثر لوگ سانپوں کے ڈسنے سے مر جاتے ہیں۔ ایسے واقعات بھی سننے میں آئے ہیں کہ آدمی سیلاب سے بچنے کے لئے درخت پر چڑھ گیا۔ اس نے دیکھا کہ اسی ٹہن پر یا ساتھ والے ٹہن پر ایک لمبا اور موٹا سانپ پہلے سے موجود ہے۔

مجھے واقعہ جو یاد آیا وہ اس طرح ہُوا کہ ہمارے گاؤں سے تقریباً چار میل دور چھوٹا سا ایک گاؤں تھا جو اب خاصا بڑا ہو گیا ہے۔ اس وقت میری عمر 27 یا 28 سال تھی۔ میرے دو بچے پیدا ہو چکے تھے اور مزید بچوں کی پیدائش کا خطرہ موجود تھا۔ ٹی وی کا تصور بھی موجود نہیں تھا اس لئے یہ مقولہ ابھی ایجاد نہیں ہُوا تھا کہ بچے دو ہی اچھے۔ انگریز اپنی ہندوستانی رعایا کی حوصلہ افزائی کیا کرتے تھے کہ بچے پیدا کئے چلے جاؤ۔ انگریز حکومت نے اعلان کر رکھا تھا کہ جو باپ بارہ لڑکے پیدا کرے گا اسے ایک مربع زرعی زمین نہری علاقے میں الاٹ کی جائے گی۔

انگریزوں کو اپنی فوج کے لئے زیادہ سے زیادہ نفری کی ضرورت تھی۔ پہلی اور خصوصاً دوسری جنگ عظیم میں انگریزوں کو اپنے محکوم ملکوں میں سب سے زیادہ فوجی نفری ہندوستان سے ملی تھی۔ معافی چاہتا ہوں کہ بات سے بات نکال کر میں کسی اور طرف نکل گیا ہوں۔ اصل بات یہ تھی کہ میں نے چار میل دور کے جس گاؤں کا ذکر کیا ہے، وہاں سے ایک کالے ناگ کی خبریں آنے لگی تھیں کہ راستے میں آجاتا ہے اور جو کوئی اسے دیکھتا ہے وہ اسے مارنے کی بجائے ڈر کر بھاگ جاتا ہے۔ لوگ بتاتے تھے کہ اس کی لمبائی ایک گز سے زیادہ ہے اور یہ عام سانپوں سے زیادہ موٹا ہے۔ کچھ لوگوں نے اس کو پھن پھیلائے بھی دیکھا تھا۔ وہ کہتے تھے کہ اس کا پھن ایک بالشت چوڑا ہوگا۔

پہلے پہل اس کالے ناگ کی خبریں سنیں تو ہم نے کوئی خاص توجہ نہ دی۔ سانپ تو اکثر راستے میں کنڈلی مارے بیٹھے یا آہستہ آہستہ رینگتے اور راستہ کاٹتے نظر آتے تھے۔ جوں

جوں وقت گزرتا گیا یہ کالا ناگ ایک عام سانپ کی بجائے کوئی پُراسرار مخلوق بن گیا۔ اس کے متعلق وہی روایتیں اور حکایتیں مشہور ہونے لگیں جو لوگوں نے سانپوں کے ساتھ وابستہ کر رکھی تھیں جنہیں میں بھی اس عمر میں برحق مانا کرتا تھا۔ یہ میرا مشاہدہ ہے کہ انسان جتنا ان پڑھ اور پسماندہ ہوتا ہے اتنا ہی سنسنی اور پُراسراریت کو پسند کرتا اور دلچسپ مفروضوں اور جذباتی مبالغہ آرائی کو سچ مانتا ہے۔

کالے ناگ والے گاؤں کا کوئی نہ کوئی آدمی چوتھے پانچویں روز کہیں جاتا ہمارے گاؤں میں سے گزرتا اور پانی پینے اور حقے کا کش لگانے کے لئے رک جاتا تھا۔ وہ کالے ناگ کی کوئی نئی ہی بات سنا جاتا تھا۔

ایک روایت یہ مشہور ہوئی کہ یہ سانپ نہیں بلکہ ایک ہندو کی بدروح ہے جو چالیس سال پہلے اس کھیت میں قتل ہو گیا تھا۔ قتل کی کہانی یہ سنائی گئی کہ مقتول ایک ہندو ساہوکار کا بیٹا تھا۔ باپ لوگوں کو سود پر قرضے دیتا تھا۔ ایک شام مقتول سود کی وصولی کر کے گاؤں سے نکل گیا۔ وہ کسی اور گاؤں کا رہنے والا تھا۔ وہ اس جگہ پہنچا جہاں کالے ناگ نے آ ڈیرے ڈالے تھے تو ایک دو آدمیوں نے اسے روک کر قتل کر دیا اور رقم لے کر غائب ہو گئے۔ مقتول نوجوان تھا۔

پھر یہ مشہور ہُوا کہ یہ من والا ناگ ہے اور اس نے جہاں ٹھکانہ کر لیا ہے وہاں سے کبھی نہیں جائے گا۔ میرا خیال ہے کہ ہماری آج کی نسل اور بڑے شہروں میں رہنے والے لوگ نہیں جانتے ہوں گے کہ یہ من کیا چیز ہے۔ دیہات میں اب بھی اس من کو صحیح اور سچ مانا جاتا ہے۔

روایت یہ ہے کہ کوئی ایک سانپ ایک سو سال کی عمر کو پہنچ جاتا ہے۔ اس وقت اس کے سر میں یا جسم کے اندر کانچ کی گولی جیسی ایک گولی پیدا ہو جاتی ہے۔ اس گولی کی خاصیت یہ ہے کہ یہ مٹی کے ڈھیلے پر، پتھر پر، ایک لکڑی یا لوہے پر یا کسی بھی چیز پر رگڑ دو وہ چیز سونا بن جاتی ہے لیکن آج تک کوئی خدا کا بندہ کسی سانپ سے من حاصل نہیں کر سکا۔ اس گولی کو من کہتے ہیں۔

روایت کے مطابق، سانپ اپنے من کے ساتھ اس طرح کھیلتا رہتا ہے کہ اسے منہ میں لے کر اوپر کو اچھالتا اور اسے منہ سے پکڑتا یعنی کیچ کرتا ہے۔ کہتے ہیں پورے چاند کی رات سانپ من کے ساتھ کھیلتے گذار دیتا ہے۔

یہ بھی وثوق سے کہا جاتا ہے کہ من کی چمک اتنی زیادہ ہوتی ہے کہ اسے زمین میں دفن کر دو تو وہاں سے زمین چمکنے لگتی ہے۔ صرف سانپ کا منہ ایک ایسی جگہ ہے جہاں سے اس کی چمک باہر نہیں آتی' اور دوسری چیز جو اس چمک کو دبا سکتی ہے وہ مویشیوں کا گوبر ہے۔ کہتے ہیں من کو گوبر میں رکھو تو پتہ ہی نہیں چلتا کہ اس میں من ہے۔

پھر یہ مشہور ہے کہ من والا سانپ بہت ہی خطرناک ہوتا ہے۔ عام طور پر سانپ کتنا ہی زہریلا' کتنا ہی بڑا اور کتنا ہی خطرناک کیوں نہ ہو وہ انسان پر حملہ کرتا ہے نہ حیوان پر۔ اس کے قریب سے گزر جاؤ' یہ چوکس تو ہو جاتا ہے لیکن حملہ نہیں کرتا۔ اگر اسے خطرہ محسوس ہو تو بھاگ جاتا ہے اور اگر بھاگنے کا راستہ نہ ملے تو حملہ کرتا اور اپنے دو لمبے دانتوں کے ذریعے پورا زہر انسان یا حیوان کے جسم میں داخل کر دیتا ہے۔

من والا سانپ ہر وقت اور ہر حال میں حملے کے موڈ میں رہتا ہے۔ کوئی انسان اس کے ٹھکانے سے کچھ دور سے گزر رہا ہو تو یہ سانپ اس کے پیچھے دوڑ پڑتا ہے اور انسان کو اپنے علاقے سے نکال کر واپس آتا ہے۔ وہ ہر وقت یہ خطرہ محسوس کرتا ہے کہ جو جانور یا انسان اس کے قریب یا کچھ دور سے گزرتا ہے وہ اس سے اس کا من چھیننے کی کوشش میں ہوتا ہے۔

اس گاؤں کے کالے ناگ کے متعلق لوگ بتاتے تھے کہ جس کھیت میں یہ رہتا ہے اس کے قریب سے راستہ گزرتا ہے۔ ناگ کسی کو اس کھیت کے قریب سے گزرتے دیکھتا ہے تو اس کے پیچھے دوڑ پڑتا ہے۔ اس کی اسی خصلت کو دیکھ کر لوگوں نے یہ بات بنالی ہے کہ اس ناگ کی عمر سو سال ہو گئی ہے اور اس کے سر میں من پیدا ہو گیا ہے۔ دو آدمیوں نے یہ بھی کہہ دیا کہ انہوں نے پورے چاند کی رات ناگ کو من کے ساتھ کھیلتے دیکھا ہے۔

یہ سن کر لوگوں نے اس راستے سے گزرنا چھوڑ دیا۔ اصل نقصان اس کھیت کے مالک کو ہُوا جس میں ناگ نے آ کر ڈیرہ ڈال دیا تھا۔ اس کسان نے اس کھیت میں ہل چلانا چھوڑ دیا اور کچھ بھی کاشت نہ کر سکا۔

من والے سانپ کے متعلق بڑی دلچسپ اور سنسنی خیز داستانیں سنی سنائی جاتی تھیں۔ مثلاً ایک شہزادی نے کہا کہ میں اس آدمی کے ساتھ شادی کروں گی جو سانپ کا من لا کر مجھے دے گا۔ ایک شہزادہ جاتا ہے۔ اسے ایک سپیرا بتاتا ہے کہ فلاں جگہ من والا سانپ موجود ہے۔ یہاں سے الف لیلہ کی خیالی داستانوں جیسی کہانی شروع ہوتی تھی جو کہیں ختم ہونے میں ہی نہیں آتی تھی۔ ایسی داستانیں سنانے والے خاص قسم کے لوگ ہوتے تھے جو داستان

گوئی میں ایسی مہارت رکھتے تھے کہ سننے والوں کو ہپناٹائز کر لیتے تھے اور رات گزر جاتی تھی۔

یہ تو مجھے بہت مدت بعد معلوم ہُوا تھا کہ سانپ کا من محض خیالی چیز اور ایک مفروضہ ہے۔ اس واقعہ کے وقت میں اور میرے دوست ہر کسی کی طرح اس مفروضے کو برحق مانتے تھے۔

پھر اس کالے ناگ کے متعلق یہ "مصدقہ" خبر ملی کہ یہ جن ہے۔ یہ بھی روایت تھی کہ جس سانپ کی عمر ایک سو سال ہو جاتی ہے وہ جن بن جاتا ہے اور چاہے تو انسانوں کے روپ میں بھی آ جاتا ہے۔ اس کی تائید میں دو آدمیوں نے گاؤں والوں کو سنایا کہ وہ ناگ والے کھیت کے قریب سے گزر رہے تھے کہ تیرہ چودہ سال عمر کے ایک بڑے ہی خوبصورت لڑکے کو راستے میں کھڑے دیکھا۔ اس نے دونوں آدمیوں کو روک کر کسی ایسے گاؤں کا نام لے کر راستہ پوچھا جو انہوں نے پہلے کبھی نہیں سنا تھا۔ دونوں کے دلوں پر گھبراہٹ آ پڑی اور انہیں اس لڑکے پر شک ہُوا۔ ایک نے اپنے پیرومرشد کے نام کا ورد شروع کر دیا۔ لڑکا وہیں کھڑے کھڑے غائب ہو گیا اور انہوں نے ایک کالا ناگ دیکھا جو راستے کے ساتھ والے کھیت میں رینگتا جا رہا تھا۔

اس کو ہم گپ سمجھتے تھے لیکن لوگوں کی اکثریت نے اسے سچ مان لیا اور اس گاؤں پر خوف و ہراس طاری ہو گیا۔

کالے ناگ کو نظر آئے چھ مہینے گزر گئے تھے اور ان چھ مہینوں میں ہم نے اُس کے متعلق اتنی زیادہ باتیں سنیں جن میں کچھ آج مجھے یاد ہی نہیں۔ موٹی موٹی باتیں لکھ دی ہیں۔

میری شکاری پارٹی کے دوست ایک مہینے سے آپس میں صلاح مشورہ کر رہے تھے کہ اس ناگ کو دیکھنے چلیں۔ دوستوں کی اکثریت من والا سانپ دیکھنے کی خواہشمند تھی اور بعض یہ سچ جان کر اسے دیکھنا چاہتے تھے کہ یہ جن ہے۔ اس طرح ہر کوئی اس ناگ کو اپنے اپنے خیال کے مطابق دیکھنا چاہتا تھا۔

صرف میں اور میرا اعزیز دوست شاہباز خان یہ سوچ رہے تھے کہ یہ ناگ اس کے سوا اور کچھ بھی نہیں کہ سانپ ہے۔ البتہ ہم یہ مانتے تھے کہ اس کی عمر ایک سو سال ہو گئی ہے اور اس کے سر یا منہ میں من پیدا ہو گیا ہے پھر بھی یہ سانپ ہی ہے' ہم وہاں جا کر یہ دیکھیں گے کہ ہم اسے مار سکتے ہیں یا نہیں۔ راجہ شاہباز خان تو اور ہی زیادہ مضبوط دل گردے والا جوان تھا اور اس کا دماغ جو کچھ بھی سوچتا ٹھیک سوچتا تھا۔ اس نے کہا کہ سب دوستوں سے بات کرتے ہیں اور ایک روز سب چل پڑتے ہیں' وہاں جا کر دیکھیں گے کہ اسے مارنا

ہمارے بس میں ہے یا نہیں۔

ہم نے اسی روز شکاری دوستوں کو اکٹھا کر کے کھیتوں میں میٹنگ کی۔ ہم نے بڑی خطرناک کارروائیاں کی تھیں لیکن کالے ناگ کو مارنے کے معاملے میں ہماری اسمبلی تقسیم ہو گئی۔ بعض راضی ہو گئے اور بعض نے شدید مخالفت کی۔ مخالفت کرنے والے دوست کالے ناگ کو کوئی اور ہی مخلوق سمجھ رہے تھے۔ ہم نے سب کو یہ کہہ کر اجلاس برخاست کر دیا کہ ہر دوست اس مسئلے پر غور کرتا رہے پھر ایک اور میٹنگ کریں گے۔

میں اور شاہباز خان اس کوشش میں تھے کہ ناگ والے گاؤں کا کوئی ایسا عقلمند آدمی مل جائے جو اس ناگ کی صحیح باتیں بتا سکے۔ مثلاً یہ کہ یہ کس وقت باہر نکلتا ہے اور کیا کرتا ہے۔ یہ بھی ذہن میں رکھیں کہ وہ گرمیوں کا موسم تھا۔ یہ سانپوں کا من پسند موسم ہوتا ہے اور اس موسم میں سانپوں کی زہر والی تھیلیاں بھری ہوئی ہوتی ہیں۔ سردیوں میں سانپ زیرِ زمین رہتے ہیں۔

تین چار دنوں بعد اتفاق سے ہمیں ویسا ہی ایک آدمی مل گیا جیسا ہم چاہتے تھے۔ وہ اسی گاؤں کا رہنے والا تھا جس کے ایک کھیت میں یہ کالا ناگ رہتا تھا۔ ادھیڑ عمر آدمی تھا' کچھ پڑھا لکھا بھی تھا اور اپنے ذریعہء معاش کے سلسلے میں چند سال راولپنڈی میں مقیم رہا تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ اس کا دماغ کچھ روشن ہو گیا تھا۔

ایک روز ہمارے گاؤں میں سے گزرا تو اس کے ملنے والے ایک آدمی نے اس کو روک لیا۔ مجھے پتہ چلا تو میں اسے اپنے گھر لے آیا اور اپنے تین دوستوں کو بھی بلا لیا۔ اس کی خاطر تواضع کی اور کہا کہ وہ ہمیں اس ناگ کے متعلق حقیقی باتیں بتائے۔

اس نے کہا کہ یہ دوسرے سانپوں کی طرح ایک سانپ ہے اور بہت ہی زہریلا سانپ ہے۔ کہیں سے اس کھیت میں آ گیا ہے اور یہیں کا ہو کے رہ گیا ہے۔ اس حقیقت پسند آدمی نے ہمیں جو تفصیلی باتیں سنائیں وہ مختصراً یہ تھیں کہ اس کھیت میں اور اس کے اردگرد کھیتوں میں چوہے زیادہ ہیں۔ یہ سانپ کی خوراک تھی جو اسے بافراط مل رہی تھی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ ناگ نے یہیں مستقل ٹھکانہ بنا لیا۔

چونکہ اس ناگ کی لمبائی اور موٹائی خاصی زیادہ تھی اس لئے اسے کوئی مارنے کی جرأت نہیں کرتا تھا۔ اس نے ایک بکری کو ڈس کر مار ڈالا۔ پھر ایک صبح کے دھندلکے میں ایک آدمی رفع حاجت کے لئے اس کھیت میں جا بیٹھا اور سانپ نے اس کا کام تمام کر دیا۔

اس آدمی نے گھر پہنچنے کی بہت کوشش کی تھی لیکن نہ پہنچ سکا۔ راستے میں ہی گرا اور مر گیا۔

پھر ایک آدمی کا بڑا ہی خوبصورت کتا اس ناگ کا شکار ہو گیا۔ مالک نے اسے کھیتوں میں لے جا کر پٹے سے زنجیر اتار دی اور کتا اِدھر اُدھر بھاگنے دوڑنے لگا اور ناگ والے کھیت میں پہنچ گیا۔ کالا ناگ کنڈلی مارے بیٹھا تھا۔ کتا اس کے قریب جا کر اسے سونگھنے لگا۔ مالک نے دیکھ لیا اور ڈھیلا اٹھا کر مارا لیکن ناگ کُتے کے منہ پر ڈس چکا تھا۔ کُتے کو مرتے دس منٹ بھی نہیں لگے ہوں گے۔

پھر اس پڑھے لکھے آدمی نے ایک سنی سنائی بات ہمیں سنائی اور ساتھ یہ بھی کہا کہ اسے پوری طرح یقین نہیں کہ سانپ ایسے کرتا ہے۔ بات یہ تھی کہ ایک آدمی نے یہ مشہور کر دیا کہ اس نے دیکھا کہ ایک گائے ناگ والی جگہ جا نکلی۔ ناگ گائے کی پچھلی ٹانگوں کے ساتھ اس طرح لپٹ گیا جس طرح کسی جانور کو قابو میں رکھنے کے لئے رسی سے اس کی ٹانگیں باندھی جاتی ہیں۔ کالے ناگ نے گائے کی ٹانگیں اس طرح جکڑ لیں اور اس کا ایک تھن اپنے منہ میں لے لیا۔ گائے کھڑی کانپتی رہی اور ناگ نے باری باری چاروں تھنوں سے دودھ پی لیا پھر گائے کو چھوڑ دیا۔

ہم نے پہلے بھی سنا تھا کہ سانپ اس طرح گائے یا بھینس کا دودھ پی لیتے ہیں لیکن کسی نے کبھی کسی سانپ کو اس طرح دودھ پیتے نہیں دیکھا تھا۔ میں خود بھی اسے سچ نہیں مانتا۔ میں یہ جانتا ہوں کہ کوئی بھی جانور ہو' سانپ کو دیکھ کر بھاگ جاتا ہے۔ خود آزما لیں۔ گھوڑے پر سوار ہو جائیں۔ راستے میں کہیں سانپ ہو گا اور گھوڑا اسے دیکھ لے گا تو گھوڑا وہیں رک جائے گا' کانپنے لگے گا اور آہستہ آہستہ پیچھے ہٹنے لگے گا۔ اگر سوار گھوڑے سے اتر کر گھوڑے کو تھپکائے اور پیچھے لے آئے تو گھوڑا نارمل حالت میں آ جاتا ہے اور اگر سوار لگام کو جھٹکے دے دے کر ایڑ لگائے تو گھوڑا بے لگام ہو کر بھاگ اٹھتا ہے۔

اس کالے ناگ کے واقعہ کے آٹھ دس سال بعد جب میں نے اردو اور انگریزی کی کتابیں پڑھنی شروع کی تھیں تو برٹش آرمی کے ایک انگریز کیپٹن فریڈی گیسٹ کی کتاب THE INDIAN CAVALARYMAN ہاتھ لگی۔ اس نے وسطی ہندوستان کے ایک علاقے کا ذکر کیا ہے جہاں انگریز افسر گھوڑوں پر سوار ہو کر برچھیوں سے خنزیروں کا شکار کھیلا کرتے تھے۔ اس نے ایک واقعہ لکھا ہے ایک سانپ ایک گائے کی پچھلی ٹانگوں کے ساتھ لپٹا ہوا اس کا دودھ پی رہا تھا لیکن یہ منظر اس کیپٹن نے اپنی آنکھوں نہیں دیکھا تھا اس لئے

اس نے پوری طرح تسلیم نہ کیا کہ سانپ ایسا کرتا ہے۔ اس نے مختلف مقامی لوگوں سے پوچھا تھا۔ ایک دو پرانی عمر کے آدمیوں نے اسے بتایا کہ ہر سانپ یوں نہیں کرتا اور ایسا واقعہ شاذ و نادر ہی ہوتا ہے۔ سوچنے والی بات یہ بھی ہے کہ سانپ خود بھی انسان اور حیوان سے ڈرتا ہے۔

میں نے اس معزز آدمی سے پوچھا کہ اس ناگ کو مارنے کی کوشش کیوں نہیں کی گئی۔ اُس نے بتایا کہ بڑی آسانی سے اسے مارا جا سکتا تھا۔ گاؤں میں ایک ریٹائرڈ صوبیدار کے پاس دو نالی بندوق بھی ہے اور کچھ لوگ اسے مارنے کے لئے تیار بھی ہو گئے تھے لیکن ایک دو دنوں میں ہی اس ناگ کے متعلق ایسی باتیں پھیل گئیں کہ ریٹائرڈ صوبیدار بھی ڈر گیا۔ اس آدمی نے بتایا کہ لوگوں کو مزید وہم اور خوف میں کس کس نے مبتلا کیا۔ سب سے پہلے اس علاقے کے پیر صاحب نے یہ خبر سنائی کہ اس ناگ کی عمر سو سال ہو گئی ہے اور اب یہ جن بن گیا ہے۔ اسے جو کوئی مارے گا جنات اس کا پورا خاندان تباہ کر دیں گے۔

کھیتوں میں تو سانپ ہوتے ہی ہیں اور لوگ سوائے محتاط ہونے کے اور کچھ نہیں کرتے۔ اس ناگ کو مارنے کی ضرورت یہ پیش آ گئی تھی کہ یہ کھیت ایک معمولی سے کسان کا تھا جس کے پاس زرعی زمین کے ایسے ہی چھوٹے چھوٹے تین اور ٹکڑے تھے۔ اس نے ناگ والے ٹکڑے میں کاشت چھوڑ دی تھی۔ گاؤں والوں کو احساس تھا کہ سانپ کو نہ مارا گیا تو اس بے چارے کسان کا بہت نقصان ہوگا۔

ایک شاہ جی کو بلایا گیا جس کے متعلق مشہور تھا کہ اس کے قبضے میں جنات ہیں۔ پہلے تو اس نے دو تین دن اپنی ٹہل سیوا کروائی اور پھر ناگ والے کھیت میں گیا۔ یہ ناگ عموماً کھیت میں پھرتا رہتا تھا۔ شاہ جی کی نظر اس پر پڑی تو یہ کہہ کر رخصت ہو گیا کہ یہ جنات کا سردار ہے اور اسے کسی خاص طریقے سے ہی یہاں سے بھگایا جائے گا۔ اس طرح یہ تصدیق ہو گئی کہ یہ ناگ جنات کی مخلوق میں سے ہے۔

گاؤں کا نمبردار ڈھونڈ ڈھونڈ کر ان دو سپیروں کو ساتھ لے آیا جو ویرانوں میں جا کر سانپ پکڑا کرتے تھے۔ انہوں نے آ کر بہت بین بجائی لیکن سانپ باہر نہ آیا۔ وہ انتظار کرتے رہے۔ آخر سانپ اپنی مرضی سے باہر آیا۔ سپیروں نے دیکھا تو وہ اُچھلتے کودتے دور ہٹ گئے اور یہ فتویٰ دیا کہ یہ شیش ناگ ہے یعنی سانپوں کا بادشاہ۔ انہوں نے کہا کہ اسے مارا گیا تو پھر سانپوں کا ایک لشکر گاؤں پر حملہ کر دے گا۔ اب تو کوئی اس سانپ کو

مارنے کی سوچتا ہی نہیں تھا۔

یہ تو آپ کو معلوم ہی ہوگا کہ سانپ سن نہیں سکتا اور اس پر بین کچھ اثر نہیں کرتی۔

اس طرح یہ سانپ پُراسرار مخلوق بن گیا۔ سانپ نے جب دیکھا کہ یہاں اس کے لئے کوئی خطرہ نہیں اور کھانے کو چوہے مل جاتے ہیں تو وہ بے خوف و خطر کھیت میں گھومنے پھرنے لگا۔ لوگوں نے اس راستے سے گزرنا چھوڑ دیا۔ یہ بات ایک سنیاسی نے پورے یقین کے ساتھ بتائی تھی کہ اس سانپ کی عمر سو سال ہو گئی ہے اور اس کے اندر من پیدا ہو گیا ہے۔

یہ بات بھی ذہن میں رکھیں کہ اس گاؤں میں ہندوؤں کا ایک گھر تھا۔ وہاں سے کچھ دور ایک اور گاؤں میں تین چار ہندو کنبے رہتے تھے۔ ایک روز یہ سب آ گئے اور لوگوں کو سمجھانے لگے کہ اس سانپ کو سانپ نہ سمجھیں، یہ ناگ دیوتا ہے۔ اسے مارو گے تو اس علاقے میں قحط پڑ جائے گا اور تم بھوکے مر جاؤ گے۔ لوگ اور زیادہ خوفزدہ ہو گئے۔ ان ہندوؤں نے ایک حرکت یہ بھی کی کہ مٹی کے پیالے میں دودھ ڈال کر پیالہ کھیت میں رکھا اور ہٹ کر دیکھنے لگے۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد ناگ نکلا۔ آہستہ آہستہ پیالے تک گیا اور دودھ پی لیا۔

گاؤں کے مولوی صاحب کو کسی نے بتایا کہ بعض مسلمان اس ناگ والے کھیت میں پیالے میں دودھ ڈال کر رکھ آتے ہیں۔ مولوی صاحب نے گھر گھر یہ اطلاع پہنچا دی کہ یہ سانپ اگر دیوتا ہی ہے تو جو مسلمان اسے دودھ پلائے گا وہ مرتد کہلائے گا۔ مولوی صاحب نے لوگوں سے کہا کہ مسجد میں آؤ اور اللہ سے مدد مانگو، اس کی ذاتِ باری اس بلا سے نجات دلا سکتی ہے۔ لوگوں نے مسجد میں جا کر دعائیں مانگنی شروع کر دیں۔

ہم نے اس آدمی کے ساتھ یہ بات کی کہ ہم اس ناگ کو مارنا چاہتے ہیں۔ اس نے ہماری حوصلہ افزائی کی اور کہا کہ ہمت کرو لیکن یہ سوچ لو کہ لوگ تمہیں ڈرائیں گے اور ہو سکتا ہے کہ بعض لوگ تمہیں روک بھی دیں...... ہم اتنی جلدی ڈرنے والے نہیں تھے۔ اس شخص کے ساتھ ہم نے ایک پلان تیار کر لیا اور یہ طے پایا کہ ہم کسی بھی دن آ جائیں گے۔ یہ آدمی رخصت ہو گیا۔

میں اگر یہ کہوں کہ ہم بالکل ہی نہیں ڈرے تھے تو یہ جھوٹ ہوگا۔ میں پہلے بتا چکا ہوں کہ ہم بھی آخر اسی پسماندہ دیہاتی معاشرے کے افراد تھے اور سانپوں کے متعلق بعض مفروضوں کو بھی برحق سمجھتے تھے۔ اس کے باوجود ہم نے وہاں جانے کا بڑا پکا ارادہ کر لیا۔

سوچا تھا کہ اس ناگ کو مارنے کی صورت بن گئی تو ماردیں گے ورنہ اسے دیکھ کر واپس آجائیں گے۔ آخر ایک روز ہم علی الصبح کُتوں کو ساتھ لے کر اس طرح چل پڑے جس طرح ہم معمول کے شکار کے لئے نکلا کرتے تھے۔ ہم میں نے کسی نے کسی کو بھی نہیں بتایا تھا کہ کالے ناگ کو مارنے جارہے ہیں۔ اگر بتادیتے تو ہماری مائیں کلہاڑیاں لے کر ہمارے راستے میں آجاتیں۔ خیال آتا ہے کہ ماں بھی ایک عجیب چیز ہوتی ہے۔ دیہات میں مائیں اپنے شیطان اور شرارتی بچوں کو تین گالیاں عام طور پر دیا کرتی تھیں۔ ایک یہ کہ تجھے گولی لگے، دوسری یہ کہ تیرا کلیجہ کُتوں کے آگے پھینکوں اور تیسری یہ کہ تجھے سانپ کاٹے لیکن کسی ماں کو یہ پتہ چلے کہ اس کا بیٹا وہاں جارہا ہے جہاں سانپوں کا خطرہ ہے تو ماں اس کی ٹانگوں سے لپٹ کر روک لے۔

کتوں کو ساتھ لے جانا بیکار تھا۔ کُتے سانپ کو نہیں مار سکتے تھے بلکہ سانپ کُتے کو لے بیٹھتا۔ کُتے تو ہم یہ ظاہر کرنے کے لئے ساتھ لے گئے تھے کہ ہم شکار پر جارہے ہیں۔ اس روز ہماری شکاری ٹیم کا ہر لڑکا کسی نہ کسی ہتھیار سے مسلح تھا۔ لاٹھیاں تھیں، ڈنڈے اور کلہاڑیاں بھی تھیں۔ ہمارا پلان یہ تھا کہ سانپ ہم میں سے کسی کے پیچھے دوڑے گا تو باقی ساتھی سانپ پر لاٹھیوں اور کلہاڑیوں سے حملہ کردیں گے۔ یہ تو ہمارے ذہن میں آئی ہی نہیں تھی کہ گاؤں کے لوگ مسجد میں دعائیں کررہے ہیں اور اللہ سے مدد مانگ رہے ہیں، اللہ اپنے وعدے کے مطابق ہمیں یہ معجزہ دکھادے گا کہ مجھے پکارو اور میں مدد بھیجوں گا۔

ہم اس گاؤں میں گئے۔ وہ پڑھا لکھا معزز آدمی ہمارا میزبان اور گائیڈ بن گیا۔ لوگوں کو پتہ چلا کہ ہم کالے ناگ کو مارنے آئے ہیں تو انہوں نے ہمیں ڈرانا شروع کردیا۔ وہ بوڑھا ہندو بھی آگیا جو اسی گاؤں میں رہتا تھا۔ اس نے کہا کہ یہ دیوتا ہے، یہ تمہیں ماردے گا، تم اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکو گے۔ اس نے یہ بھی کہا کہ دیوتا کی توہین کرو گے تو تمہارے کھڑے فصل جل جائیں گے۔

دیہات کی مسجدوں میں عموماً ان پڑھ اور فضول سی قسم کے مولوی امامت کے فرائض ادا کیا کرتے ہیں اور ان میں اس امامت کا شائبہ تک نہیں ہوتا جس کا معیار اسلام نے مقرر کیا ہے۔ اس گاؤں کا مولوی بھی کچھ ایسا ہی لگتا تھا لیکن اس نے ایک ایسی بات کی کہ ہمارے دل خوش ہوگئے۔ وہ مجھے اور میرے دو ساتھیوں کو اشارے سے الگ لے گیا۔

''تم مسلمانوں کی اولاد ہو'' ___ مولوی نے کہا ___ ''یہ ہندو کہتا ہے کہ یہ ناگ ان کا

دیوتا ہے۔ تم اس ناگ کو مار کر اس ہندو کو جھوٹا ثابت کردو۔ اس کا تمہیں بہت ہی ثواب ملے گا۔ میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں اور اللہ تمہارے ساتھ ہے''۔

ہم نے مولوی صاحب سے پوچھا کہ اس ناگ کے متعلق ان کی اپنی رائے کیا ہے۔ مولوی نے اتنا ہی کہا کہ اس کی وہ رائے نہیں جو یہاں کے لوگوں کی ہے۔ تم اللہ کا نام لے کر جاؤ...... مولوی کی ان باتوں سے ہمارا حوصلہ بڑھ گیا۔ اس کی اس بات کو ہم نے دل پر نقش کرلیا کہ ہندوؤں کے دیوتا کو مارنا ہے۔

ہم وہاں جا پہنچے جہاں ناگ نے اپنا راج قائم کیا ہُوا تھا۔ گاؤں کے بہت سے لوگ ہمارے پیچھے پیچھے آئے لیکن ناگ والے کھیت سے دور ہی رک گئے۔ یہ ان کی خوفزدگی کا عالم تھا۔

جس کھیت میں ناگ رہتا تھا وہ آٹھ دس مرلے کا ٹکڑا تھا۔ اس کے تین اطراف جو کھیت تھے وہ گز ڈیڑھ گز اونچے تھے۔ چوتھی طرف چھوٹا سا کھڈ تھا اور اس سے آگے جو کھیت تھا وہ ذرا نیچے تھا۔ ہمارے علاقے میں کھیت اسی طرح ہوتے ہیں۔ کوئی اونچا، کوئی اس سے بھی اونچا اور کوئی بالکل نیچے۔

ہم ناگ کے انتظار میں تھے جو ابھی سامنے نہیں آیا تھا۔ اس کے بعد جو ہُوا وہ ایسا اچانک ہُوا کہ ہم کچھ سمجھ ہی نہ سکے کہ یہ کیسے ہوگیا۔ ہُوا یہ کہ تھوڑی دور سے ہمیں ایک بدمست بھینسا آتا نظر آیا۔ تین چار بیل اور شاید ایک گائے ایک جگہ چر رہے تھے۔ بھینسے نے ایک بیل کو اتنی زور سے ٹکر ماری کہ بیل ایک پہلو کے بل گرا اور باقی وہاں سے بھاگ گئے۔ بیل بڑی تیزی سے اٹھا۔ بھینسے نے اسے پھر ٹکر ماری۔ اب کے بیل گرا تو نہیں لیکن بھاگ نکلا۔

میں نے اپنی دو تین کہانیوں میں مست بھینسے کا ذکر کیا ہے۔ یہ چیز خاصے عرصے سے ناپید ہوگئی ہے۔ دو مست بھینسے جب کسی بھینس پر رقابت میں لڑ پڑتے تھے تو وہ ایک جگہ ہی نہیں لڑتے تھے بلکہ ایک دوسرے کو ٹکریں مارتے گاؤں جا پہنچتے تھے۔ لڑتے ہوئے بھینسوں کو دیکھ کر گاؤں میں شور اٹھتا تھا کہ بچوں کو اندر کرلو' بھینسے لڑتے آرہے ہیں۔ لوگ بچوں کو گھروں میں لے جا کر اندر سے دروازے بند کرلیا کرتے تھے۔

اکیلا بدمست بھینسا تو اور زیادہ خطرناک ہوتا تھا۔ کوئی انسان یا حیوان اس کے راستے میں آجاتا تو بھینسا اسے ٹکریں مار مار کر ختم کردیتا تھا۔ بڑے بڑے دلیر آدمی بھی

مست بھینسے کو قابو میں لینے کی جرأت نہیں کرتے تھے۔

یہ مست بھینسا بھی ویسا ہی تھا۔ اس بیل کو مار بھگا کر وہ ہماری طرف آ رہا تھا۔ ہمارے ساتھ کُتے تھے' لاٹھیاں اور کلہاڑیاں بھی تھیں۔ ہم تیار ہو گئے کہ بھینسا ہماری طرف آیا تو ہم اس پر کُتے چھوڑ دیں گے اور کلہاڑیوں وغیرہ سے بھی اس پر حملہ کر دیں گے۔ ہم خوش ہو رہے تھے کہ لہو گرم کرنے کا ایک بہانہ چلا آ رہا تھا۔

جو لوگ ناگ والے کھیت سے اوپر والے کھیتوں میں کھڑے تھے وہ ایک ایک کر کے وہاں سے کھسکنے لگے۔ معلوم نہیں کہاں سے تیرہ چودہ سال عمر کی ایک لڑکی سامنے والے کھیت میں آ گئی۔ یہ وہ کھیت تھا جو ناگ والے کھیت سے ذرا نیچے تھا۔ اس نے ایک بکری کی رسی پکڑ رکھی تھی۔ بھینسے نے اس کی طرف رخ کر لیا۔ کسی نے بڑی بلند آواز سے کہا' کاکی ادھر بھاگ آ لیکن بھینسا اتنی تیزی سے آ رہا تھا کہ لڑکی بروقت بھاگ نہ سکی۔

بھینسے نے بکری کو ٹکر مار کر ایسا گرایا کہ بکری اٹھ نہ سکی اور لڑکی بکری کی رسی چھوڑ کر ناگ والے کھیت کی طرف دوڑ پڑی۔ بھینسا اس کے پیچھے آیا اور لڑکی ناگ والے کھیت میں آ گئی۔ اس کھیت کے تین اطراف والے کھیت گز ڈیڑھ گز اونچے تھے۔ لڑکی نے ایک کھیت پر چڑھنے کی کوشش کی لیکن وہ اتنی گھبرائی اور ڈری ہوئی تھی کہ اوپر چڑھنے کی بجائے نیچے گر پڑی۔ اُدھر سے بھینسا اسی کھیت میں آ چکا تھا اور اس کا رخ لڑکی کی طرف تھا۔

''وہ دیکھو کالا ناگ!''___ ہمارے کسی ساتھی نے کہا۔

ہم سب نے کالے ناگ کو دیکھا۔ اسے شاید پتہ چل گیا تھا کہ کوئی انسان یا حیوان اس کی سلطنت میں آ گیا ہے۔ ہم بھینسے پر کُتے چھوڑنے ہی لگے تھے اور خود بھی اس پر حملہ آور ہونے کے لئے تیار ہو گئے تھے لیکن ناگ کو دیکھ کر ہمارا یہ ارادہ کمزور پڑ گیا کیونکہ ڈر یہ پیدا ہو گیا تھا کہ ناگ ہم میں سے کسی کو یا کسی کُتے کو ڈس لے گا لیکن وہ لڑکی بے چاری جس مصیبت میں پھنس گئی تھی وہ بھی ہم سے دیکھی نہیں جاتی تھی۔

ہم دوستوں نے بڑی تیزی سے صلاح مشورہ کیا لیکن وہاں سوچنے کا وقت ہی نہ تھا۔ لڑکی اونچے کھیت کی دیوار کے ساتھ پیٹھ لگائے کھڑی تھی۔ ایک طرف ناگ اس کی طرف بڑھا آ رہا تھا اور دوسری طرف سے بدمست بھینسا پھنکارتا آ رہا تھا۔ یہ تو چند سیکنڈ کی بات تھی۔ ہم کچھ بھی نہیں کر سکتے تھے۔ لڑکی کو سانپ نے ڈسنا تھا اور بھینسے نے اس کے جسم کو کچل اور مسل ڈالنا تھا۔

ہم نے ایک معجزہ دیکھا۔ بھینسا اگر نارمل حالت میں ہوتا تو اتنے بڑے سانپ کو دیکھ کر بھاگ جاتا لیکن اس کی ذہنی حالت باؤلے کُتے یا پاگل انسان جیسی تھی۔ اسے تو جیسے احساس ہی نہیں تھا کہ اس کا جانی دشمن اس کے سامنے موجود ہے۔ شاید دونوں کی نظریں لڑکی پر تھیں۔

لڑکی نے اپنے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف بلند کئے اور چیخ جیسی آواز میں کہا___ ''یا اللہ''___ آج بھی اس لڑکی کا چہرہ میری آنکھوں کے سامنے ہے۔ اس نے موت یا اللہ کی مدد کے انتظار میں آنکھیں بند کر لی تھیں۔

بھینسا لڑکی کے قریب پہنچا تو ناگ جو لڑکی کی طرف بڑھا آ رہا تھا بھینسے کی طرف مڑ گیا۔ لڑکی اور بھینسے میں دو چار قدموں کا فاصلہ رہ گیا تھا۔ مجھے وہ منظر بھی اچھی طرح یاد ہے کہ ناگ نے سر اٹھا کر بھینسے کی ٹانگ میں دانت گاڑے اور الٹا ہو گیا۔ سانپ جب اپنا پورا زہر اپنے شکار کے جسم میں داخل کرتا ہے تو وہ اسی طرح الٹا ہو جاتا ہے۔

بھینسا فوراً رکا اور ایک دو قدم پیچھے ہو کر ایک ہی جگہ کودنے لگا۔ ناگ ابھی وہیں تھا۔ بھینسا درد کی شدت سے اور زیادہ اچھلنے لگا تو اس کا ایک پاؤں ناگ پر آ گیا۔ بھینسے کے وزن کو تصور میں لائیں۔ ناگ پر جہاں اس کا پاؤں پڑا تھا وہاں سے ناگ پچک گیا اور کچھ زمین میں دھنس گیا۔ جب تک سانپ کے سر کو نہ کچلا جائے یہ مرتا نہیں۔ ناگ نے سر اٹھایا لیکن اس کا پھن پوری طرح پھیل نہیں رہا تھا۔

اچھلتے کودتے بھینسے کے اب دونوں پاؤں ناگ پر اس طرح پڑے کہ ایک پاؤں سر اور دوسرا اس جگہ کے قریب پڑا جہاں سے ناگ پہلے ہی پچک گیا تھا۔ بھینسا لڑکی کو تو بھول گیا۔ اب میرے دوست شاہباز خان نے کہا کہ بھینسے پر کُتے چھوڑ دیتے ہیں لیکن اس کی ضرورت نہ پڑی کیونکہ بھینسا اور زیادہ پیچھے ہٹ گیا۔ پھر اس نے اس کھڈ کی طرف منہ کر لیا جو اس کھیت کے ساتھ ہی تھا۔ بھینسا اچھلنے کودنے کے انداز سے دوڑا اور اس کھڈ میں جا گرا۔ کھڈ کے کنارے ڈھلانی تھے۔ بھینسا اس کھڈ سے نکل سکتا تھا اور اس نے نکلنے کی کوشش بھی کی لیکن نصف ڈھلان چڑھ کر پھر کھڈ میں گر پڑا۔ اس کے منہ سے بڑی ڈراؤنی آوازیں نکل رہی تھیں۔

میں اور میرے سارے دوست کھڈ پر جا کھڑے ہوئے۔ بھینسا اٹھ کھڑا ہوا تھا لیکن ناگ کا زہر اس کے جسم میں تیزی سے پھیل رہا تھا۔ بھینسا اپنا سر زور زور سے دائیں بائیں

مارنے لگا اور پھر اس طرح گرا جیسے بیٹھ گیا ہو۔ ہم اسے دیکھتے رہے۔ ناگ کا اب تو خطرہ ہی نہیں رہا تھا لیکن لوگ اتنے ڈرے ہوئے تھے کہ ناگ والے کھیت میں اترنے سے بھی گھبرا رہے تھے۔ ہم بھینسے کو دیکھتے رہے۔ وہ اب اٹھنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ چند منٹ بعد اس کا منہ زمین سے لگا اور پھر وہ ایک پہلو پر لڑھک گیا۔ کچھ دیر اس کی سانس چلتی رہی پھر وہ بھی بند ہو گئی۔

لڑکی وہیں کھڑی رو رہی تھی۔ اس سے تین چار قدم دور ہندوؤں کا ناگ دیو' پیر صاحب کا جن اور سپیروں کا شیش ناگ بُری طرح کچلا پڑا تھا۔

ہم لڑکی کی طرف گئے۔ ہم سے پہلے ہی ایک ادھیڑ عمر آدمی اس تک پہنچا اور اسے اپنے بازوؤں میں لے کر سینے سے لگا لیا۔ یہ اس کا باپ تھا۔

یہ معجزہ نہیں تو اور کیا تھا۔ گاؤں کا مولوی بڑی اونچی آواز میں گاؤں والوں سے کہہ رہا تھا کہ یہ دیکھو ہندوؤں کا دیوتا کیسی بُری موت مرا ہے۔ اس نے وعظ کے انداز میں لوگوں کو بتانا شروع کر دیا کہ صرف اللہ وحدہ لاشریک ہے اور اسی کی ذاتِ باری عبادت کے لائق ہے' کوئی دیو اور کوئی دیوتا نہیں۔

وہاں بہت سے لوگ اکٹھے ہو گئے تھے اور ہر کوئی اپنی اپنی رائے دے رہا تھا۔ میں اس لڑکی کی بات سناتا ہوں جو دردناک بھی ہے اور دلچسپ تھی۔ وہ معزز انسان جس نے ہمیں صحیح باتیں بتائی تھیں اور اب ہمارا میزبان تھا' ہمیں اپنے گھر لے گیا۔ اس نے ہمارے کھانے کا اہتمام کر رکھا تھا۔ کھانے کے دوران اس نے اس لڑکی کے متعلق بتایا کہ پانچ چھ سال کی تھی تو اس کی ماں فوت ہو گئی۔ اس کا اور کوئی بہن بھائی نہیں تھا۔ باپ نے دوسری شادی کر لی۔

اس لڑکی کی سوتیلی ماں نے اس پر بہت ہی ظلم کئے۔ لڑکی کے لئے یہی ظلم کافی تھا کہ ماں باپ کی اکلوتی اولاد تھی اور ان کا سارا پیار صرف اس بچّی کے لئے تھا لیکن ماں سارا پیار سمیٹ کر قبر میں جا سوئی اور بچی سوتیلی ماں کے ہاتھ چڑھ گئی۔ بچی کے لئے ماں کا پیار ختم ہو گیا اور باپ بھی اس کے لئے بیگانہ ہو گیا۔ سوتیلی ماں کی جھوٹی شکایتوں پر باپ اسے ڈانٹتا بھی تھا اور کبھی پٹائی بھی کر دیا کرتا تھا۔ بچی دن رات آہیں بھرتی اور روتی تھی۔ اس پر بڑا ظلم ہوا جو سوتیلی مائیں سوتیلی اولاد پر کرتی ہیں۔ سوتیلی ماں کے بچے پیدا ہوئے تو یہ بچی گھر کی نوکرانی بن گئی۔

اس معزز آدمی نے جب یہ بات سنائی تو میرے دماغ میں ایک سوچ آ گئی۔ میں نے سب سے کہا کہ اس لڑکی کو ہم سوتیلی ماں اور جاہل باپ کے ظلم و تشدد سے بچا سکتے ہیں۔ میرے دوستوں نے پوچھا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ میں نے انہیں بتایا۔ اس معزز آدمی نے میری یہ تجویز پسند کی اور اس نے کہا کہ وہ لڑکی کے باپ کو یہیں بلا لیتا ہے۔ اس نے اپنے ایک بیٹے کو اسی وقت بھیج دیا اور کچھ ہی دیر بعد لڑکی کا باپ آ گیا۔

''میری بات غور سے سن چاچا!'' ___ میں نے کہا ___ ''تم نے اپنی آنکھوں دیکھا ہے کہ تمہاری بیٹی کس طرح بھینسے سے بھی بچ گئی ہے اور کالے ناگ سے بھی۔ معلوم نہیں تم نے دیکھا تھا یا نہیں کہ لڑکی نے ہاتھ آسمان کی طرف کر کے اللہ کو پکارا تھا۔''

''ہاں جی!'' ___ باپ نے کہا ___ ''دیکھا تھا۔ میں نے تو سمجھ لیا تھا کہ میری بیٹی ماری گئی لیکن اللہ نے اس کی فریاد سن لی۔''

''اللہ نے تو سن لی'' ___ معزز آدمی بولا ___ ''تم اور تمہاری بیوی کچھ بھی نہیں سن رہے اور لڑکی پر ظلم کئے جا رہے ہو'' ___ اس معزز آدمی نے میری طرف اشارہ کر کے کہا ___ ''یہ بڑی پہنچ والے شاہ جی ہیں۔ انہوں نے تمہاری بیٹی میں کچھ دیکھا ہے۔ وہ ان سے سن لو۔''

''چاچا'' ___ میں نے کہا ___ ''میں نے وہیں دیکھ لیا تھا کہ اس لڑکی پر پہلے ہی بہت ظلم ہو رہا ہے اور جب اس نے اللہ کو پکارا تو مجھے پتہ چلا کہ لڑکی کے اندر کوئی ایسی طاقت ہے کہ یہ جسے چاہے اس کو تباہ کر سکتی ہے۔ یہ بھاگوان روح ہے' اس کی عزت کرو اور اس کے ساتھ پیار کرو ورنہ بہت نقصان اٹھاؤ گے۔ ہو سکتا ہے تمہیں اور تمہاری بیوی کو کوڑھ ہو جائے۔ سچے دل سے توبہ کرو اور اس نیک روح کی قدر کرو۔''

اس سیدھے سادے دیہاتی نے فوراً کانوں کو ہاتھ لگائے اور توبہ کی۔ ہم نے اور ہمارے میزبان نے اسے کچھ اور باتیں سمجھا کر رخصت کر دیا۔ پھر ہم بھی اپنے گاؤں آ گئے اور ہمارا میزبان ہمارا دوست بن گیا۔ وہ کبھی کبھار ہمارے ہاں آ جاتا تھا اور سناتا تھا کہ لڑکی کی تو کایا ہی پلٹ گئی ہے اور وہ بہت خوش رہنے لگی ہے۔ سوتیلی ماں اور سگا باپ اسے ''پہنچ والی بی بی'' سمجھتے اور اس کے آگے بچھے جاتے ہیں۔

+ + +

بھیڑیئے، بچہ اور بے اولاد

آج کے ماحول میں جب یاد کرتا ہوں تو کچھ ایسا شک ہونے لگتا ہے جیسے یہ سب کچھ حقیقی نہیں تھا لیکن میں حقیقت کو جھٹلا نہیں سکتا۔

بھیڑیئے، بچہ اور بے اولاد

لڑکپن اور جوانی کا زمانہ ہنستے کھیلتے گزرا ہے۔ ہنسنے کھیلنے کے عادی لوگ عموماً غیر ذمہ دار اور غیر سنجیدہ ہوتے ہیں اور وہ حقائق اور اپنے فرائض سے فرار کے عادی بھی ہوتے ہیں۔ اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ مجھ میں ایسی خرابی پیدا نہیں ہوئی۔ میں غیر سنجیدگی کی حد تک ہنسنے کھیلنے کا عادی رہا لیکن یہ خیال رکھا کہ شرافت کے دائرے سے باہر نہ نکل جاؤں اور اللہ کے راستے سے بھٹک نہ جاؤں۔ بڑھاپا آیا تو بھی ہنستا کھیلنا جاری رہا۔ اس کا مجھے یہ فائدہ ہوا کہ آج اس ضعیف العمری میں بھی اپنے دوہتے پوتے ہی نہیں بلکہ اڑوس پڑوس کے بچے بھی میرے پاس آتے اور میرے ساتھ کھیلتے ہیں اور پھر کہانیوں کا مطالبہ کرتے ہیں۔ اس طرح میں ذہنی طور پر صحت مند اور ٹھیک ٹھاک رہتا ہوں۔

میں نے ہنسنے کھیلنے کی بات اس لئے کی ہے کہ اب بلکہ کچھ عرصہ پہلے سے مجھ پر کبھی کبھی ایسی سنجیدگی طاری ہو جاتی ہے کہ خیالوں میں کھو جاتا ہوں اور شاید دنیا سے لاتعلق ہو جاتا ہوں۔ مجبوری یہ ہے کہ میں ایسا عالم فاضل اور فلسفی نہیں کہ سوال جو ذہن میں اٹھتے اور پریشان کرتے ہیں ان کے جواب علمی پہلو سے نکال سکوں۔

گھبرائیں نہیں، ایسا نہ سوچیں کہ میں خشک قسم کا مضمون پیش کر رہا ہوں اور مجھ پر وعظ کا موڈ طاری ہے۔ کہانی سناؤں گا، وہی کتوں اور انسانوں کی کہانی جو بڑے عرصے سے سناتا چلا آ رہا ہوں۔ میری اس تمہید کو برداشت کر لیں پھر کہانی بھی سنا دوں گا۔

بات جو میرے ذہن میں بڑے عرصے سے کھٹک رہی ہے وہ یہ ہے کہ اللہ کے بنائے ہوئے قوانین میں تبدیلی نہیں آیا کرتی نہ ان میں ترمیم ہوا کرتی ہے لیکن میں کچھ تبدیلیاں دیکھ رہا ہوں اور آپ بھی دیکھ رہے ہیں۔ اس وقت میرے سامنے جرم و سزا کا یا سزا و جزا کا یا ثواب و عذاب کا مسئلہ ہے۔ ہر گناہ کی سزا ملتی ہے۔ اکثر لوگ یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ گناہوں کی سزا اگلے جہان ملے گی لیکن میرا مشاہدہ یہ ہے کہ ہر غلط کام کا ردِعمل اسی دنیا میں سامنے آ جاتا ہے۔ میں نے دو تین عالموں سے بھی یہی سنا ہے کہ بدی کی سزا اور نیکی کی جزا

اسی دنیا میں مل جاتی ہے اور اگلے جہاں کا حساب کتاب الگ ہے لیکن اب اللہ نے اپنے اس قانون میں معلوم نہیں کیوں تبدیلی کر دی ہے۔ یہ میں پاکستان میں دیکھ رہا ہوں۔

شریف گھرانوں کی لڑکیوں کو اغوا اور جبری بے آبرو کیا جا رہا ہے۔ چھ سات سال عمر کی بچیوں کے ساتھ جبری زیادتی کر کے انہیں قتل کیا جا رہا ہے۔ نوزائیدہ بچے جو حرام کاری کی پیداوار ہوتے ہیں کوڑے کے ڈھیروں پر پھینکے جا رہے ہیں۔ دن دیہاڑے لوگوں کے گھر لٹ رہے ہیں اور حلال کی کمائیاں ڈاکوؤں کے پاس جا رہی ہیں۔ ماں باپ پیٹ باندھ کر اپنی بیٹیوں کے جہیز بناتے ہیں اور ایک روز ڈاکو آ کر سب کچھ لوٹ لے جاتے ہیں۔ لٹنے والے تھانے جاتے ہیں تو ان کی عزت بھی لوٹ لی جاتی ہے اور وہ تھانوں سے بھاگ آتے ہیں۔ بیوہ عورتوں کی جائیدادوں پر ناجائز قبضہ کر لیا جاتا ہے اور کوئی شنوائی نہیں ہوتی اور نہ پکڑ دھکڑ ہوتی ہے۔ ہو بھی کیسے، قبضہ گروپ کے بعض لوگ اسمبلیوں میں قوم کے نمائندے بنے بیٹھے ہیں۔

معاشرے میں عزت اور رُتبہ اسے ہی حاصل ہے جس کے پاس حرام کی دولت ہے اور اس دولت سے وہ تھانیداروں اور دیگر اعلیٰ افسروں اور وزیروں وغیرہ کے منہ بند کر سکتا ہے۔ آج کل حلال کمانے والے شریف لوگ بد دیانت اور بے ایمان لگتے ہیں۔ دین اسلام کو سیاسی برانڈ کے علماء نے کرپٹ کر ڈالا ہے۔ فرقہ بندی اور فرقوں کے مابین عداوت پیدا کرنے سے بڑھ کر اور کرپشن کیا ہو سکتی ہے اور اس سے بڑا گناہ اور کوئی بھی نہیں ہو سکتا۔ جہاں عورت رشوت کے طور پر چلائی جاتی ہو وہاں اور کسر رہ ہی کیا جاتی ہے۔

مدیر ''حکایت'' نے اپنے ایک مضمون میں لکھا تھا کہ اللہ نے قوم نوح، قوم لوط اور دوسری جن قوموں کو تباہ و برباد کر دیا تھا ان میں سے ہر ایک قوم میں صرف ایک ایک بدی تھی لیکن ہم پاکستانی وہ قوم ہیں جس میں ان تمام قوموں کی بدیاں اور خرابیاں موجود ہیں لیکن اللہ نے معلوم نہیں کیوں تباہ نہیں کیا۔

مدیر ''حکایت'' نے اپنے اس مضمون میں قرآن کے حوالے سے یہ جواز پیش کیا ہے کہ سورۃ البقرہ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ تم اگر بدی کے راستے سے نہیں ہٹو گے تو میں تم پر شیطان مسلط کر دوں گا۔ معلوم یہی ہوتا ہے کہ اللہ نے ہمارے ملک سے نظریں ہٹا لی ہیں اور ہمیں شیطان کے حوالے کر دیا ہے۔ میں ان اچھے وقتوں کے جب لوگوں کے دلوں میں خوف خدا تھا، ایسے بہت سے واقعات سنا سکتا ہوں جن میں اللہ نے گناہگاروں کو اسی دنیا

میں پکڑ لیا اور عذاب میں مبتلا کر دیا۔ اب جو کہانی سنانے لگا ہوں وہ ایسی ہی کہانیوں میں سے ایک سچا واقعہ ہے جو مجھے یاد آ گیا ہے۔

میرے ذہن میں یادوں کا ایک سمندر سمٹا ہوا ہے۔ یہ واقعہ اس طرح یاد آ گیا کہ کچھ دن پہلے اخبار میں خبر پڑھی کہ ایک نوزائیدہ بچے کی لاش کوڑے کے ایک ڈھیر پر پڑی ملی جس کی ایک ٹانگ کتوں یا بلیوں وغیرہ نے رات کو کھا لی تھی۔ صبح لاش اس طرح برآمد ہوئی کہ دو کتے اس پر لڑ رہے تھے۔ ایسی خبریں میں نے پہلے بھی پڑھی ہیں اور ہر بار میں نے اپنی ذات میں شدید زلزلے جیسی ہلچل محسوس کی ہے لیکن اب جو خبر پڑھی تو ذہن کے سمندر میں سے ایک واقعہ نکل آیا۔

یہ واقعہ سنانے سے پہلے ایک بات کہوں گا۔ یہ میری زندگی کا ایک سچا واقعہ ہے لیکن آج کے دور اور آج کے معاشرتی حالات میں اسے یاد کرتا ہوں تو یوں لگتا ہے جیسے کوئی فلم دیکھی تھی اور یہ ایک فلمی کہانی تھی یا شاید افسانہ پڑھا تھا لیکن یہ افسانہ نہیں اور فلمی کہانی بھی نہیں۔ میں نے اپنی کسی کہانی میں لکھا تھا کہ ایسے واقعات انہی لوگوں کے سامنے آتے ہیں جو زندگی کے ہنگاموں میں کود پڑتے ہیں۔ گھر بیٹھے تو اخباروں میں خبریں ملتی ہیں یا کوئی سنی سنائی بات کانوں میں پڑ جاتی ہے اور اس بات میں زیب داستان کا مواد زیادہ ہوتا ہے۔ میری جوانی جس طرح گزری ہے اس کا اندازہ آپ نے میری کہانیوں سے کر لیا ہوگا۔ اس انداز سے زندگی گزارنے والوں کو ایسے ایسے گوشے اور کونے کھدرے نظر آ جاتے ہیں جو عام لوگوں کو نظر نہیں آتے۔

اب میں فلسفے اور جواز کو الگ رکھتا ہوں اور اصل بات پر آتا ہوں...... میری نوجوانی کا زمانہ تھا۔ ہم کتوں کو ساتھ لے کر اسی طرح شکار کو نکلے جس طرح آپ نے میری پہلی کہانیوں میں پڑھا ہے۔ اکتوبر کا مہینہ تھا جب گرمی نکل گئی تھی اور سردی ابھی پوری طرح نہیں آئی تھی۔ اس روز ہمارا ارادہ کچھ دور نکل جانے کا تھا اس لئے ہم اس وقت گاؤں سے چلے تھے جس وقت صبح ابھی گہری دھندلی تھی۔ گاؤں سے تقریباً ساڑھے چار میل دور پہنچ گئے تو صبح کا اجالا سفید ہو گیا۔

ہم عام راستوں سے ہٹ کر ایسے علاقے میں جا رہے تھے جو کٹا پھٹا تھا اور اونچا نیچا تھا۔ چھوٹے بڑے کھڈ بھی تھے اور چھوٹے بڑے ٹیلے بھی ہر طرف کھڑے تھے۔ کوئی ایک سو گز دور بھیڑیے یا بھیڑیوں جیسے دو کتے نیچے سے اوپر آئے اور رک کر پھر نیچے دیکھنے

لگے۔ ان کے اس طرح نمودار ہونے سے ہم نے اندازہ لگایا کہ جہاں یہ رُکے کھڑے ہیں یہ کسی نشیبی جگہ کا اونچا کنارہ ہے۔

کچھ ساتھیوں نے کہا کہ یہ کُتے ہیں اور باقی کہتے تھے کہ بھیڑیے ہیں۔ بھیڑیا صاف پہچانا جاتا ہے لیکن فاصلہ زیادہ تھا اس لئے یہ شک بھی تھا کہ کُتے ہوں گے۔ وہ کُتے تھے یا بھیڑیے، وہ نیچے دیکھ رہے تھے۔ ہم نے کُتوں کو زنجیریں ڈال رکھی تھیں اور ابھی کُتوں نے اس طرف نہیں دیکھا تھا۔ وہ علاقہ ہموار ہوتا تو کُتے دیکھ لیتے لیکن وہاں یہ حالت تھی کہ کبھی ہم نیچے جاتے اور کبھی گھاٹی چڑھ کر اوپر چلے جاتے اور آگے کا کچھ علاقہ نظر آجاتا تھا۔

ان دونوں جانوروں نے ہماری طرف دیکھا ہی نہیں اور ہم تیزی سے آگے بڑھتے گئے۔ ہم سب خوش تھے کہ یہ بھیڑیے ہوئے تو شکار کا مزہ ہی آجائے گا۔ ہمارے ویران علاقے میں بھیڑیے موجود تھے لیکن کم ہی نظر آتے تھے۔ رات کو کبھی کسی بھیڑیے کی آواز سنائی دیتی تھی۔ شکار میں بھیڑیے اس طرح دلچسپی پیدا کر دیتے تھے کہ کُتوں کا مقابلہ کرتے تھے۔ گیدڑوں کی طرح بھاگ نہیں جاتے تھے۔ البتہ کُتے زیادہ ہوتے تو بھیڑیے اگر دو تین ہی ہوتے تو بھاگ جاتے تھے۔

بھیڑیے اس نشیب کے کنارے پر کھڑے نیچے ہی دیکھے جا رہے تھے کہ اتنے میں دونوں بدک کر پیچھے ہٹے اور پھر نیچے دیکھنے لگے۔ ہمارے ایک دوست نے کہا کہ نیچے سے بھیڑیوں کو کسی نے پتھر مارا ہے۔ بھیڑیوں کے بدکنے اور پیچھے ہٹنے سے یہی کہا جا سکتا تھا کہ انہیں کسی نے پتھر مارا ہے۔ اس سے ہمیں یہ نظر آنے لگا کہ نیچے کوئی آدمی ہوگا اور یہ بھوکے بھیڑیے اس پر حملہ کر کے پیٹ پوجا کرنا چاہتے ہوں گے۔

ہم سب ساتھیوں نے آپس میں بات کی اور اس نتیجے پر پہنچے کہ بھیڑیوں نے کسی بندے کو دیکھ لیا ہے اور اسے چھوڑیں گے نہیں۔ ہم اور تیز چل پڑے اور ایک نشیبی جگہ سے اوپر چڑھے تو دیکھا کہ ہم بھیڑیوں کے قریب پہنچ رہے ہیں۔ تب بھیڑیوں نے ہماری طرف دیکھا۔ ہم نے کُتوں کے پٹوں سے زنجیریں اتار لیں اور انہیں بھیڑیے دکھا کر چھوڑ دیا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس روز ہمارے ساتھ نو کُتے تھے۔

ہم چونکہ قریب پہنچ گئے تھے اس لئے یقین ہوگیا کہ یہ دونوں کُتے نہیں بھیڑیے ہی ہیں۔ دو بھیڑیے نو کُتوں اور بارہ تیرہ لڑکوں کے مقابلے میں ٹھہر نہیں سکتے تھے۔ وہ بھاگ اٹھے۔ کُتوں نے انہیں دیکھ لیا تھا اور سرپٹ ان کے پیچھے دوڑ پڑے تھے اور فاصلہ کوئی زیادہ

ہیں اور ہر کوئی ایک دوسرے کو جانتا ہے۔ ہم اسی بات پر حیران ہو رہے تھے کہ یہ لڑکی یا عورت بچے کی پیدائش تک اپنے آپ کو چھپاتی کس طرح رہی۔

ہم اس آدمی کے گاؤں پہنچے جو پرائمری سکول کا ٹیچر تھا۔ گاؤں والوں نے اس کے ہاتھوں پر اٹھایا ہوا بچہ دیکھا تو ہر کسی نے پوچھا یہ کس کا بچہ ہے۔ اُس شخص نے گاؤں کے نمبردار کو بلایا اور اسے بچہ دکھا کر بتایا کہ یہ کہاں سے ملا ہے۔

دیکھتے ہی دیکھتے سارا گاؤں اکٹھا ہوگیا۔ بچے کو تو لوگوں نے بعد میں دیکھا، وہ لوگ زیادہ تر اس وجہ سے اکٹھے ہوگئے تھے کہ ایک شکار پارٹی آئی تھی جس میں آٹھ نو کُتے تھے اور ہر کتا اعلیٰ نسل کا تھا۔

نمبردار کے علاوہ گاؤں کے تین چار بزرگ اور اونچی حیثیت والے دو تین آدمی بھی آگئے اور باہر چارپائیاں بچھا کر بیٹھ گئے۔ ہمیں تو گاؤں والوں نے بڑی عزت سے بٹھایا اور ہماری خاطر مدارات کا انتظام کرنے کو دو آدمیوں سے کہا۔

بچہ بھوک سے بلبلا رہا تھا اور اس طرح رو رہا تھا جیسے کسی بھی وقت اس کی سانسیں رک جائیں گی۔ ایک بزرگ نے کہا کہ بچے کو عورتوں کے حوالے کر دو تا کہ وہ اسے دودھ پلائیں۔ سکول ٹیچر نے اِدھر اُدھر دیکھا تو اسے اپنی بیوی نظر آگئی۔ اس نے بچہ اپنی بیوی کے حوالے کر کے کہا کہ اسے دودھ پلائے۔ دو تین اور عورتیں آگئیں اور وہ بچے کو لے گئیں۔

سکول ٹیچر نے سب کو سنایا کہ بچہ کہاں پڑا ملا ہے اور یہ چھری بچے کے پاس پڑی ہوئی تھی۔ سننے والوں نے اپنے کانوں کو ہاتھ لگائے اور بعض نے ہاتھ جوڑ کر آسمان کی طرف کئے اور توبہ توبہ کرنے لگے۔ سب کا یہی خیال تھا کہ یہ ناجائز بچہ ہے اور اسے اپنا گناہ چھپانے کے لئے وہاں ویرانے میں پھینکا گیا ہے۔ سکول ٹیچر نے یہ بھی بتایا کہ دو بھیڑیے بچے کو سونگھ رہے تھے اور انہیں کس طرح پتھر مار مار کر اُس نے بھگایا تھا اور پھر ہمارے کُتے آگئے اور بھیڑیے بھاگ گئے۔

اس نے لوگوں کو یہ بھی بتایا کہ وہ ہمیں اس گواہی کے لئے ساتھ لایا ہے کہ واقعی بچہ لاں جگہ پڑا ملا ہے اور بھیڑیوں والی بات بھی بالکل ٹھیک ہے۔

ایک بزرگ نے کہا کہ بچے کو تھانے لے چلو اور تھانیدار خود تفتیش کر کے اس عورت کو لاش کرے گا جس نے بچہ پیدا کر کے وہاں جا پھینکا تھا۔ بزرگ نے کہا کہ یہ ایک طرح کا ل ہوگا۔ یہ سکول ٹیچر نہ پہنچ جاتا تو بھیڑیے بچے کو کھا جاتے۔ بھیڑیے نہ کھاتے تو بچہ بھوک

سے بلبلا بلبلا کر مر جاتا۔

"بچے کو تھانے نہ لے جاؤ" ___ سکول ٹیچر نے کہا ___ "تھانیدار کا کوئی بھروسہ نہیں۔ بچے کی ماں کی تلاش اور تفتیش سے بچنے کے لئے وہ بچے کو کہیں پھینک دے گا اور بچہ مر جائے گا"۔

"ماسٹر جی ٹھیک کہتے ہیں" ___ نمبردار نے کہا ___ "میں اس تھانیدار کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ آپ لوگ بھی اسے جانتے ہیں۔ بڑا ہی بے رحم اور ظالم آدمی ہے۔

ایک اور معزز آدمی بول پڑا۔ اس نے کہا کہ بچے کو کون سنبھالے گا، ہمارے گاؤں میں تو ایسی ذمہ داری کوئی بھی نہیں لے گا۔ اس نے یہ بھی کہا کہ ناجائز بچے کو کوئی شخص گود نہیں لے گا۔

"میں بچے کو گود لوں گا" ___ سکول ٹیچر نے کہا ___ "آپ سب جانتے ہیں میں بے اولاد ہوں اور مجھے اور میری بیوی کو ایک بچہ پالنے کا بہت شوق ہے۔ میں تو کہتا ہوں کہ اللہ نے یہ بچہ میرے لئے ہی بھیجا ہے۔ اسے کھانے کے لئے بھیڑیے آئے تو میں نے انہیں بھگا دیا لیکن بھیڑیے پھر بھی اوپر جا کر نیچے ہی دیکھتے رہے۔ وہاں سے انہیں بھگانے کے لئے خدا نے ان لڑکوں کو بھیج دیا اور ان کے کتوں نے بھیڑیوں کو بہت ہی دور بھگا دیا"۔

اس مسئلے پر گاؤں کے بڑے صلاح مشورہ کرنے لگے۔ گاؤں کی مسجد کا مولوی بھی آ گیا تھا۔ مولوی نے یہ کہہ کر اس مسئلے کا حل پیش کر دیا کہ اصل گناہگار بچے کی ماں اور اس کا باپ ہیں۔ بچے کا کوئی گناہ نہیں نہ اسے ہوش ہے کہ یہ بھی اس کو محسوس ہو کہ یہ ہے کہاں اور اسے کہاں پھینکا گیا تھا۔

مولوی نے کہا کہ اس بچے کو مرنے سے بچانا اور پھر اسے پالنا اور اسے باعزت زندگی دینا بہت بڑی نیکی ہے اور ثواب کا بہت بڑا کام ہے۔

آخر سب اس بات پر متفق ہو گئے کہ بچہ سکول ٹیچر اپنے گھر رکھ لے۔ سکول ٹیچر بہت خوش ہوا جیسے یہ بچہ اللہ نے اسی کے لئے بھیجا ہو...... کچھ دیر بعد ہم بھی وہاں سے رخصت ہو آئے۔ راستے میں ہم اسی موضوع پر باتیں کرتے آئے۔ یہ تو ایک معمہ تھا ہی کہ یہ بچہ کس نے پھینکا ہے لیکن اس سے زیادہ ٹیڑھا سوال یہ ذہن میں آ رہا تھا کہ بچے کے پاس چھری کیوں رکھی گئی تھی۔ کوئی جواب نہیں ملتا تھا۔ گاؤں میں جب بڑے اس موضوع پر اپنی رائے دے رہے تھے تو انہوں نے بھی یہ معمہ حل کرنے کی بہت کوشش کی تھی کہ چھری بچے کے پاس

کیوں رکھی گئی تھی۔ کوئی بھی کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکا۔

اپنے گاؤں آ کر ہم نے یہ خبر سارے گاؤں میں پھیلا دی اور لوگ ہمارے اردگرد اکٹھے ہو گئے۔ یہ واقعہ ان کے لئے عجیب اور ناقابلِ یقین تھا۔ کئی ایک نے کہا کہ یہ قیامت کی نشانی ہے۔ لوگوں نے اپنے اپنے ذہن اور سوچ سمجھ کے مطابق کہانیاں گھڑ لیں۔

پھر دن گزرنے لگے اور آہستہ آہستہ یہ بچہ ہم سب کے ذہنوں سے اتر گیا، البتہ یہ خواہش ضرور رہی کہ اس گاؤں کی طرف شکار کو جائیں گے اور دیکھیں گے کہ بچہ کس حال میں ہے اور کیا پتہ چلا ہے کہ بچے کی ماں کا سراغ ملا ہے یا نہیں لیکن وہ گاؤں ہمارے گاؤں سے تقریباً آٹھ میل دور تھا اور ایسی جگہ تھا جو ہمارے شکار کے لئے بالکل ہی موزوں نہیں تھی۔ پھر بھی دو اڑھائی سال بعد ہم وہاں چلے ہی گئے۔ ماسٹر سے ملے اور اس نے ہمیں وہ بچہ دکھایا۔ بچہ اب چلتا پھرتا تھا اور توتلی زبان میں کوئی کوئی لفظ بولتا تھا۔ ٹیچر اور اس کی بیوی کو دیکھا کہ وہ بچے سے بہت ہی پیار کرتے تھے۔ بچے کی ماں کا سراغ نہیں ملا تھا نہ کسی نے سراغ لگانے کی کوشش کی تھی۔

بارہ تیرہ سال گزر گئے اور ہم اس طویل عرصے میں بچے کو بالکل ہی بھول چکے تھے۔

ایک روز میرے والد اور ان کی عمر کے ہی تین چار اور آدمی جو اپنے گاؤں کے بزرگ تھے باہر درخت کے نیچے چارپائیاں بچھائے بیٹھے تھے۔ مجھے میرے والد نے گھر سے بلایا۔ میں گیا تو ان کے پاس بارہ تیرہ سال عمر کا ایک لڑکا بیٹھا ہوا تھا۔ میرے والد نے مجھے کہا کہ اپنے شکاری دوستوں کو بلا لاؤ۔

ہمارے بزرگوں نے ہمیں بتایا کہ یہ لڑکا اس گاؤں سے آیا ہے جس گاؤں کا ایک آدمی بارہ تیرہ سال پہلے ایک نوزائیدہ بچے کو لے گیا تھا اور تم بھی وہاں گئے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ یہ لڑکا کچھ ایسی بات سناتا ہے جیسے وہ نوزائیدہ بچہ یہی تھا۔ اس کی پوری بات سنو اور دیکھو کہ یہ وہی تو نہیں!

اس لڑکے کی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ روتا رہا ہے۔ ہمارے بزرگوں نے اس کے لئے کھانا اور پانی وہیں منگوا لیا تھا۔ لڑکے نے ہمیں پوری بات سنائی جو یوں تھی کہ وہ گاؤں سے بھاگ آیا تھا اور پیدل چلتے چلتے ہمارے گاؤں تک پہنچا تو اتنا تھک گیا تھا کہ یہیں رک گیا اور اس نے روتے ہوئے ہمارے بزرگوں سے کہا اسے یہیں رکھ لیں اور وہ ان کی نوکری کرے گا اور اس کے عوض اسے دو وقت کی روٹی دے دیا کریں۔ اس نے روتے ہوئے

بتایا کہ وہ شکایت کا موقعہ نہیں دے گا اور جو بھی اسے گھر رکھے گا اس کی وہ بہت ہی خدمت کرے گا۔

اس نے اس گاؤں سے بھاگنے کی وجہ یہ بتائی کہ ہوش سنبھالتے ہی گاؤں کے بچوں نے اسے کہنا شروع کر دیا کہ وہ حرام کاری کی پیداوار ہے اور اسے ایک کھڈ سے اٹھایا گیا تھا۔ لڑکوں نے اس کا مذاق بنا لیا کہ اسے نہ اپنی ماں کا پتہ ہے نہ باپ کا اور پھر لڑکوں نے اسے یہ بھی کہنا شروع کر دیا کہ اس کی ماں نے کسی کے ساتھ ناجائز تعلقات رکھے ہوئے تھے اور اس کے نتیجے میں پیدا ہُوا ہے۔

پھر لڑکے نے صاف الفاظ میں بتایا کہ گاؤں میں اس کا نام حرامی رکھ دیا گیا تھا۔ اس نے سکول ٹیچر اور اس کی بیوی کو ہی اپنے ماں باپ سمجھا تھا لیکن اسے پتہ چلا کہ یہ اس کے ماں باپ نہیں تو اسے بہت ہی دکھ ہُوا۔ لڑکوں نے اسے جب چھیڑنا شروع کیا تو اس نے سکول ٹیچر کو بتایا۔

سکول ٹیچر نے نمبردار کو اور گاؤں کے بڑوں کو یہ بات بتائی۔ ان سب نے اس لڑکے کو چھیڑنے والے لڑکوں کو بلایا اور بہت گالی گلوچ کی اور انہیں منع کیا لیکن لڑکے باز نہ آئے اور اسے اور زیادہ چھیڑنے لگے۔

دراصل یہ راز چھپایا جا سکتا ہی نہیں تھا۔ سارے گاؤں نے دیکھا تھا کہ سکول ٹیچر بچے کو اٹھا کر لا رہا تھا اور اس نے سارے گاؤں کو سنایا تھا کہ اسے یہ بچہ کہاں سے ملا تھا۔ سکول ٹیچر اور اس کی بیوی نے بچے کو کبھی بھی پتہ نہیں چلنے دیا تھا کہ وہ اس کے سگے ماں باپ نہیں لیکن گاؤں والوں نے اسے راز کو راز نہ رہنے دیا اور پھر یہ بات گاؤں کے بچوں کے کانوں تک پہنچ گئی۔

لڑکوں نے اسے یہاں تک کہا کہ انہیں یہ بھی معلوم ہے کہ اسے کہاں سے اٹھایا گیا تھا۔ ایک روز لڑکا دو میل دور اس جگہ چلا گیا جہاں سے اسے اٹھایا گیا تھا۔ وہ وہاں بھی روتا رہا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ وہ جگہ کیسی ہے، ذرا بیان کرے۔ لڑکے نے جو بھی نشانیاں بتائیں وہ بالکل صحیح تھیں۔ وہی چوڑا نشیب اور اس کے درمیان کچھ پانی اور پھر پھلاہی کے درخت وغیرہ۔

اس لڑکے نے چھ سات سال عمر سے لے کر بارہ تیرہ سال عمر تک گاؤں کے لڑکوں کے طعنے اور مذاق برداشت کئے اور آخر وہ ان کا عادی ہو گیا لیکن ایک اور حادثہ ہو گیا۔

سکول ٹیچر چند دن بیمار رہ کر فوت ہو گیا۔

اس کی بیوی اکیلی رہ گئی۔ سکول ٹیچر کا کوئی قریبی رشتہ دار یعنی کوئی بھائی یا چچازاد بھائی نہیں تھا۔ وہ اکیلا تھا۔ اس کی بیوی کے رشتہ دار موجود تھے لیکن ماں باپ اور بھائی نہیں بلکہ ماموں زاد یا شاید خالہ زاد تھے۔ اس بیوہ کو کسی کی محتاجی نہیں تھی۔ ان کی تھوڑی سی زمین بھی تھی جو بٹائی پر دے رکھی تھی۔ زمین اتنی تھی کہ دو تین بندوں کو سال بھر کا آٹا دانہ دے سکتی تھی۔ البتہ سکول ٹیچر کی جو تنخواہ تھی وہ ختم ہو گئی۔

دو اڑھائی مہینے ہی گزرے تھے کہ سکول ٹیچر کی بیوی بھی فوت ہو گئی۔ لڑکا سیانی عمر کو پہنچ گیا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ ان دونوں کا کوئی رشتہ دار تھا یا نہیں اور اگر کوئی تھا تو وہ کتنی دور کا رشتہ دار تھا لیکن بیوی بھی مر گئی تو دو تین رشتہ دار جاگ اٹھے اور انہوں نے ان کے مکان پر قبضہ کر لیا اور پھر ان کی زمین بھی سنبھال لی اور اس لڑکے کو انہوں نے گھر کا نوکر بنا لیا۔

اس لڑکے کو سکول ٹیچر اور اس کی بیوی نے بڑے پیار سے پالا اور اپنا بچہ سمجھا تھا لیکن اس کی وہ حیثیت بالکل ہی ختم ہو گئی اور اب پیار کی بجائے اسے دھتکار اور پھٹکار ملنے لگی۔ سکول ٹیچر کی بیوی کے ایک خالہ زاد یا ماموں زاد نے ان کے گھر میں اپنے مویشی لا باندھے اور اپنا سامان لا کر رکھ لیا اور لڑکے پر اب حکم چلانے لگے۔

لڑکے نے زبانی کلامی پھٹکار اور گالی گلوچ برداشت کی لیکن جب اس کی مار پٹائی شروع ہو گئی تو وہ گھر سے نکل کھڑا ہوا۔ اس گھر میں تو وہ شہزادہ تھا۔ سکول ٹیچر یا اس کی بیوی اس کے ساتھ کبھی غصّے سے بولے بھی نہیں تھے لیکن اب اسے مار پڑنے لگی اور ننگی گالیاں ملنے لگیں۔ وہ بغیر سوچے گھر سے نکلا کہ جائے گا کہاں۔ ہمارے گاؤں تک پہنچا لیکن اس کی ٹانگیں جواب دے گئی تھیں۔ وہ ذرا ستانے کے لئے رکا اور جب دیکھا کہ گاؤں کے کچھ بزرگ باہر بیٹھے ہیں تو ان کے پاس آ گیا اور ان کے آگے رو رو کر اپنی کہانی سنائی۔

اس میں کوئی شک رہا ہی نہیں کہ یہ وہی بچہ ہے جو ویرانے میں پڑا ملا تھا اور اسے سکول ٹیچر نے پالا پوسا تھا۔ ہم نے اس کی تصدیق کر دی۔ ایسا تو ہو ہی نہیں سکتا تھا کہ ہمارے بزرگ اسے کہتے کہ لو بچے، یہ روٹی کھاؤ، پانی پیئو اور چلتے بنو...... صرف ہمارے بزرگ ہی نہیں بلکہ وہ زمانہ ہی ایسا تھا کہ مصیبت زدہ کو کوئی بھی تنہا نہیں چھوڑتا تھا اور کوشش ہوتی تھی کہ اسے مصیبت سے نجات دلائی جائے اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو اسے کم از کم پناہ تو دی جائے۔ اس لڑکے کو گاؤں کے بزرگوں میں سے ایک نے اپنے گھر رکھ لیا۔ اس کی حیثیت تو

نوکر والی ہی تھی لیکن اسے اب گالیاں نہیں ملتی تھیں نہ اُسے بُرا بھلا کہا جاتا تھا نہ اس گاؤں میں اسے کسی نے ناجائز بچہ کہنا تھا۔

ہم سب دوستوں نے آپس میں طے کرلیا کہ گاؤں میں کسی کو پتہ نہیں چلنے دیں گے کہ اس بچے کو ماں نے جن کر ویرانے میں پھینک دیا تھا اور وہاں ایک آدمی اسے اٹھا لے گیا اور پال پوس لیا تھا۔ بچہ ہمارے بزرگوں کو سب کچھ بتا ہی چکا تھا جس سے یہ خطرہ تھا کہ بات ڈھکی چھپی نہیں رہے گی۔ ہم دوستوں نے یہ بھی طے کرلیا کہ ایسی کوئی بات اٹھی تو ہم اس کی تردید کریں گے اور کہیں گے کہ وہ بچہ جو ہم نے باہر پڑا دیکھا تھا، دو تین مہینوں بعد مر گیا تھا۔ مطلب یہ کہ ہم نے اس لڑکے کی عزت کا تحفظ اپنے ذمے لے لیا۔

ایک تو ہم دیہاتی تھے اور دوسرے نوجوان تھے۔ ہمارے دماغوں میں ابھی اتنی پختگی نہیں آئی تھی کہ سمجھ سکتے کہ قدرت کا یہ کیا کھیل ہے کہ بچہ کس طرح بچا اور پھر کس طرح لڑکپن میں آکر بے گھر اور بے ٹھکانہ ہوگیا۔ میرے والد کہتے تھے کہ اس بچے کو اس کی ماں کے گناہ کی سزا مل رہی ہے۔ میں کسی نتیجے پر نہ اس وقت پہنچ سکا تھا نہ آج کچھ سمجھ آتی ہے کہ یہ سب کیا ہے۔ البتہ ایک خیال آتا اور میں اپنی محدود عقل میں اسی کو صحیح سمجھتا ہوں یہ ہے کہ قدرت بعض اوقات کوئی ایسا مظاہرہ کر دیتی ہے جس تک کسی عام انسان کی عقل نہیں پہنچ سکتی۔ میں نے کسی جگہ ایک بڑے سائنس دان کے یہ الفاظ پڑھے تھے کہ انسان نے چاند ستاروں کی دنیا کو کھوج ڈالا ہے اور اب کائنات کے مزید بھید کھولنے کی کوششوں میں لگا ہُوا ہے لیکن کبھی قدرت کوئی ایسا کرشمہ دکھا دیتی ہے کہ بڑے بڑے سائنس دان چکرا جاتے ہیں اور وہ اپنے آپ کو طفلِ مکتب سمجھنے لگتے ہیں...... اس لڑکے کی زندگی میں قدرت نے کچھ ایسے ہی کرشمے دکھائے تھے۔ ایک نہایت اہم واقعہ سناتا ہوں۔ لڑکے کو ہمارے گاؤں میں آئے ایک سال ہوگیا تھا۔ جس گھر میں وہ ملازم تھا اس گھر میں اس کے ساتھ بڑا اچھا سلوک ہوتا تھا۔ میں اور میرے دوست تو اس کے ساتھ پیار و محبت سے پیش آتے تھے۔ ہم نے دیکھا کہ لڑکا کم عقل یا بے وقوف نہیں تھا بلکہ عقل اور ہوش مندی کی باتیں کرتا تھا۔ اس کا ایک اہم واقعہ سناتا ہوں۔

آپ نے محسوس کیا ہوگیا کہ میں اس لڑکے کا نام نہیں لکھ رہا۔ یہ میں کسی مصلحت کے پیشِ نظر نہیں لکھ رہا۔ اسے لڑکا ہی کہوں گا...... واقعہ یہ ہُوا کہ ایک روز دوپہر کے وقت اس لڑکے کو ایک آدمی کندھے پر اٹھا کر گاؤں میں لایا۔ وہ گھر والوں کے ساتھ کھیتوں میں کوئی

کام کررہا تھا۔ ساتھ دو اور آدمی تھے۔ پتہ چلا کہ لڑکے کو سانپ نے پاؤں پر ڈس لیا ہے۔ ایک آدمی نے عقل مندی یہ کی تھی کہ لڑکے کے ٹخنے سے ذرا اوپر ایک رسّی کے تین چار بل دے کر اور کس کر رسّی باندھ دی تھی تاکہ زہر اوپر نہ چڑھے۔

ہمارے گاؤں میں ایک ہندو حکیم تھا۔ اس کے پاس لے گئے۔ اُس نے اُس جگہ ایک دوائی لگا تو دی لیکن اس نے ایک حکیم کا نام لے کر کہا کہ اسے فوراً اُس کے پاس پہنچاؤ، اس حکیم کے پاس کوئی زود اثر دوائی تھی۔

فوراً ایک گھوڑی لے آئے ایک آدمی اس پر سوار ہُوا اور لڑکے کو اس کے آگے بٹھا دیا گیا۔ وہ حکیم تقریباً دو میل دور ایک گاؤں میں رہتا تھا۔ میں اور میرے تین دوست بھی ساتھ چل پڑے۔ ہمیں اس لڑکے کے ساتھ جذباتی وابستگی پیدا ہوگئی تھی۔ وہ حکیم گھر مل گیا۔

اس حکیم نے پہلے تو ایک دوائی لڑکے کو پلائی پھر زخم سے وہ دوائی دھو ڈالی جو ہمارے گاؤں کے حکیم نے لگائی تھی۔ سانپ نے جہاں کاٹا تھا وہاں اس حکیم نے چاقو سے دو کٹ دیئے اور خون نکلنے لگا۔ خون خاصا نکل گیا تو حکیم نے اس پر کوئی سفوف ڈالا اور پھر کوئی دوائی ڈالی اور پٹی باندھ دی۔ اس نے کہا یہ سانپ اتنا زہریلا نہیں تھا کہ لڑکا فوراً مر جاتا، اگر ایک گھنٹہ اور اس کا علاج نہ ہوتا تو پھر لڑکے کا زندہ رہنا ناممکن تھا۔

دوائی جو لڑکے نے پی تھی اور جو دوائیاں زخم پر لگائی گئی تھیں، انہوں نے اپنا اثر دکھانا شروع کر دیا اور لڑکے کی حالت سنبھلنے لگی۔ حکیم کو کچھ پیسے دے کر ہم سب واپس ہوئے۔

اب ہم نے پوچھا کہ سانپ نے اسے کس طرح کاٹ لیا ہے۔ معلوم ہُوا کہ گاؤں کی ایک جوان عورت نے اپنے پانچ چھ ماہ عمر کے بچے کو ایک درخت کے نیچے کپڑا بچھا کر لٹا دیا تھا۔ یہ کوئی غلط یا عجیب حرکت نہیں تھی۔ دیہات میں اکثر عورتیں دودھ پیتے بچوں کو کھیتوں میں ساتھ اٹھا لے جاتیں اور دودھ پلا کر سلا دیتی ہیں اور وہیں کہیں کپڑا بچھا کر زمین پر لٹا دیتی ہیں۔

یہ لڑکا قریب ہی کہیں کام کررہا تھا۔ اس کی نظر ویسے ہی بچے کی طرف گئی تو دیکھا کہ ایک اڑھائی تین فٹ لمبا سانپ آہستہ آہستہ سوئے ہوئے بچے کی طرف جارہا تھا۔ مارچ کے مہینے کے آخری دن تھے۔ ہمارے علاقے میں ان دنوں بھی سردی ہُوا کرتی تھی۔ سانپ کا زہر شدید گرمی کے موسم میں جوبن پر ہوتا ہے۔ سردیوں میں سانپ کا زہر بہت ہی کمزور ہوتا ہے۔ اس لڑکے نے یہ تو دیکھا ہی نہیں شاید وہ جانتا بھی نہیں تھا کہ سانپ میں زہر کمزور ہے یا

کم ہے یا زیادہ ہے۔ اس کی نظر میں وہ ایک سانپ تھا جس کے ڈسنے سے آدمی مرجاتا ہے۔ لڑکے نے دیکھا کہ سانپ اور سوئے ہوئے بچے میں ایک دو قدموں کا فاصلہ رہ گیا تھا۔

لڑکا بندوق سے نکلی ہوئی گولی کی طرح دوڑا اور دو تین قدم دور سے جست لگائی اور اس کا ایک پاؤں سانپ کے جسم پڑا۔ سانپ کا سر کچلا جائے تو وہ مرجاتا ہے لیکن اس لڑکے کا پاؤں سانپ کے سر سے تقریباً ایک فٹ دور اس کے جسم پر پڑا۔ لڑکے نے یہ پاؤں اس طرح دبایا اور مسلا کہ سانپ نے منہ بڑی تیزی سے پیچھے کی طرف کر کے لڑکے کے دوسرے پاؤں میں دانت گاڑ دیئے اور اپنا زہر اس میں داخل کر دیا۔ لڑکے نے پرواہ نہ کی اور جو پاؤں اس نے سانپ کے جسم پر رکھا تھا وہی تیزی سے اٹھا کر سانپ کے سر پر رکھ دیا اور اتنی زور سے مسلا کہ سانپ کا سر کچلا اور مسلا گیا لیکن سانپ اپنا زہر لڑکے کے جسم میں داخل کر چکا تھا۔

دو آدمیوں نے دیکھ لیا تھا۔ انہوں نے شور مچایا اور دوڑتے پہنچے۔ کھیتوں میں کام کرتے دوسرے آدمی بھی آ گئے۔ تین چار عورتیں بھی تھیں جن میں اس بچے کی ماں بھی تھی۔ اس نے اپنے سوئے ہوئے بچے کو دیکھا اور ایک ہی قدم دور مرے ہوئے سانپ کو دیکھا اور جب اسے پتہ چلا کہ اس کے بچے کو اس لڑکے نے بچایا ہے اور خود ڈسا گیا ہے تو اس نے لڑکے کو اپنے بازوؤں میں لے کر گلے لگا لیا اور بے طرح اس کا منہ چومنے لگی۔

ایک آدمی نے آگے بڑھ کر لڑکے کو اس عورت کے بازوؤں سے کھینچا اور کہا کہ اسے فوراً حکیم کے پاس لے چلتے ہیں۔ ایک عقل والے آدمی نے لڑکے کے ٹخنے کے ذرا اوپر کس کر رسی باندھ دی اور لڑکے کو گاؤں لے آئے۔ یہ اللہ کا خاص کرم تھا کہ لڑکا زندہ و سلامت بچ گیا۔ گاؤں کا تو وہ ہیرو بن گیا۔

ہم دوستوں نے آپس میں باتیں کیں تو ہمارے ایک دوست نے کہا کہ اسے ایک آدمی نے موت کے منہ سے اٹھا کر زندگی دی تھی اور اب اس لڑکے نے اس بچے کو زندگی دی ہے......لڑکا تین چار دنوں بعد بالکل ٹھیک ہو گیا۔ زہر خون میں شامل نہیں ہُوا تھا اور زخم بھی مل گیا تھا۔

اب قدرت کا ایک اور مظاہرہ یا کرشمہ دیکھیں جسے میں یوں بیان کروں گا کہ اللہ نے قرآن میں یہ جو فرمایا ہے کہ اللہ کی گرفت بڑی مضبوط ہوتی ہے، یہ واقعہ جو سنانے لگا ہوں اللہ کے اس فرمان کی عملی تفسیر ہے۔

ایک سال اور گزر چکا تھا۔ ایک روز ہمارے علاقے کا تھانیدار گھوڑی پر سوار ہمارے گاؤں کے قریب سے گزرتے رک گیا اس کے ساتھ ایک ہیڈ کانسٹیبل اور تین کانسٹیبل تھے۔ کسی گاؤں کے تین اور آدمی بھی اس کے ساتھ تھے۔ تھانیدار ہمارے گاؤں میں ذرا ستانے اور پانی پینے کے لئے رکا تھا۔

نمبر دار، ذیلدار اور چوکیدار وغیر تھانیدار کو آسمان سے اترا ہُوا فرشتہ سمجھا کرتے تھے۔ ان میں بھگدڑ مچ گئی۔ فوراً چارپائیاں ایک درخت کے نیچے بچھ گئیں۔ کرسیاں بھی آ گئیں اور تھانیدار کی خاطر و مدارات کے بندوبست ہونے لگے۔ تھانیدار نے کہا کہ کسی بھی چیز کی ضرورت نہیں، ان آدمیوں کو جو اس کے ساتھ تھے پانی پلا دیا جائے۔ تھانیدار خود تو گھوڑی پر سوار تھا اور باقی آدمی اس کے ساتھ پیدل جا رہے تھے۔

انہیں بٹھایا گیا اور ان سے پتہ چلا کہ تین میل دور ایک گاؤں کے ایک آدمی نے اپنی بیوی کو قتل کر دیا ہے اور یہ پولیس پارٹی وہاں جا رہی تھی۔ ان سے یہ پتہ نہ چل سکا کہ خاوند نے بیوی کو کیوں قتل کیا ہے۔ ان سب کو پانی پلایا گیا۔ یہ سب ہمارے گاؤں سے رخصت ہو گئے۔ ہمارا گاؤں راستے میں پڑتا تھا۔

یہ صبح کا وقت تھا۔ دوپہر کے وقت کچھ آدمی ایک چارپائی اٹھائے ہمارے گاؤں سے گزرتے رک گئے۔ چارپائی پر اس عورت کی لاش تھی جسے خاوند نے قتل کیا تھا۔ لاش پوسٹمارٹم کے لئے جا رہی تھی۔ ان آدمیوں نے چونکہ چارپائی کندھوں پر اٹھا رکھی تھی اور سفر لمبا تھا اس لئے پانی پینے اور ستانے کو رک گئے تھے۔

مجھے آج بھی لاش کا چہرہ یاد ہے۔ ہم نے لاش کے چہرے سے چادر ہٹائی تو چہرے کا جیسے قیمہ بنا ہُوا تھا۔ قاتل خاوند نے چہرے پر کلہاڑیاں مار مار کر ہڈیاں چور چور کر دی تھیں۔ ہم نے ان آدمیوں سے پوچھا کہ قتل کی وجہ کیا تھی۔ انہوں نے اتنا ہی بتایا کہ یہ عورت بدچلن تھی اور اس کا خاوند کچھ عرصے سے کسی ایسی بیماری میں مبتلا ہے کہ سر سے پاؤں تک موٹی موٹی پھنسیاں نکلی ہوئی ہیں اور جتنا بھی وہ علاج کراتا ہے یہ پھنسیاں اتنی ہی خراب ہوتی چلی جا رہی ہیں۔

ان آدمیوں کو کچھ زیادہ پتہ نہیں تھا کہ میاں بیوی میں قتل سے پہلے کیا بات ہوئی یا کیا تکرار ہوئی کہ خاوند نے اسے قتل کر دیا۔ یہ وجہ بالکل صاف اور صحیح تھی کہ یہ عورت خاوند کے ہاتھوں بدچلنی کی پاداش میں قتل ہوئی ہے۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ یہ عورت تو گاؤں میں طوائف بنی ہوئی تھی یعنی کوئی معمولی سی بدچلن نہیں تھی۔

اسے ہم قتل کا ایک عام کیس سمجھتے رہے۔ بدچلنی کی وجہ سے کسی عورت کا اور اس کے آشنا کا قتل ہو جانا کوئی عجیب واردات نہیں تھی۔ وہ دن گزر گیا اور رات بھی گزر گئی۔ اگلے روز دس گیارہ بجے کے درمیان جسے دیہات میں روٹی کا وقت کہا جاتا ہے، تھانیدار واردات والے گاؤں سے واپس آتے ہوئے پھر ہمارے گاؤں میں رک گیا۔ عورت کی لاش پوسٹمارٹم کے بعد گذشتہ رات واپس گاؤں لے جائی گئی تھی۔ تھانیدار کے ساتھ اپنے پولیس کے وہی آدمی تھے، اس گاؤں کا نمبردار تھا اور تین چار اور آدمی تھے اور ایک گدھی پر ایک آدمی سوار تھا جس نے سر پر اس طرح چادر لے رکھی تھی کہ اس کا چہرہ بھی اس میں ڈھکا ہُوا تھا۔ اسے ہتھکڑی لگی ہوئی تھی اور یہ ہتھکڑی ایک کانسٹیبل نے پکڑ رکھی تھی جو اس کے ساتھ پیدل چل رہا تھا۔ تھانیدار وہیں آ کر رک گیا جہاں بڑے درخت کے نیچے چار پائیاں پڑی تھیں۔ ہتھکڑی میں باندھے ہوئے آدمی کو گدھی پر ہی بیٹھے رہنے کو کہا۔

سارا گاؤں اکٹھا ہو گیا۔ تھانیدار نے ہمارے گاؤں کے نمبردار کو اپنے پاس بلا کر اس کے کان میں کچھ کہا۔ نمبردار نے تھانیدار سے کہا کہ وہ اس کے گھر چلے لیکن تھانیدار نے وہیں بیٹھنا پسند کیا۔ بعد میں ہمیں پتہ چلا تھا کہ تھانیدار نے نمبردار سے کہا تھا کے اس کے لئے اور اس کے ساتھ کے آدمیوں کے لئے کھانے کا بندوبست کرے۔ نمبردار یہ بندوبست کرنے کے لئے چلا گیا۔

تھانیدار اور اس کے ساتھ کے ہر آدمی کو پانی پلایا گیا لیکن تھانیدار نے گدھی پر بیٹھے ہوئے آدمی کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ اسے مٹی کے پیالے میں پانی دینا اور پھر وہ پیالہ توڑ دینا۔ یہ تو ہم پہلے سن چکے تھے کہ اس شخص کے سارے جسم پر پھنسیاں نکلی ہوئی ہیں۔

تھانیدار نے ایک ایسی بات کہی جو آج کل کوئی تھانیدار سوچ بھی نہیں سکتا۔ نہ ایسی بات کہنے کی ضرورت محسوس کرتا ہے۔ آج کل کے تھانیدار تو چاہتے ہیں کہ لوگ جرم کرتے رہیں، ایک دوسرے کا خون بہاتے رہیں اور یہ کیس تھانے میں آتے رہیں اور مُک مُکا ہوتا رہے اور تھانیداروں کے گھروں میں گھڑے نوٹوں سے بھرتے رہیں۔

یہ تھانیدار جو ہمارے گاؤں میں بیٹھا ہُوا تھا، ظالم اور جابر تھانیدار مشہور تھا۔ اس کا کام تھا مجرموں کو پکڑنا اور سزا دلوانا لیکن اس نے ذہن میں یہ رکھا کہ لوگوں کو جرائم کے ارتکاب سے ڈرایا جائے۔ اس نے اردگرد دیکھا، گاؤں کے لوگ ذرا پیچھے ہٹ کر تماشا دیکھ رہے تھے۔ تھانیدار نے سب سے کہا کہ اس کے قریب آ جائیں اور بیٹھ جائیں۔ لوگ آ گئے

آ گئے کچھ چار پائیوں پر بیٹھ گئے اور کچھ زمین پر ہی بیٹھے اور تھانیدار کی طرف دیکھنے لگے۔

''میری بات دھیان سے سننا تم سب لوگ!''۔۔۔ تھانیدار نے کہا۔۔۔ ''انگریز کے قانون سے ڈرو یا نہ ڈرو، اس قانون سے بعض اوقات مجرم اور قاتل بھی بری ہو کر گھر آ جاتے ہیں لیکن ایک قانون اور بھی ہے جس سے کوئی نہیں بچ سکتا۔ یہ اللہ کا قانون ہے۔ اس قانون کی پکڑ میں دیر ہو سکتی ہے لیکن پکڑ آخر ہوتی ہے اور اللہ کا یہ قانون دنیا میں ہی سزا دیتا ہے۔ میں تمہیں اس ملزم کی زبانی اس کا اقبالی بیان سنواؤں گا۔ یہ سنو اور توبہ کرو۔ یہ غلطی دلوں سے نکال دو کہ تم نے چوری چھپے جرم کیا ہے اور انگریز کا قانون تمہیں نہیں پکڑ سکا تو تم آزاد ہی پھرتے رہو گے۔ جلدی یا کچھ دیر سے تم اللہ کی پکڑ میں ضرور آؤ گے اور یہی دنیا تمہارے لئے جہنم بن جائے گی''۔

تھانیدار نے گدھی پر بیٹھے ہوئے ملزم سے کہا کہ وہ اپنا چہرہ ننگا کر کے بلند آواز میں لوگوں کو اپنا پورا بیان سنائے جو اس نے گاؤں میں تھانیدار کو دیا تھا۔ ہتھکڑی میں بندھا ہُوا ملزم تھوڑی دیر چپ رہا اور اس نے اپنا چہرہ بے نقاب نہ کیا۔ تھانیدار نے گرج کر اسے گالی دی اور کہا کہ جیسا اس نے اسے کہا ہے ویسا کرے۔ ملزم کے ساتھ کھڑے کانسٹیبل نے جس نے اس کی ہتھکڑی پکڑی ہوئی تھی، اس کے چہرے سے چادر ہٹا دی اور بڑے غصے سے اُسے کہا کہ خان صاحب کے حکم کی تعمیل کرو۔

ہم نے اس ملزم کا چہرہ دیکھا تو دل میں کراہت بھی آئی اور خوف بھی۔ میں اپنی بات بتاتا ہوں۔ میں نے محسوس کیا جیسے اس شخص کے جسم کی بدبو میرے ناک میں داخل ہو رہی ہے۔ دونوں گالوں پر موٹی موٹی پھنسیاں تھیں جو اوپر سے سفید تھیں۔ یہ سفیدی پیپ کی تھی۔ ایک پھنسی اس کے نیچے والے ہونٹ کے ساتھ تھی جس سے ہونٹ بے حد بھدّا اور مکروہ شکل اختیار کر گیا تھا۔ تھانیدار نے کہا کہ اس کے سارے جسم پر ایسی ہی پھنسیاں نکلی ہوئی ہیں۔ تھانیدار کے ایک بار پھر کہنے پر وہ بولا لیکن اس کی آواز دھیمی تھی۔ تھانیدار نے ایک ہی سانس میں تین چار گالیاں دے کر کہا کہ وہ بلند آواز سے بولے تا کہ ہر آدمی کے کانوں تک اس کی آواز پہنچے۔

اس کا جسم اتنا کمزور ہو چکا تھا کہ بلند آواز سے بولنے کے لئے خاصا زور لگانا پڑتا تھا۔ وہ بلند آواز میں بولتا گیا اور کبھی کبھی سانس لینے کے لیے کچھ دیر کے لئے چپ ہو جاتا تھا...... اس نے خاصی دیر لگا کر جو بیان دیا وہ میں اپنے الفاظ میں سناتا ہوں۔ قتل کے اس

ملزم کی عمر تیس سال ہوگئی تھی لیکن ابھی اللہ نے اسے کوئی بچی بچہ نہیں دیا تھا۔ شادی کو سات آٹھ سال گزر گئے تھے۔ آج اس ترقی یافتہ دور میں اکثر تعلیم یافتہ خاوند بھی اپنا ڈاکٹری معائنہ نہیں کرواتے کہ ہوسکتا ہے وہ اولاد پیدا کرنے کی صلاحیت سے محروم ہوں یا یہی پتہ چل جائے کہ نقص کیا ہے۔ اکثر بیویوں کے ٹسٹ کرائے جاتے ہیں لیکن کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو بیویوں کے ٹسٹ کو بھی ناجائز اور معیوب سمجھتے ہیں۔ وہ دور تو تھا ہی پسماندگی کا دور اور یہ لوگ دیہاتی تھے۔ انہوں نے میڈیکل ٹسٹ وغیرہ کی سوچی ہی نہیں۔

ازدواجی زندگی کے پانچ سال گزر گئے تو ملزم اور اس کی بیوی پیروں کے قدموں میں سجدے کرنے کے لئے چل پڑے۔ پھر جس کسی نے کوئی خانقاہ یا کوئی مزار بتایا وہاں جا پہنچے، نذر نیاز دی اور اولاد کے لئے دعائیں کرتے رہے۔ کسی نے کوئی شاہ جی بتایا یا کسی عامل کا پتہ دیا تو وہ خواہ کتنی ہی دور کیوں نہ ہُوا یہ دونوں جا پہنچے اور اپنی مراد پیش کی لیکن ہر جگہ سے انہیں مایوسی ہوئی۔ ان پیروں اور عاملوں نے اور مزاروں اور خانقاہوں کے مجاوروں نے انہیں پورا یقین دلایا کہ ان کی گود ہری ضرور ہوگی۔ ایسی ہی باتیں پیروں اور عاملوں وغیرہ نے بھی انہیں سنائیں کہ ان کے آستانے سے کبھی کوئی خالی نہیں گیا، دیر ہوسکتی ہے لیکن مراد ضرور پوری ہوگی۔ اس طرح یہ ملزم ان مجاوروں اور پیروں وغیرہ کے ہاتھ لٹتا رہا اور اس کی عمر تیس سال کے قریب پہنچ گئی۔

آخر اسے کسی نے ایک ایسے عامل کا اتا پتہ دیا جس کے متعلق مشہور تھا کہ اس کے ہاتھ میں ایسا علم ہے جو مردے کو زندہ کرسکتا ہے۔ وہ گاؤں خاصا دور تھا۔ ملزم اپنی بیوی کو ساتھ لے کر وہاں جا پہنچا۔ اس عامل نے بھی ان کے ساتھ ویسی ہی سبز باغوں جیسی باتیں کیں جیسی پہلے یہ دوسرے عاملوں وغیرہ سے سن چکے تھے۔ اس عامل نے یہ عمل بتایا کہ ایک بچہ چاہئے جس کی عمر زیادہ سے زیادہ تین دن ہو۔ اگر عمر چھ سات دن ہوگئی تو پھر یہ بے کار ہوگا۔ عمل یہ تھا کہ ملزم کی بیوی یا ملزم خود نوزائیدہ بچہ اٹھائے اور ایک خاص جگہ لے جا کر اس بچے کی شہ رگ پر چھری پھیرے۔ خون کا چلو بھر کر بیوی پی جائے اور پھر یہی خون اپنے جسم پر لگائے۔ یہ خون خاوند کو بھی اپنے جسم پر لگانا تھا اور پھر نوزائیدہ بچے کے خون کا ایک گھونٹ پینا تھا۔ عامل نے انہیں یقین دلایا کہ آج تک یہ عمل ناکام نہیں ہُوا اور پندرہ دنوں بعد مراد پوری ہونے کے آثار صاف نظر آجائیں گے۔

میاں بیوی عمل کرنے کے لیے تیار ہوگئے۔ عالم نے جتنے پیسے مانگے وہ انہوں نے

دے دیئے اور یہ واپس اپنے گاؤں آگئے۔ ملزم کی بیوی نے یہ عمل بخوشی اس لئے قبول کرلیا تھا کہ اسے معلوم تھا کہ گاؤں میں ایک عورت کا بچہ پیدا ہونے والا ہے اور وہ اس بچے کو اڑا لے گی۔ واپس اپنے گاؤں آتے ہوئے بیوی نے اپنے اس خاوند کو یہ بات بتائی تو خاوند بھی تیار ہوگیا اور اس نے بیوی کی حوصلہ افزائی کی کہ وہ اس بچے کو پیدا ہوتے ہی اٹھا لے۔

ہماری موجودہ دور میں پیدا ہونے والی اور جوان ہونے والی نسل شاید یقین نہ کرے کہ اس میاں بیوی نے اتنا خوفناک عمل کرنا قبول کرلیا تھا۔ دیہات میں بے اولاد جوڑے اس سے بھی زیادہ خطرناک عمل کرگزرتے ہیں۔ مثلاً ایک عمل یہ ہے کہ کوئی جوان آدمی فوت ہوجائے اور جس روز اسے دفن کیا جائے اسی رات بے اولاد عورت اس کی قبر کھود کر اس کے ساتھ لیٹے اور پیار و محبت کرے۔ لازماً اولاد ہوگی۔ ایک بار ایک عورت یہ عمل کرتے ہوئے پکڑی بھی گئی تھی جبکہ اس کا خاوند قبرستان میں اس قبر سے کچھ دور چھپا کھڑا تھا۔

ایک عمل یہ بھی تھا کہ نوزائیدہ بچہ خواہ وہ کسی کا ہو، اغوا کر کے اس کا گلا گھونٹ دو اور ایک ٹوکرا اس کے اوپر اوندھا رکھ دو اور بے اولاد عورت اس ٹوکرے پر بیٹھ کر نہائے تو اسے اولاد مل جائے گی۔ یقین کریں کہ ہمارے وقتوں میں بعض عورتوں نے یہ عمل کیا بھی ہے۔ ایک عورت پکڑی گئی تھی اور اسے نوزائیدہ بچے کے قتل کے جرم میں عمر قید سزا ہوئی تھی۔

اس ملزم اور اس کی بیوی کو اولاد کی خواہش نے ایسی ذہنی حالت تک پہنچا دیا تھا جہاں یہ ہر خطرے کو بھول گئے تھے اور ہر خطرہ مول لینے کو تیار تھے۔ بیوی کو تو ممتا کا جذبہ بے حال کررہا تھا لیکن خاوند اس میں اپنی توہین سمجھتا تھا کہ لوگ کہتے تھے کہ یہ شخص اولاد پیدا کرنے کے قابل نہیں۔

یہ دراصل پاگل پن کی کیفیت ہوتی ہے جس میں انسان کچھ بھی کرگزرتا ہے۔ پھر یوں ہُوا کہ پندرہ بیس دنوں بعد ان کے گاؤں کی اس عورت نے ایک بچے کو جنم دیا جس کے متعلق اس نے خاوند سے کہا تھا کہ اس کا بچہ پیدا ہونے ہی والا ہے۔

ملزم کی بیوی نے بڑی استادی اور دلیری سے تیسرے دن یہ بچہ اٹھا لیا۔ ملزم نے اپنے بیان میں یہی بتایا کہ اس کی بیوی نے بڑی استادی اور دلیری سے بچہ اٹھا لیا لیکن اٹھانے کا پورا طریقہ بیان نہ کیا۔ صرف یہ بتایا کہ اس کی بیوی نے رات کے وقت بچہ اٹھایا تھا۔ وہ اکتوبر کا مہینہ تھا جب لوگ صحن میں اور برآمدوں میں سوتے تھے۔ عورت جب بچہ اٹھانے گئی تھی تو یہ خاوند اس گھر کے باہر کھڑا تھا۔ بچے کی ماں کو پتہ ہی نہ چلا۔ دیہات کے

کچے مکانوں میں ایسی واردات کسی کے لئے کوئی زیادہ مشکل نہیں ہوتی۔

اب یہ ذہن میں رکھیں کہ میں نے کہا کہ بچے کو رات کے وقت اٹھایا گیا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ واردات آدھی رات کے وقت یا اس سے بعد کی گئی جب لوگ گہری نیند سو جاتے ہیں۔ دیہات میں آج بھی لوگ شام کا کھانا کھا کر تھوڑی ہی دیر بعد سو جاتے ہیں اور ان کے تھکے مارے لوگ بے ہوشی کی نیند سوتے ہیں۔ ہمارے وقتوں میں تو رات نو بجے کو آدھی رات کہا جاتا تھا۔

یہ عمل بتانے والے عامل نے انہیں ایک خاص جگہ بتائی تھی جہاں بچے کو لے جا کر اس کی شہ رگ پر چھری پھیرنی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ جگہ ذرا گہرائی میں ہو، اس کے پاس کچھ پانی ہو وہاں پھلاہی یا کیکر کے دو چار درخت ہوں اور بچے کو دو درختوں کے درمیان لٹا کر اس کی شہ رگ کاٹنی ہے۔ ایک روز ملزم پھر عامل کے پاس چلا گیا تھا اور عامل نے کچھ اور پیسے لے کر اور ملزم کے ساتھ جا کر یہ جگہ منتخب کی تھی جہاں ہم نے نوزائیدہ بچے کو پڑے دیکھا تھا۔

ملزم نے گھر جا کر چھری اٹھائی اور دونوں گاؤں سے نکل گئے۔ انہیں پوری امید تھی کہ وہ رات ہی رات یہ عمل کر کے واپس آ جائیں گے۔ وہ جگہ ان کے گاؤں سے خاصی دور تھی۔ دونوں بچے کو اٹھائے اور بہت تیز چلتے اس جگہ پہنچ گئے۔

انہوں نے بچے کو زمین پر لٹا دیا اور ملزم نے اس کی شہ رگ کاٹنے کے لیے چھری ہاتھ میں لی لیکن نشیب کے اوپر کسی کی باتوں کی آوازیں آنے لگیں۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ یہ دو تین آدمی ہیں اور اس نشیبی جگہ میں سے گزریں گے۔ آوازیں قریب آ رہی تھیں۔ ملزم نے اپنے بیان میں کہا کہ جب اس نے اپنے ہاتھ میں چھری سیدھی کی تھی تو اس کے دل پر عجیب سا خوف آ گیا اور اس کے ساتھ ہی اوپر باتوں کی آوازیں آئیں تو اس کا حوصلہ ٹوٹ گیا۔ اس نے چھری بچے کے قریب رکھ دی اور بیوی سے کہا کہ یہاں سے غائب ہو چلو، کوئی آ رہا ہے۔

دونوں وہاں سے کھسکنے لگے اور ایک اور طرف جا کر نشیب کی ڈھلان چڑھے اور اوپر جا کر بیٹھ گئے۔ انہوں نے یہ نہ دیکھا کہ جو باتیں کرتے جا رہے ہیں وہ نشیب میں سے گزر رہے ہیں۔ ملزم کے دل پر خوف کی گرفت اور مضبوط ہو گئی اور وہ بیوی کو ساتھ لے کر اپنے گاؤں کو چل پڑا۔

وہ گاؤں میں داخل ہوئے تو وہاں شور سا سنائی دے رہا تھا۔ شور یہ تھا کہ فلاں عورت

کا بچہ جو ایک روز پہلے پیدا ہوا تھا غائب ہو گیا ہے۔ لوگ جاگ جاگ کر اس عورت کے گھر اکٹھے ہو رہے تھے۔ اس میاں بیوی کو چپکے سے اپنے گھر میں داخل ہونے کا ایسا موقع ملا کوئی انہیں دیکھ نہ سکا۔ وہ بچے کو وہیں پھینک آئے تھے۔

ملزم نے سنایا کہ بچے کی ماں دن رات چیخ چیخ کر روتی اور بچہ اٹھانے والے کو بددعائیں دیتی تھی۔ جس کا ملزم کے دل پر بہت بُرا اثر ہوتا تھا۔ ملزم نے اس طرح اپنے جرم کا پورا واقعہ سنا دیا اور اس کے بعد اس نے اپنے جذبات کا اظہار کیا جو ہم لوگوں کے لئے قابل قبول نہیں تھا۔

بچے کی ماں نے چند مہینے رو کر صبر کر لیا اور اس کی چیخ و پکار بند ہو گئی۔ گاؤں میں صرف یہ ملزم تھا اور اس کی بیوی جانتے تھے کہ بچہ کہاں گیا۔ ملزم کا گاؤں اس جگہ سے بہت دور تھا جہاں وہ بچے کو لے گیا اور وہیں پھینک آیا تھا۔ دو تین مرتبہ اسے خیال آیا کہ وہاں جا کر دیکھے کہ بچے کا انجام کیا ہُوا تھا لیکن اسے اتنی جرأت نہ ہوئی۔ بچہ زندہ و سلامت جس گاؤں پہنچ گیا تھا وہ گاؤں ملزم کے گاؤں سے بہت دور تھا اور عام راستے سے ہٹ کر تھا اس لئے ملزم کے گاؤں والوں کو پتہ ہی نہ چلا کہ بچہ فلاں گاؤں میں زندہ ہے۔

پھر ملزم نے بتایا کہ اس واقعہ کو ایک سال بھی پورا نہیں ہُوا تھا کہ اس کے سارے جسم پر خارش ہونے لگی۔ ابتدا میں تو وہ کھجلا کر مطمئن ہو جاتا لیکن اس کے جسم پر کہیں کہیں دانے نکلنے لگے اور پھر یہ دانے پھنسیوں کی صورت اختیار کرتے چلے گئے۔ ان پھنسیوں میں سے پیپ نکلتی تھی اور پھنسیاں ٹھیک ہونے کی بجائے پھیلتی جا رہی تھیں۔ ملزم نے بہت علاج کروائے، ٹوٹے ٹوٹکے بھی کئے لیکن اس کا مرض بڑھتا گیا۔

اس کے ساتھ ہی اس کی بیوی اس کے قابو سے نکلنے لگی۔ بیوی کا رویہ ایسا بدلا جیسے اس کے دل میں ملزم کی نفرت پیدا ہو گئی ہو۔ نفرت تو پیدا ہونی ہی تھی۔ ایک تو یہ شخص اولاد پیدا کرنے کے قابل نہیں تھا اور دوسرے اس کے جسم سے ایسی بُری بدبو آتی تھی جو شاید کوئی جانور بھی برداشت نہ کر سکتا تھا۔ ملزم کو ایک دو قریبی رشتہ داروں اور ایک بڑے ہی گہرے دوست نے کہا کہ وہ اپنی بیوی کو قابو میں رکھے کیونکہ وہ کھلم کھلا بدچلن ہوتی جا رہی ہے۔ ملزم کو پہلے ہی شک تھا کہ بیوی اسے دھوکہ دے رہی ہے۔ وہ دن کے وقت زیادہ تر گھر سے باہر ہی رہتی تھی۔ ایک بار اس نے بیوی کو رات کے وقت بستر سے غائب دیکھا لیکن فوراً ہی آ گئی اور کہا کہ وہ قدرتی حاجت کے لئے کھیت میں چلی گئی تھی۔

ملزم نے بیوی کو شرافت سے سمجھانے کی کوشش کی لیکن بیوی نے اسے بڑی بے رخی سے ٹال دیا اور کہا کہ آئندہ اس نے اس کے چال چلن پر شک کیا تو وہ اسے اس حال میں اکیلا چھوڑ کر یہاں سے کہیں چلی جائے گی۔ ملزم میں بے بسی کا احساس پیدا ہو گیا جو اسے بہت اذیت پہنچاتا تھا۔ جوں جوں وقت گزرتا جا رہا تھا اس کی بیوی کے چال چلن کی باتیں ملزم کے کانوں تک پہلے سے زیادہ پہنچنے لگی تھیں۔ ملزم نے اپنے بیان میں کہ مختصر بات یہ ہے کہ اس کی بیوی گاؤں کے ہر اس آدمی کی بیوی بن گئی تھی جو اسے ذرا سا بھی اشارہ کرتا تھا۔

ایک رات ملزم کی آنکھ کھلی تو دیکھا کہ بیوی بستر پر نہیں ہے۔ وہ اس کا انتظار کرنے لگا اور بیوی کم و بیش ایک گھنٹے بعد آئی۔ ملزم نے اسے بُرا بھلا کہا اور یہ دھمکی دی کہ آئندہ اس نے شام کے بعد گھر سے باہر قدم رکھا تو وہ اس کی ٹانگیں توڑ دے گا۔ بیوی نے اس کے جواب میں اسے بڑی سخت باتیں کہہ دیں اور یہ بھی کہا کہ تم جیسے مردار کے پاس کون بیوی ایک منٹ بھی رہنے کو تیار ہو گی۔ یہ کہہ کر بیوی لیٹ گئی۔

ملزم کے دماغ میں ایسا زلزلہ آیا کہ سب کچھ تہہ و بالا ہو گیا۔ اس نے کلہاڑی اٹھائی اور بیوی جو پیٹھ کے بل لیٹی ہوئی تھی، اس کے چہرے پر پوری طاقت سے کلہاڑی کا وار کیا۔

بیوی تڑپی اور ملزم نے بڑی تیزی سے اس کے چہرے پر ہی کلہاڑی کا دوسرا وار کیا اس کے بعد اسے خود بھی یاد نہیں تھا کہ اس نے بیوی کے چہرے پر کتنی بار کلہاڑی ماری اور آخری وار اس کے سینے پر کیا۔ بیوی ذرا سی دیر تھوڑا سا تڑپی اور اس کا جسم ساکت ہو گیا۔

ملزم نے جا کر نمبردار کو جگایا اور اسے اپنے گھر لے جا کر بیوی کی لاش دکھائی اور بتایا کہ اسے اس نے قتل کیا ہے اور قتل کی وجہ بھی بتائی۔ نمبردار اس وجہ سے پہلے ہی واقف تھا۔

چاہئے تو یہ تھا کہ نمبردار ملزم کو اسی وقت ساتھ لے کر تھانے چلا جاتا لیکن معلوم نہیں اس نے ایسا کیوں کیا کہ چوکیدار کو ملزم کے گھر بٹھا کر نمبردار اکیلا تھانے گیا اور رپورٹ دی۔ شاید یہ اس کی کوئی سیاسی چال ہو گی یا وہ اپنے نمبر بنانا چاہتا ہو گا۔ تھانیدار اگلی صبح بہت سویرے وقوعہ والے گاؤں کی طرف چل پڑا اور میں پہلے بیان کر چکا ہوں کہ تھانیدار ادھر جاتے ہوئے ہمارے گاؤں میں رکا تھا۔

''سن لیا تم لوگوں نے!'' ___ ملزم کا بیان ختم ہونے کے بعد تھانیدار نے ہمارے گاؤں کے لوگوں سے کہا ___ ''اس بچے کا کچھ پتہ نہیں چلا جو پندرہ سولہ سالہ پہلے اس ملزم اور اس کی بیوی نے اس کی ماں کے گھر سے اغوا کیا تھا اور میں تمہیں یہ بھی بتا دیتا ہوں کہ اس

ملزم کو نہ پھانسی کی سزا ہو گی نہ عمر قید کی'' زیادہ سے زیادہ اسے پانچ سال سزا ہو گی اور شاید یہ بھی نہ ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سارا گاؤں گواہی دے گا کہ یہ اس بیماری سے مجبور ہو گیا تھا اور اس کی بیوی سخت بد چلن ہو گئی تھی لیکن اس کی حالت دیکھ کر کیا تم نہیں سمجھتے کہ یہ کتنی بڑی سزا ہے جو اسے ملی ہے؟...... اس سے پوچھو۔ یہ مرنے کی دعائیں مانگتا رہتا ہے لیکن اسے موت نہیں آتی اور یہ جہنم میں پڑا گل سڑ رہا ہے......

''اور اس کی بیوی کو جو اللہ نے سزا دی وہ بھی دیکھو۔ ایک عزت دار گھرانے کی عورت ہو کر اتنی زیادہ بد چلن ہوئی کہ گاؤں کے نہ جانے کتنے آدمیوں کی بے نکاحی بیوی بنی۔ یہ اتنی بڑی شرمناک سزا ہے جو پورے خاندان کو ملتی ہے۔ آخر یہ عورت اس طرح قتل ہوئی کہ اس کا چہرہ مسخ ہو گیا...... میں نے تم لوگوں کو اس کی زبانی یہ بیان اس لئے سنوایا ہے کہ اللہ کی لاٹھی سے ڈرو۔ اللہ کا قانون ضرور ہی حرکت میں آتا ہے۔ ایک دوسرے کی دشمنی دلوں سے نکال دو اور اسلام کے سچے راستے پر آ جاؤ''۔

یہ الگ بات ہے کہ لوگ ایک دوسرے کی خاندانی دشمنیاں دلوں سے نکالنے کو بزدلی سمجھتے ہیں لیکن تھانیدار نے بڑا صحیح رول ادا کیا تھا۔

''جناب خاں صاحب!'' ___ ہمارے گاؤں کے ایک معزز بزرگ نے کہا ___ ''اگر ہم آپ کی خدمت میں وہ بچہ پیش کر دیں جسے ملزم اور اس کی بیوی نے ماں کی گود سے چوری کیا اور اسے ذبح کرنے کے لئے جنگل میں لے گئے تھے تو کیا آپ یقین کر لیں گے؟''

وہ لڑکا اب سولہ ساڑھے سولہ سال عمر کا نوجوان تھا۔ ہمارے بزرگ نے اسے بلا کر تھانیدار کے سامنے کھڑا کر دیا۔

''جناب خاں صاحب!'' ___ ہمارے اس بزرگ نے کہا ___ ''اگر آپ کے پاس اتنا وقت ہو تو یہ لڑکا اپنی کہانی بیان کرے گا اور ہمارے گاؤں کے دس بارہ جوان اس کہانی کی تصدیق کریں گے اور پھر ہم اس گاؤں میں بھی آپ کو لے جائیں گے جہاں اس بچے کو اس جگہ سے اٹھا کر ایک شخص لے گیا اور بارہ تیرہ سال پال پوس لیا تھا لیکن میاں بیوی فوت ہو گئے''۔

یہ ایسا انکشاف تھا کہ تھانیدار نے کہا کہ اسے ابھی سارا وقوعہ سنایا جائے اور اس کے گواہ ہیں وہ بھی اپنی اپنی بات سنائیں۔ تھانیدار نے یہ بھی کہا کہ وہ اس کیس کو اٹھانا نہیں چاہتا لیکن بات ایسی ہے جو بہت ہی دلچسپ معلوم ہوتی ہے۔

اس دوران نمبردار اوراس کی ساری پارٹی کے لئے کھانا لے آیا تھا۔ تھانیدار کو کھانے کے دوران ساری بات سنائی گئی اوراس کی تصدیق میں نے اور میرے تین چار دوستوں نے کی۔

''دیکھا لوگو!''___ تھانیدار نے کہا___ ''اللہ اس معصوم اور بے گناہ کے سر پر اپنا دست رحمت رکھتا ہے جس پر ظلم کیا جاتا ہے...... عبرت حاصل کرو لوگو، سبق حاصل کرو''۔

میں ان تفصیلات میں نہیں جانا چاہتا کہ ہم نے اس لڑکے کو کس طرح اس کے ماں باپ کے حوالے کیا اور انہیں یقین دلایا۔ ہم اگلے ہی روز اس لڑکے کو ساتھ لے کر اس کے گاؤں کو چل پڑے۔ ہمارے ساتھ ایک تو میرے والد تھے اور گاؤں کے دو بزرگ اور بھی تھے۔ اس لڑکے کے ماں باپ کے ہاں جا پہنچے۔ وہ حیران ہوئے کہ یہ اتنے معزز اور اجنبی لوگ کیوں آئے ہیں۔ ان کا بیٹا ہمارے ساتھ تھا۔ میرے والد نے بات شروع کی اور لڑکے کے ماں باپ کو سارا واقعہ سنایا اور بتایا کہ یہ ہے تمہارا بیٹا۔ میں نے اور میرے سب دوستوں نے باری باری اس کی تصدیق میں پوری تفصیل سنائی اور لڑکے کی ماں حیرت زدگی کے عالم میں اٹھی اور اپنے بیٹے کے ساتھ لپٹ گئی۔ اس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں تھی کہ لڑکا ان کا نہیں۔

لڑکے کے دو بڑے بھائی تھے۔ وہ بڑی ہی بے تابی سے اسے ملے اور انہوں نے جو خوشیاں منائیں وہ ایک الگ بات ہے۔ ہمیں انہوں نے پُر تکلّف کھانا کھلایا۔ دیہات میں پُر تکلّف کھانے کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ مرغی پکائی گئی ہے اور اس کے ساتھ حلوہ پکایا گیا ہے۔

میں یہ کہانی لکھ رہا ہوں تو یقین کیجئے یوں پتہ چلتا ہے جیسے میرے سامنے فلم چل رہی ہے۔ میں اسی جوانی عمر کی پہنچ گیا ہوں اور میری زندگی کا یہ واقعہ میرے سامنے ایک بار پھر وقوع پذیر ہو رہا ہے لیکن آج کے ماحول میں جب یاد کرتا ہوں تو کچھ ایسا شک ہونے لگتا ہے جیسے یہ کچھ حقیقی نہیں تھا لیکن میں حقیقت کو جھٹلا نہیں سکتا۔

ڈیڑھ سال بعد ہمیں یہ بھی پتہ چل گیا تھا کہ اپنی بیوی کا قاتل مقدمے کے دوران جیل میں مر گیا تھا۔

(ختم شد)